Nafrat

# نفرت

(معاشرتی ناول)

JAF & CO
Plot # 43/4, Q-2, Bloc
PECHS, Near Jheel P
Karachi.

7/7/68
Friday

مصنف کی دیگر کتب

- محبت کا انتقام
- نازلی
- آنچ
- یورش
- تغلق
- خلیفہ ہارون الرشید اور اس کا
- قائد اعظمؒ اور ان کا
- آزادیٔ ہند
- خون کی ہولی

MAMOON
LAIBRAR
LIQAT AB
NA

اقبال احمد
اور بکرمی

آگ

آگ

## (۱)

### نفرت ــــــــ

نفرت کی آگ اس کی رگ دپے میں سرایت کئے ہوئے تھی، وہ اس دنیا میں سب سے نفرت کرتا تھا، اور سب سے زیادہ اپنے باپ سے -!

اور یہ نفرت کی آگ آج اور زیادہ بھڑک اٹھی جب وہ اپنی بیکس اور ستم رسیدہ ماں کی قبر پر فاتحہ پڑھنے آیا -

قبرستان پر سناٹا چھایا ہوا تھا - ہو کا عالم، سامنے مٹی کا ایک ڈھیر تھا -

یہی اس کی ماں کی قبر تھی، !

اور اس قبر کا حال کیا ہو گیا تھا؟

مسلسل بارش کی وجہ سے وہ دو روز تک فاتحہ پڑھنے نہیں آسکا تھا،
آج آیا تو قبر دھنس چکی تھی ،!
بے ساختہ اس کے دل سے آہ نکلی ، !
وہ دل ہی دل میں کہنے لگا -

چین مر کر تہِ زمیں بھی نہیں
اب ٹھکانہ مرا کہیں بھی نہیں

زندگی میں پہلی مرتبہ اس بدنصیب عورت کو قبر کا گوشۂ عافیت ملا تھا
لیکن قدرت کی ایذا پسندی اسے بھی برداشت نہیں کر سکی ، !
وہ ہاتھ جو دعا کے لئے اٹھے تھے دفعتہً گر گئے اور وہ وہیں دھنسی
ہوئی قبر کے پاس بیٹھ گیا ، ایک پتھر سے ٹیک لگا کر ،
وہ اس وقت وادئ خیال کی سیر کر رہا تھا ، !
اس کی آنکھوں کے سامنے ایک چہرہ گردش کر رہا تھا ، !
یہ چہرہ ایک عورت کا تھا ' !
جوانی میں یہ عورت یقیناً دل کش خدوخال کی مالک ہوگی لیکن شوہر
کی سفاکیوں نے اس کا رس چھین لیا - اس کی خوشی چھین لی ، اس کا تبسم چھین
لیا -
شوہر ——

جس نے کبھی اس وفاوار، سلیقہ شعار اور بے زبان عورت سے سیدھے منہ بات نہیں کی، جو شراب پیتا رہا۔ عیاشی کرتا رہا، اپنی پاک باز، پاک نہاد اور فرشتہ سیرت بیوی کے سینے پر کودوں دلتا رہا۔ جس کا گھر میں ٹکنا محال تھا۔ جو اپنا سارا وقت شاہدان بازاری کے بام و در پہ صرف کیا کرتا تھا۔ جس نے بے تحاشہ دولت کمائی۔ ساری دنیا کو لوٹا، خوب رشوت لی، لاکھوں کے وارے نیارے کئے۔ دوستوں پہ، شاہدانِ بازاری پہ اللّے تللّے سے خرچ کیا لیکن جس نے اپنی بیمار بیوی کا علاج نہیں کیا۔ جس نے اپنی رفیقۂ حیات کو پیوند لگے کپڑے پہنے دیکھا اور ذرا شرم نہ کی۔ جس نے اپنی بے زبان اور وفا پرست بیوی کو ہمیشہ اس طرح ڈانٹا اور جھڑکا جس طرح کتّے کو دھتکارتے ہیں۔!

وہ بیوی جس نے کبھی کوئی مطالبہ نہیں کیا جس نے کبھی کسی خواہش کا اظہار نہیں کیا۔ جس نے بہتر سے بہتر کھانے پکا کر باہر دیوان خانے میں بھیج دیئے اور خود فاقے سے پڑی رہی، یا بہت بھوک لگی تو بچا کھچا کھا لیا۔

وہ آخری بار بیمار پڑی۔ نہ ڈاکٹر بلایا گیا، نہ حکیم۔ خود ہی اپنا علاج کرتی رہی ——— فاقہ سے، !

آخر ایک روز مر گئی،

اس کے مرنے پر نہ شورِ ماتم برپا ہوا نہ نوحہ و شیون کی صدائیں گھر کے بام و در سے ٹکرائیں۔ یہ اتنا معمولی سانحہ تھا جس کا کسی نے نوٹس ہی نہیں لیا۔ جب شوہر نے پروا نہ کی تو دیور، کیوں پروا کرتے؟ دیورانیاں کس لئے اشک و آہ کا مظاہرہ کرتیں؟ وہ بڑی دھوم سے اس گھر میں بیاہ کر آئی تھی اور اتنی خاموشی سے اس کا جنازہ نکلا تھا، وہ بیاہ کر آئی تھی تو اس طرح جیسے کوئی شہزادی آتی ہے، مر کر نکلی تو یوں جیسے ایک بلا تھی جو ٹل گئی سر سے'! .

کئی مرتبہ جب باپ نے اس کے سامنے اس کی پیاری ماں کی توہین کی۔ ذلیل کیا۔ ڈانٹا ڈپٹا تو اس کا جی چاہا کہ اس ظالم اور سفاک شخص کا گلا اپنے کمزور ہاتھوں سے گھونٹ دے لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ ایک نوعمر لڑکا۔ ایک پورے مرد کا گلا کس طرح گھونٹ سکتا تھا؟ بارہا اس کا جی چاہا کہ سوتے ہوئے باپ کے سر پر پتھر کھینچ مارے۔ اسے لہولہان کر دے، ہلاک کر دے لیکن ——————
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا۔ وہ یہ بھی نہ کر سکا۔!

اس کے لئے بھی ہمت درکار تھی'!

کئی مرتبہ دل میں امنگ اٹھی کہ باپ سے ٹکرا جائے ————، اس سے رو برو گفتگو کرے اور صاف صاف کہہ دے کہ وہ اپنی ماں کی توہین

اور ذلت برداشت نہیں کر سکتا - وہ اس کی شان کے خلاف کوئی لفظ نہیں سن سکتا - وہ اس کا سب سے زیادہ احترام کرتا ہے - اس کی تذلیل کا برداشت کر لینا اب اس کے بس سے باہر ہو چکا تھا -

لیکن وہ یہ بھی نہ کر سکا :

جب بھی وہ باپ کے سامنے یہ ارادہ کر کے گیا ، اس کی گھگھی بندھ گئی ایک لحیم و شحیم ، بھاری بھرکم قہّار اور جبّار ، اور بارعب و جلال شخص کے سامنے دل کی بات زبان تک لانے کا حوصلہ نہ پڑا - وہ خاموشی سے گیا اور خاموشی سے چلا آیا ! ——— کچھ بھی نہ کہہ سکا - ایک لفظ تک نہیں ، !

پھر اس نے خدا سے لو لگائی - ماں نے اس کے دل میں خدا کی بڑائی اور عظمت کا نقش قائم کر دیا تھا - وہ کہا کرتی تھی ، خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں - اس کے دیوانِ عدالت میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو کر رہتا ہے - !

اس نے اب خدا سے لو لگالی تھی !

وہ سوچا کرتا تھا کہ میری ماں کی دادرسی خدا کے دربار سے ہو گی !

کسی دن ابّا جان موٹر کے نیچے کچل کر ہلاک ہو جائیں گے .

یا سینہ میں درد اٹھے گا اور مر جائیں گے یا سوتے میں چھت گر پڑے گی اور سانس نہ لے سکیں گے یا ہیضہ ہو جائے گا، طاعون ہو جائے گا۔ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مریں گے اور لوگ ان کی موت سے عبرت حاصل کریں گے۔ کہ ظلم کا یہ انجام ہوتا ہے!

وہ پابندی سے نماز پڑھتا تھا اور اب تک کہ اس سال اس نے میٹرک کا امتحان دیا تھا۔ وہ پابندی سے نماز پڑھ رہا تھا۔ وہ ہر نماز کے بعد خدا سے الحاح و زاری کے ساتھ دعا کیا کرتا تھا کہ وہ عدل سے کام لے۔ اپنے انصاف کا کوڑا نکالے اور ابا جان کو روئی کے گالے کی طرح دھنک کر رکھ دے۔ ان پر کوئی ایسا عذاب نازل کرے کہ وہ محسوس کر لیں، کسی بے گناہ پر ظلم کرنے کا انجام کیا ہوتا ہے۔؟

لیکن اس کی دعا قبول نہ ہوئی!

ہوا تو یہ کہ اس کی مظلوم ماں مرگئی، کنارہ کر گئی، اس دنیا سے!

کیا یہی ہے خدا کا انصاف؟ کیا یہی ہے خدا کے انصاف کا کوڑا ——— یہ کوڑا باپ کی پیٹھ کی بجائے ماں کے دل پر کیوں پڑا!

وہ کیوں مرگئی ؟ یہ کیوں زندہ رہا ؟

جس نے زندگی میں کسی کو نہیں ستایا جس نے اپنے پاؤں تلے چیونٹی بھی نہیں کچلی - جس کی زندگی کا مقصد خدمت اور صرف خدمت تھا ، جس نے گالیوں کا جواب خاموشی سے دیا - جس نے ہر ذلت سہی ، ہر دکھ جھیلا ، ہر توہین برداشت کی لیکن صبر اور شکر سے کام لیا - جس نے کسی کا برا نہ چاہا - جس نے کسی کی برائی نہیں کی - کیا اسے یہی انعام ملنا تھا کہ سسک سسک کر ، ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ، بے دوا ، بے علاج ، مایوسی ، نامرادی اور محرومی کی حالت میں اس دنیا سے رخصت ہو جائے - شوہر کے گھر آنے کے بعد سے مرتے دم تک ، خوشی کا ، اطمینان کا ، بے فکری کا ایک لمحہ بھی میسر نہ آئے -

یہی انعام ہے قدرت کا ؟

ایک بے بس ، بے سہارا ، بے زبان عورت پر وہ ظلم توڑتا رہا ، جس نے کبھی اس کا کوئی حق ادا نہیں کیا ، جو ہمیشہ اس کے ساتھ ننگِ انسانیت برتاؤ کرتا رہا - وہ اس قابل تھا کہ زندگی کی ہر نعمت اسے مہیا کر دی جائے ؟ وہ رشوت لے اور مذمت کی ہر گرفت سے آزاد رہے - وہ عیاشی کرے اور قدرت کی گرفت سے بچ جائے - وہ لوگوں کا دل توڑے لیکن اس کے سر میں بھی درد نہ ہو ؟

وہ کیوں نہ مرا؟

میری ماں کیوں مر گئی

کیا وہ اس لئے مر گئی کہ ایک آخری ظلم ——— موت ——— جو باقی تھا وہ بھی اس پر توڑ دیا جائے

کیا یہ اس لئے زندہ رہا کہ اپنے کشتۂ ستم کی اس مظلومیت پر خوب جی بھر کے ہنس لے؟ اور جب تک زندہ رہے کسی اور کو ہدفِ جور بنا لے؟

اور پھر یکایک اسے یاد آیا، ایک مرتبہ، جب اس کے باپ کو بخار آیا تھا اور وہ کئی دن تک دفتر نہ جا سکا تھا تو کتنی بے پناہ مسرت ہوئی تھی اسے، اسے یقین ہو گیا تھا کہ خدا نے اس کی سن لی۔ اب یہ ظالم اور سفاک شخص ضرور مرے گا۔!

لیکن وہ لوٹ پوٹ کر اچھا ہو گیا اور پہلے سے زیادہ ظلم توڑنے لگا،،!

اس نے ماں کی دھنسی ہوئی قبر کی طرف دیکھا اور بے ساختہ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے بڑے بڑے قطرے گرنے لگے،،!

اس نے میٹرک کے پرچے بہت اچھے کئے تھے۔ اسے یقین کامل تھا، وہ ضرور کامیاب ہوگا اور اچھے نمبروں سے اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ

اب تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دے گا اور کہیں ملازمت کرے گا۔ پہلی تنخواہ ملتے امی کو کوئی چھوٹا سا مکان کرایہ پر لے گا اور اپنی ماں کو ساتھ لے جا کر وہاں رکھے گا۔ ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو ساری تنخواہ لا کر ماں کے ہاتھ میں رکھ دیا کرے گا۔ اس کے لئے اچھے کپڑے بنائے گا۔ بازار سے اس کے لئے پھل خرید کر لایا کرے گا۔ اسے خوب کھلائے گا تاکہ وہ جلدی سے موٹی ہو جائے۔ اب تک اس کی زندگی دکھ اور کٹھن میں گزری ہے۔ شوہر سے اسے کوئی سکھ نہ ملا۔ اب بیٹے کی کمائی پر وہ راج کرے گی اور شوہر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہے گی:-

"تم سے دُکھ کے سوا مجھے کچھ نہ ملا، لیکن اب جتنا جل سکتے ہو جلو اب میرے سکھ کا دور شروع ہوا ہے۔

اب میرا کماؤ پُوت میرا کفیل ہے۔

اب میں تمہاری دستِ نگر نہیں ہوں۔

اب میں کسی کی باندی نہیں ہوں۔

اب میں اس گھر کی، اس چھوٹے سے گھر کی جو میرے بچّے نے بنایا ہے مالک ہوں، یہ گھر میرا ہے۔ یہاں میرا فرمان چلتا ہے۔ غم کی اندھیری رات کٹ گئی اور صبحِ مسرت طلوع ہو گئی۔"

لیکن ——

لیکن قبل اس کے کہ امتحان کا نتیجہ نکلے، ملازمت ملے، گھر کا بندوبست ہو، وہ اس دنیا سے منہ موڑ کر چلی گئی ——— اس نے اپنے اکلوتے اور چہیتے لڑکے سے بھی منہ موڑ لیا۔!

کیوں ؟

کس خطا پر ؟

اور پھر بے ساختہ وہ چیخ پڑا۔

"امی تم مجھ سے کیوں روٹھ گئیں ؟ میں نے تمہاری کیا خطا کی تھی ؟ میں تو تمہارے لئے سب کچھ کرنے کو تیار تھا۔ تمہیں خوش رکھنے کے لئے، مزدوری تک کرنے کو تیار ہو گیا تھا !

پھر نہ جانے کیا سوچ کر اس نے آنسو پونچھے۔ دھنسی ہوئی قبر کو آس پاس سے مٹی لے کر بھرا۔ ایک مرتبہ پھر فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھائے اور با چشم اشکبار اس مقتل کی طرف روانہ ہوا جہاں اس کی ماں تڑپ تڑپ کر اس دنیا سے رخصت ہوئی تھی !

(۲)

اعجاز جب گھر پہونچا تو رات کا قافلہ اپنا ڈیرا ڈال چکا تھا ۔
یاندنی بکھری ہوئی تھی ۔ موسم حد درجہ خوشگوار تھا ۔ ٹھنڈی ہوا چل
ہی تھی اور سب سے زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ دروازے پر وہ کوہ پیکر
ور قہر مجسم شخص مسکراتا ہوا نظر آیا جس نے جلا جلا کر اور کڑھا کڑھا کر اس
ی ماں کی جان لی تھی ۔ باپ سے مخاطب ہوئے بغیر وہ اندر جانے لگا ۔ لیکن
روک لیا گیا ۔

"کہاں تھے بیٹے اب تک تم ؟"

اعجاز نے خون آشام نگاہوں سے باپ کی اس مہر بے سبب ،
اور نشاط بے ہنگام کو دیکھا اور جواب دیا :-

"ذرا قبرستان تک گیا تھا ۔"

——— "فاتحہ پڑھنے امّی کی قبر پر"!

یہ سُن کر باپ کی تیوریاں چڑھ گیئں۔ اس نے ذرا بگڑے ہوئے تیور کے ساتھ کہا

"قبرستان ——— ماں ——— قبر ——— فاتحہ ——— یہ سب کیا لغویت ہے؟

آج پہلی مرتبہ اعجاز نے باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر رُود درُود الجھنے کے انداز میں کہا:-

"یہ لغویت ہے"؟

"وہ بولا - اور کیا ہے؟ آخر تم اپنی ماں کا اتنا سوگ کیوں منا رہے ہو؟"

"اس لئے کہ وہ میری ماں تھیں"!

لیکن کس کی ماں ہمیشہ زندہ رہتی ہے؟ رونا دھونا سوگ منانا آہیں بھرنا، آنسو بہانا عورتوں اور لڑکیوں کا کام ہے، مردوں کا نہیں تم مرد ہو تمہیں اتنا حسّاس اور نازک طبع نہ ہونا چاہیئے۔ دنیا میں جو آیا ہے۔ ایک دن ضرور مرے گا۔ پھر غم کیوں اور صدمہ کیسا"؟

"اگر امّی کا انتقال اس طرح ہوا ہوتا جس طرح دنیا کے دوسرے لوگ مرتے ہیں تو شاید مجھے اتنا غم نہ ہوتا ———"

"کس طرح انتقال ہؤا ہے تمہاری ماں کا؟ ——— کیا کسی نے زہر دیا؟ یا خودکشی کر کے انہوں نے جان دی ہے؟

"کاش ایسا ہوا ہوتا!"

"کیا بکتے ہو؟"

"میں سچ عرض کرتا ہوں ——— اس دنیا میں ان کا کوئی ہمدرد اور دوست نہیں تھا۔ اگر ہوتا تو ضرور اس نے زہر دے دیا ہوتا انہیں وہ خود خدا سے اتنا زیادہ ڈرتی تھیں کہ دکھوں اور مصیبتوں اور زحمتوں کے ہمالیہ پہاڑ بھی ان پر لاد دیئے جاتے تو بھی اس ڈر سے وہ خودکشی نہ کرتیں کہ خدا خفا ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں طبعی موت مرنا پڑا اور یہی سب سے بڑی ٹریجڈی ہے"

"آج تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں ہؤا"

"یہ کس طرح کی باتیں کر رہے ہو؟"

"یہ خیالات ایک عرصہ سے میرے دل میں مچل رہے تھے، آج نہ جانے کیوں زبان پر آ گئے۔!"

"تمہارا خیال ہے کہ تمہاری ماں مظلوم تھی؟"

"جی ہاں میرا یہی خیال ہے!"

"لیکن خود اس نے تو کبھی اپنی زبان سے ایک حرف شکایت بھی نہیں نہیں نکالا"!

"یہی ان کی مظلومیت کی سب سے بڑی دلیل ہے"!

"کس نے ظلم توڑے ان پر"؟

"آپ نے"؟

"نالائق کیا بکتا ہے"؟

"میں غلط نہیں کہتا ابا جان! —— آپ نے تھوڑا سا ظلم نہیں توڑا ان پر؛ اس گھر میں ان کی حیثیت ایک باندی سے بھی کم تھی۔ وہ بیمار ہوں، کمزور ہوں۔ بستر سے اٹھنے کی سکت نہ رکھتی ہوں، لیکن ممکن نہ تھا کہ وقت پر آپ کا ناشتہ تیار نہ کریں۔ آپ کھانا نہ دیں۔ آپ کے آرام کا خیال نہ رکھیں" ——

---

"یہ مظلومیت تھی؛ —— بیوی کا فرض یہی ہے"؟

"لیکن شوہر کا بھی تو کچھ فرض ہے"؟

"(خشمگین آنکھوں سے گھورتے ہوئے) وہ کیا ہے؛

"یہ تو آپ کو جاننا چاہیئے"؟

—— انہیں میں نے اپنی آنکھوں سے یہ دیکھا۔ اور

ان کی وفات تک برابر دیکھتا رہا کہ انہیں کبھی خوشی نہیں ملی۔ وہ پیوند لگے کپڑے پہنتی رہیں۔ بیمار پڑیں تو علاج تک پر توجہ نہ کی گئی۔ آپ نے ان سے کبھی ہنس کر، مسکرا کر بات نہ کی۔ ہمیشہ شمشیر برہنہ رہے۔ ذرا ذرا سی بات پر بیٹے کے سامنے ماں کی توہین کرتے رہے یہ سفاکی دیکھ کر میرا خون کھول جاتا تھا لیکن وہ ایسی ہی بے زبان تھی کہ ........ خاموشی اور صبر و شکر کے ساتھ سب برداشت کر جاتی تھی۔ کیا مجال ہے جو کبھی اُف کی ہو۔ کیا مجال ہے جو کبھی آہ کی ہو۔ کیا مجال ہے جو کبھی جواب دیا ہو۔ وہ مر گئی اور اسے مرے ہوئے پندرہ دن سے زیادہ ہو چکے ہیں۔ لیکن اب اس گھر میں اس کا چرچا بھی نہیں ہوتا۔ سبھی بھول چکے ہیں اسے، لیکن میں نہیں بھلا سکتا۔ میں زندگی کی آخری سانس تک اسے فراموش نہیں کر سکتا۔ وہ میری ماں تھی۔ میری ذرا سی تکلیف پر تڑپ جاتی تھی۔ بے قرار ہو جاتی تھی۔ وہ میرا رواں بھی میلا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ مجھے مغموم اور افسردہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ مجھے دل گرفتہ اور پژمردہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ آپ شوہر تھے، آپ دھونس دکھا سکتے تھے۔ گالیاں دے سکتے تھے۔ مار سکتے تھے۔ میں اس کا لڑکا تھا، اس کی مملکت کی واحد رعیت۔ وہ مجھے پیٹ سکتی تھی۔ مار سکتی تھی۔ کوس سکتی تھی۔ دکھ اور ایذا دے سکتی تھی، اور

طرح کا اطمینان محسوس کیا تھا - میں نے سوچا تھا - اب اس کے غموں اور دکھوں کی کہانی ختم ہوگئی - اب قیامت تک اس گوشۂ قبر میں وہ سکو اور چین کی زندگی بسر کرے گی لیکن میرا یہ خیال غلط نکلا - گوشۂ قبر میں بھی اسے چین نہ ملا - میں یہی سوچتا ہوا آرہا تھا کہ آخر میری نیک، پارسا، اور سراپا خدمت و محبت ماں نے قدرت کا وہ کون سا جرم کیا تھا جس کی پاداش میں اس کی قبر تک کو سزا دی جارہی ہے"۔

---

"تم ضرورت سے زیادہ حسّاس اور ضرورت سے زیادہ جذباتی ہو ——— حیرت ہے میرا لڑکا - اور یہ خیالات؟ میری بھی ماں مری تھی، لیکن میں نے آنسو نہیں بہائے تھے وہ میرے سامنے ہی مری تھی لیکن میری آنکھوں سے ایک قطرۂ اشک بھی نہیں بہا تھا - میرے باپ نے بھی اس دنیا سے کوچ کیا تھا لیکن مجھے نہیں یاد کہ میں نے آہ و بکا کی ہو - مرد ہوتے اس لئے ہیں کہ ہر صورتِ حال کا ہمت اور دلیری سے مقابلہ کریں - وہ اس لئے نہیں ہوتے کہ ذرا کوئی بات ہوئی اور انہوں نے عورتوں کی طرح گریبان پھاڑنا اور رونا دھونا شروع کر دیا۔ ———

" میرے یہ آنسو بھی پہلے اور آخری ہیں - اب میں کبھی نہیں روؤں

اور اسے ایسا کرنا چاہیئے تھا" ——

"کیوں کرنا چاہیئے تھا ایسا؟ —— ؟"

"اس لئے کہ میں اس کے بدترین دشمن کا، یعنی آپ کا لڑکا تھا۔ اسے
چاہیئے تھا کہ آپ سے بھی نفرت کرتی اور مجھ سے بھی۔ آپ سے اس لئے
کہ آپ بدترین شوہر تھے اور مجھ سے اس لئے کہ میں اس کے بدترین شوہر
کا لڑکا تھا —— لیکن وہ کسی سے نفرت نہ کر سکی۔ نہ آپ
سے، نہ مجھ سے۔ شاید اس میں نفرت کرنے کی صلاحیت ہی نہیں تھی
شاید اس کا دل صرف مہر و محبت کا گنجینہ تھا۔ وہ کسی سے نفرت کر
ہی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ صرف محبت ہی کر سکتی تھی اور وہ یہی کرتی
یہاں تک کہ — مر گئی —— وہ مر گئی۔ سب نے اطمینان کا
سانس لیا۔ سب نے اسے فراموش کر دیا۔ لیکن میں ایسا نہ کر سکا۔ میں
روز اس کی قبر پر جاتا ہوں۔ اس کے لئے دعائے مغفرت کرتا
ہوں۔ اس سے باتیں کرتا ہوں اور جب تک اس شہر میں ہوں
ایسا ہی کرتا رہوں گا۔ میں روز کی طرح آج بھی اس کی قبر پر محبت
کے پھول چڑھانے اور عقیدت کا نذرانہ پیش کرنے گیا تھا اور ——
—— اور یہ دیکھ کر میرا کلیجہ شق ہو گیا کہ دو دن کی بارش
سے اس کی قبر زمین میں دھنس گئی۔ وہ جب مری تھی تو میں نے ایک

گا جس کا جی چاہے مرکر دیکھ لے"۔

"(بہت زیادہ برہم اور مشتعل ہو کر) کیا کہنا چاہتا ہے تو؟"

"وہی جو میں نے عرض کیا"——

"تو یہ کہنا چاہتا ہے کہ اگر میں مرگیا تو بھی تو نہیں رو گا؟"۔

"کس طرح کہہ دوں کہ آپ نے میرا مطلب غلط سمجھا ہے؟ یا دا جواب دیتے وقت یہی بات تھی میرے دل میں، میں نے یہ کہنا چاہا تھا لیکن نہ جانے کیوں صاف الفاظ میں اپنا مدعا نہ بیان سکا——"

"لیکن میں تجھے عاق کر سکتا ہوں، ہر چیز سے محروم سکتا ہوں۔

"میں خود ہی ہر چیز سے محروم ہو چکا ہوں —— مجھے کچھ نہ چاہئیے۔"

"کمبخت، میں تجھے مبارکباد دینے کے لئے ٹہل رہا تھا۔ تیر انتظار کر رہا تھا۔ میٹرک کا رزلٹ شائع ہو گیا ہے اور تو سارے صوبے میں اوّل آیا ہے"——

"کاش میں فیل ہوگیا ہوتا ——"

اور پھر اس کا گلا رندھ گیا اور وہ تیزی سے گھر کے اندر داخل ہوگیا۔

---

## (۳)

اعجاز کے گھر میں داخل ہونے کے بعد بھی امتیاز بڑی دیر تک ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا

اسے حیرت تھی کہ آج اس لڑکے کو کیا ہو گیا ہے؟

وہ سعادت مند لڑکا جسے میرے سامنے تاب تکلم تک نہ تھی، آج اس کی گرم گفتاری کا انداز نیا ہی نہ تھا، حیرت انگیز بھی ——— اور ناقابلِ برداشت بھی!

امتیاز بڑی دیر تک ٹکٹکی لگائے دروازے کی طرف دیکھتا رہا جیسے اعجاز ابھی پھر اندر سے برآمد ہوتا ہے اور وہ اسے دیکھتے ہی دھواں دھار پیٹنا شروع کر دے گا، لیکن اس نے سوچا کیا وہ اسے پیٹ سکے گا؟ کیا وہ مار کھا لے گا؟

وہ خاموشی سے مردانہ حصہ میں اپنے کمرے کے اندر آکر بیٹھ گیا حقہ بھرا ہوا تھا، اس نے سٹک منہ سے لگائی اور کش لینے لگا، لیکن وہ اس وقت یہاں نہیں تھا۔ نہ جانے کہاں تھا۔ اعجاز کے آج کے رویّہ اور تیور نے اسے مضطر اور پریشان کر دیا تھا۔ اسے اعجاز سے یہ توقع نہ تھی وہ تو اسے مٹی کا مادھو سمجھتا تھا۔ اس کی نظر میں اس کی حیثیت موم کی ناک سے زیادہ نہ تھی، جدھر چاہا موڑ دیا۔!

ماں کا غم؟

اور یہ سوچتے ہی اس کا دماغ جان ہار مریم کی طرف منتقل ہو گیا۔

کیا واقعی وہ مظلوم تھی؟

کافی دیر تک غور و فکر کرنے کے باوجود وہ اپنے آپ کو یہ باور نہ کرا سکا کہ مریم مظلوم تھی۔

وہ ان لوگوں میں تھا جو بیوی پر حکومت کرنا، بیوی کو بے مایہ اور حقیر سمجھنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔ چنانچہ جب تک مریم زندہ رہی امتیاز نے بے محابا اپنے اس حق کا استعمال کیا اور اس پر ایک گونہ فخر محسوس کرتا رہا۔ اور مریم جب مرگئی تو واقعی اس کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہیں ٹپکا۔ اس لئے کہ ایک مریم مرگئی تھی مگر سینکڑوں زندہ تھیں۔ پھر کسی مریم سے شادی کر لے گا۔ پھر اس کی ایسی

گت بنائے گا۔ یہی توقع وہ بیٹے سے بھی رکھتا تھا۔ مگر وہ ناخلف ثابت ہوا۔ ثابت ہوگیا کہ یہ زن مرید ہوگا۔

امتیاز کا بیٹا اور زن مرید!

——— اتنے بڑے ننگ اور عار کا کبھی تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن وہ بعید از قیاس تصور۔ آج حقیقت اور واقعہ کی صورت اختیار کر چکا تھا!

جو لڑکا اپنی ماں کا اتنا سوگ منا سکتا ہے وہ اپنی بہن کو بھی آسمان پر چڑھائے گا اور بیوی کی بھی جوتیاں سیدھی کرے گا۔

امتیاز کے لب حقہ کا کش لے رہے تھے۔ آنکھیں دور افق میں کسی نقطہ پر جمی ہوئی تھیں اور دماغ اس الجھن کو سلجھانے میں مصروف تھا:

چونکہ اعجاز انہی کی جنس سے تھا یعنی لڑکا تھا اس لئے وہ اس کی فلاح و بہبود کے بارے میں بہت کچھ سوچا کرتے تھے۔ اس کی تعلیم و تربیت کا بھی خیال رکھتے تھے۔ چاہتے تھے وہ خوب پڑھے۔ خوب ترقی کرے۔ خوب عروج حاصل کرے، رشوت کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ ایکسائز کے محکمے میں ایک معمولی سی پوسٹ پر تھے۔ تنخواہ ڈیڑھ دو سو روپے سے زیادہ نہیں تھی لیکن آمدنی ہزاروں سے متجاوز تھی۔

خوب وارے نیارے کرتے تھے۔ سینما دیکھتے تھے۔ تھیٹر سے دلچسپی لیتے تھے بالاخانوں پر جاکر ناچ دیکھتے تھے۔ گانا سنتے تھے۔ دوست احباب کی ایک ایک دعوت پر کئی کئی سو روپے خرچ کردیتے تھے۔ جی بھر کے عیاشی کرتے تھے لیکن گھر میں مریم پیوند لگے کپڑے پہنے۔ زلیخا۔ جاڑوں کے موسم میں سوتی کپڑے پر گزر کرے انہیں کوئی پروا نہ تھی۔ البتہ اعجاز کا کسی حد تک خیال رکھتے تھے، کچھ اس لئے کہ وہ ان کا ہم جنس تھا اور زیادہ تر اس لئے کہ اس کی کمائی کھانی تھی۔ اس سے خاندان کا نام چلنا تھا لیکن اعجاز کا کچھ خیال رکھنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ اس کا لاڈ پیار کرنے تھے نہیں اس کے تو وہ قائل ہی نہیں تھے۔ وہ بیوی اور اولاد کو یکسر اپنا تابع فرمان رکھنا چاہتے تھے۔ ان کے ساتھ اخلاق محبت مروت اور شفقت کا اظہار اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ چنانچہ اعجاز کے ساتھ ان کا رویہ عام طور پر بے تعلقی اور بے رخی ہی کا رہتا تھا۔ البتہ اس کی ضروریات کا خیال رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا اگر بیوی اور اولاد کو دباؤ میں نہ رکھا جائے تو یہ چیز شوہری شان اور پدری آن کے خلاف ہے۔ مریم جب تک زندہ رہی وہ ——— اس کی طرف سے بے فکر تھے۔ اسی طرح زلیخا کی طرف سے اور اسی طرح اعجاز کی

طرف سے۔

مریم کا جہاں تک تعلق تھا اس نے تو اپنی زندگی ان ستم رانیوں کے لئے وقف کر دی تھی رہی لیجا تو وہ ماں کے اشارے پر چلتی تھی اور رفتہ رفتہ اس طرزِ عمل، اس اندازِ حیات اور اس فضا سے اتنی مانوس ہو گئی تھی کہ مشین کی طرح اطاعت اور بے زبانی کا فن اس نے ماں سے سیکھ لیا تھا۔

لیکن اعجاز ؟

یہ ہمیشہ کا خودسر تھا۔ ماں کی درگت اور بہن کی حالت دیکھ دیکھ کر کڑھا کرتا تھا۔ اس جلن نے رفتہ رفتہ اسے باغی بنا دیا تھا۔ وہ اپنے باپ سے، اپنے خاندان سے نفرت کرنے لگا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا باپ سے لڑ جائے۔ اسے کھری کھری سنا دے۔ اسے ظلم و ستم کی روش ترک کرنے پر مجبور کر دے۔ کبھی کبھی اپنے ان تاثرات کا اظہار جوشِ جذبات سے مغلوب ہو کر وہ مریم کے سامنے بھی کر دیتا تھا۔

بیٹے کے یہ تیور دیکھ کر اور یہ باتیں سن کر وہ لرز جاتی تھی۔ شوہر کے اس غیر انسانی طرزِ عمل کے باوجود اس کا حد درجہ لحاظ رکھتی تھی، اس کے وقار کو مجروح دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ گھنٹوں اور پہروں اعجاز کو سمجھایا کرتی۔ نصیحت کیا کرتی۔ باپ کی اطاعت و خدمت

کے سبق دیا کرتی تھی اور جب تک اس کے تاثرات غضب زائل نہ ہو جاتے اسے اپنے پاس سے اٹھنے نہ دیتی - وہ اپنی ماں کو غیر مشروط طور پر چاہتا تھا ، کچھ اس لئے کہ وہ حد درجہ مظلوم تھی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا دل دکھائے ، اسے صدمہ دے ، کم از کم اپنی طرف سے تو وہ اسے خوش اور مطمئن رکھنا چاہتا تھا اور کچھ اس لئے کہ اسے غیر معمولی طور پر اپنی ماں سے محبت تھی ، اسے خفا کرنا کسی قیمت پہ بھی گوارا نہیں کرتا تھا ۔

لیکن اب مریم نہیں تھی ، اب وہ آزاد تھا ، اب اسے کسی کی پروا اور فکر نہیں تھی ، اب اسے کسی کے صدمہ اور غم کا احساس نہیں تھا ، اب وہ من مانی کر سکتا تھا ۔ اور کوئی اس کے راستے میں سنگ گراں بن کر حائل نہیں ہو سکتا تھا - پھر بھی وہ ضبط کرتا رہا ، اپنے جذبات کو روکتا اور دباتا رہا - نہ جانے اسے کیا ہو گیا - آج وہ ضبط پر قادر نہ رہا ، اس نے گرم گفتاری کا مظاہرہ کر ہی دیا

امتیاز کو نہیں معلوم تھا کہ اعجاز کی یہ سعادت مندی ، یہ بے زبانی - یہ خاموشی مریم کے طفیل تھی ، وہ اسے اپنے رعب و داب کا کرشمہ سمجھتا تھا ، لیکن آج یہ غلط فہمی رفع ہو گئی اور وہ سنجیدگی سے

سوچنے پر مجبور ہو گیا، اگر لڑکا اس رنگ پر جا رہا ہے تو اس کا تدارک کیا ہونا چاہیئے ——— اور ہونا ضرور چاہیئے۔

---

(۴)

اعجاز کو اس وقت غصہ بھی تھا، صدمہ بھی، غم بھی اور ایک طرح کا اضطراب بھی۔

وہ آیا اور اپنے کمرے میں لیمپ جلا کر بیٹھ گیا اور کسی کتاب کا مطالعہ کرنے لگا۔ اگرچہ اسے نمایاں طور پر کامیاب ہونے کی اتنی خوشی نہیں ہوئی تھی جتنی مریم کی زندگی میں ہوتی لیکن پھر بھی یہ کہنا غلط ہوگا کہ اس خبر سے وہ خوش نہیں تھا۔

اس خبر نے غیر محسوس طور پر اس کے اندر ایک نیا جذبہ اور ولولہ پیدا کر دیا تھا۔

اب تک اس کی خواہش یہ تھی کہ میٹرک کے بعد کسی ملازمت کی تلاش کرے اور ماں کو آرام پہونچائے ... ـــــــ مستقبل کے بارے میں صرف

اتنا پروگرام تھا اس کا !

لیکن اب ؟

اس وقت تو اس کی نظر کتاب کے اوراق پہ جمی ہوئی تھی، لیکن دماغ مستقبل کی باتیں سوچ رہا تھا !

روشن، تابناک اور حیات آفریں مستقبل !

مریم اس دنیا سے رخصت ہو چکی تھی، اب کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ ملازمت تلاش کرتا۔ اب اس کے سامنے ایک دوسرا پروگرام تھا۔ اس گھر سے، اس گھر کے لوگوں سے دور ہو جائے گا اور یکسر تعلیم میں منہمک اور مستغرق ہو جائے گا۔ ماں کے لئے وہ اپنا مستقبل خراب کر سکتا تھا، قربان کر سکتا تھا لیکن اب کوئی ایسا نہیں تھا جس کے لئے وہ اپنی زندگی کا سودا کرنے پر آمادہ ہو جاتا، لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ وہ تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رکھے اور زیادہ سے زیادہ ترقی کے امکانات اپنے لئے نہ پیدا کرے۔

لیکن ایک سوال تھا ؟

کالج کی تعلیم کے مصارف کہاں سے آئیں گے ؟

جہاں تک امتیاز کا تعلق تھا وہ تو کئی مرتبہ اعلان کر چکا تھا کہ وہ اسے انگلستان بھیجنے پر تیار ہے۔ لہٰذا کالج کے مصارف خواہ کتنے

ہی ہوں وہ ہنسی خوشی برداشت کر لے گا۔ بلکہ اگر اس دوران میں اس نے فضول خرچی کی عادت ڈال لی تو اسے بھی گوارا کر لے گا

لیکن وہ اپنی ماں کے قاتل سے نہ مالی امداد لینا چاہتا تھا نہ اس کے گھر میں رہنا چاہتا تھا نہ اس سے کسی طرح کا تعلق قائم رکھنا چاہتا تھا!

. . . . . . . . . . . جب عالم خیال میں اپنی ماں کے قاتل یعنی اپنے باپ کا تصور کرتا تھا تو اس کا خون کھولنے لگتا تھا۔ جی چاہتا تھا اپنی اور اس کی جان ایک کر دے۔ یہ بات اس کے دل میں راسخ ہو گئی تھی کہ ابھی وہ بہت دن زندہ رہتی۔ اگر اس کے ساتھ اس شخص نے اتنا سفاکانہ اور بے دردانہ برتاؤ نہ روا رکھا ہوتا

بے شک وہ اس کا باپ تھا لیکن وہی تھا جو اس کی ماں کی مرگ بے ہنگام کا سبب تھا۔ جتنا جتنا یہ سوچتا تھا، اتنی ہی اتنی اس کے دل میں باپ کی نفرت بڑھتی جاتی تھی۔ اگر ماں کی تربیت کا گہرا اثر اس نے نہ قبول کیا ہوتا تو کوئی شبہہ نہیں اس وقت تک وہ اپنے باپ کے مقابلے میں آ چکا ہوتا ـــــــ ہمیں گر ز و میدان و افراسیاب!

لیکن اس اشتعال اور رنج و غصہ کی حالت میں بھی ماں کی تصویر سامنے آ کھڑی ہوتی تھی۔

اور اس کے کان میں نصیحت کے وہ الفاظ گونجنے لگتے تھے جو باپ
اطاعت کے بارے میں اکثر اس کے منہ سے نکلا کرتے تھے ـــــــ

بس یہی وہ تصویر تھی اور یہی وہ الفاظ تھے جنہوں نے اسے حد ادب کے اندر محبوس اور مقید کر رکھا تھا۔

اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا، بے شک وہ حد ادب سے باہر قدم نہیں نکالے گا۔ تہذیب اور شائستگی کے خلاف کوئی کام نہیں کرے گا ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا جس سے اس کی ماں کی روح کو اذیت لیکن ایک بات یقینی تھی، کبھی اور کسی حالت میں آئندہ تعلیم کا سلسلہ وہ باپ کے مصارف پر نہیں جاری رکھے گا۔ بے شک اس کے پاس کوئی وسیلہ نہیں ہے، جیب خالی ہے لیکن وہ خود اپنے وسائل اور ذرائع پیدا کرے گا۔ وہ اپنے دست و بازو کی مدد سے اپنے مستقبل کی تعمیر کرے گا وہ صوبے بھر میں اول آیا ہے کیا وہ ٹیوشن کر کے اپنے تعلیمی مصارف نہیں پورے کر سکتا۔ یا کیا اسے ٹیوشن نہیں ملے گی۔

اس خیال نے اس کے اضطراب اور پریشانی کو بڑی حد تک ختم کر دیا۔ اور طبیعت مائل بہ سکون ہوگئی۔ اسے یقین کامل تھا کہ وہ خدا کے فضل اور اپنے بل بوتے پر اپنی جگہ خود بنا لے گا!

لیکن ابھی ایک بہت اہم سوال طے کرنا باقی تھا!

رکاب گنج ایک بہت معمولی اور چھوٹا سا قصبہ تھا جہاں کا وہ باشندہ تھا۔ یہاں سے چند میل کے فاصلے پر ایک اور بڑا قصبہ تھا وہاں کے ہائی اسکول میں اس نے تعلیم حاصل کی تھی۔ ہر روز سائیکل پر چلا جاتا اور اسی پر واپس آجاتا لیکن اننت پور میں کوئی کالج نہیں تھا۔ کالج شہروں میں ہوتے ہیں قصبوں میں نہیں ہوتے۔ رکاب گنج سے نزدیک ترین شہر فیض آباد تھا۔ رکاب گنج سے فیض آباد کا کرایہ نو روپے تھا۔ صبح سے شام تک کا یا رات کے ۸ بجے سے صبح کے ۷ بجے تک کا سفر۔

فیض آباد جانے کے لئے کرایہ درکار تھا وہاں ٹھہرنے کے لئے روپے کی ضرورت تھی نصاب کی کتابیں خریدنے کے لئے روپیہ درکار تھا۔ کالج کی فیس دینی تھی۔ جب تک ٹیوشن کا بندوبست نہ ہوجائے اس وقت تک اپنی گرہ سے کھانے کا بندوبست کرنا تھا!

ان سب کاموں کے لئے کم از کم دو سو روپے تو ضرور چاہئیں۔

یہ رقم کہاں سے آئے گی؟

یہ سوچتے ہی وہ اٹھا اور اپنی جیب کا جائزہ لیا۔۔۔۔۔

صرف پانچ روپے اور کچھ آنے تھے۔ یہی پونجی لیکر وہ فیض آباد

جائے گا؟ اس رقم میں تو ٹکٹ بھی نہیں خریدا جا سکتا!

پھر ——— ؟

یہاں آ کر گاڑی رک گئی۔ خیالات کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ یہ ا
مشکل تھی جس کا کوئی حل نظر نہیں آتا تھا اور جب تک یہ مشکل حل
ہو، کوئی تدبیر کامیاب نہیں ہو سکتی تھی لیکن آج تو جانا بھی ممکن
تھا۔

وہ یہی سوچ رہا تھا کہ دروازے میں جنبش ہوئی۔ اس نے نظر ا
کر دیکھا تو زلیخا سامنے کھڑی تھی

——— اس کی بہن" !

ہُو بہ ہُو ماں کی تصویر!

---

(۵)

یوں تو کس بھائی کو بہن سے محبت نہیں ہوتی لیکن اعجاز کو زلیخا سے کچھ زیادہ ہی تعلق خاطر تھا اور مریم کے انتقال کے بعد سے تو وہ اسے اور زیادہ چاہنے لگا تھا۔ دونوں بھائی بہن میں عمر کا تفاوت صرف دو سال کا تھا یعنی بہن بھائی سے دو سال چھوٹی تھی اس لئے دونوں میں بے تکلفی بھی کافی تھی!

اعجاز نے محبت بھری نظروں سے زلیخا کو دیکھا۔ پھر پوچھا۔

"یوں دبے پاؤں چوروں کی طرح کیوں آئیں تم؟"

وہ ایک افسردہ سے تبسم کے ساتھ بولی۔

"چوری ہی کر کے تو آئی تھی!"

انتہائی ذہنی کوفت اور غم وصدمہ کے باوجود اس بے ساختہ

جواب پر اعجاز کو ہنسی آگئی۔

"تم چوری کرکے آئی تھیں ——— ؟"

اس نے مسکراتے ہوئے گردن کے اشارے سے اقرارِ جرم کرلیا

اعجاز نے سوال کیا۔

"آج تک تمہارا کوئی سوال میں نے رد کیا ہے؟ ——— اگر نہیں تو پھر مانگ لیتیں، چوری کی ضرورت کیا تھی؟"

وہ اسی طرح مسکراتی ہوئی بولی :-

"اور اگر وہ چیز مانگنے کی نہ ہو، چوری ہی کرنے کی ہو تو؟"

اعجاز نے ہنستے ہوئے کہا :-

"تو پھر بے شک چرالو" ——— ذرا دیر کے لئے باہر چلا جاتا ہوں جب تم چرا چکو گی تب آجاؤں گا۔"

وہ بولی :- "باہر جانے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ کے بیٹھے ہوئے جو کچھ چرانا ہے چرا لوں گی - میں جانوں اور میرا کام - آپ فکر نہ کریں"

اعجاز نے پھر نظریں کتاب پر گاڑدیں اور کہنے لگا :-

"بہت اچھا جناب - میں اپنا کام کرتا ہوں - آپ اپنا کام کریں"

زلیخا نے جیسے اسے چھیڑتے ہوئے کہا "میں تو اپنا کام کر بھی چکی"

اعجاز نے پوچھا "یعنی چرا لیا جو کچھ چرانا تھا"

جواب دینے کے لئے اس نے صرف تبسم پر اکتفا کیا، وہ کہنے لگا :-

"پھر تو تم آنکھ سے سرمہ بھی چرا سکتی ہو۔!"

یک لخت زلیخا سنجیدہ سی ہو گئی۔ اس نے کہا :۔

"اچھا آپ کو رازدار بنائے لیتی ہوں ——— لیکن دیکھئے کسی کو بتائیے نہیں، ورنہ پھر لڑائی ہو جائے گی۔"

اب تو اعجاز کو بھی تجسّس پیدا ہوا اس نے کہا :۔

"رازدار؟ ——— کیا کہیں اور چوری کر کے آئی ہو۔؟ اور مال مسروقہ میرے پاس رکھانا چاہتی ہو۔؟"

زلیخا نے ہنستے ہوئے کہا۔ "یہی بات ہے بھیّا۔ خوب سمجھے آپ!"

اعجاز کا شوقِ تجسّس اب تک قائم تھا۔ اس نے کہا :۔

"تو بتاؤ پھر ماجرا کیا ہے؟"

وہ بولی۔ "یہ نسیم جو ہے بڑی بدحواس ہے اور دوسروں کی بدحواسی کا مذاق اڑاتی رہتی ہے" ———

"خیر آگے چلو! کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"مجھے اکثر چھیڑتی رہتی ہے۔ تم نے یہ چیز گم کر دی تم نے وہ چیز کھو دی۔ میں اگر کوئی چیز کھوتی بھی ہوں تو معمولی قسم کی۔ روپے آنے کی۔ حد سے حد روپے بارہ آنے کی۔ مگر بیگم صاحبہ (نسیم) نے آج

کتنی سو روپے کی چیز اپنی بدحواسی پر قربان کر دی ہے"۔

"یعنی ——— ؟

"آج وہ سینما گئی ہے چونکہ وقت گزرا جا رہا تھا اور دیر کافی ہو
تھی۔ لہٰذا اور زیادہ بدحواس تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اپنی سونے کی گھ
جاتے جاتے ڈیوڑھی میں پھینک گئی۔ میں ابا جان سے چائے کو پوچ
گئی تو دیکھتی کیا ہوں دروازے کے پاس کوئی چیز چمک رہی ہے
اٹھایا تو گھڑی ——— یہ دیکھئے، یہ رہی"۔

"پھر اب کیا ارادہ ہے"۔؟

"ارادہ کیا ہوگا یہ آپ کے پاس رہے گی۔ جب خوب اچھ
طرح پریشان کر لوں گی تب دوں گی۔ وہ بھی دو تین دن کے بعد
تاکہ آئندہ کے لئے کان ہو جائیں اور قیمتی چیز کو احتیاط سے رکھنا سی
لے!"

"تمہیں کیا ضرورت ہے اس کی معلّمہ بننے کی۔ احتیاط سے رک
یا بے احتیاطی کرے، اس کی چیز ہے۔ وہ جانے اور اس ک
کام"!

زلیخا بچوں کی طرح مچلتی ہوئی بولی:—

"نہیں بھیا یہ کام تو کرنا ہوگا"۔

اعجاز نے جواب دیا۔

" اگر بعضد ہو تو کرو ۔ مگر مجھے کیوں شریک کرتی ہو؟"

وہ بولی " نسیم آتے ہی مجھ سے سوال کرے گی ۔ میں قسم کھا لوں گی میرے پاس نہیں ہے اور کہہ دوں گی دیکھ لو سارا کمرہ پڑا ہے اگر ہے تو لے لو ۔ وہیں ہو گی جہاں رکھی تھی ؟

"بڑی چالاک ہو؟"

"بھیا نہیں !

" اور اگر اس نے مجھ سے پوچھا :-

" تو آپ بھی انکار کر دیجئے گا !

" یعنی میں بھی قسم کھا لوں تمہاری طرح ؟"

" ہاں تو کیا ہوا؟ ——— کہہ دیجئے گا ، اللہ قسم میرے پاس نہیں ہے ۔"

" جھوٹی قسم کہلوانا چاہتی ہو ؟

" جھوٹ کیوں ——— آپ کے پاس کہاں ہے ۔ وہ تو آپ کے بکس میں ہو گی !

" اور اگر میرے کمرے کی تلاشی لی گئی ؟"

" اتنی ہمت کسی میں نہیں ہے ؟"

"کیوں ؟ ——— ہیں کوئی ایسا طرّم باز خاں ہمد

"آپ کو سب طرّم باز خاں ہی سمجھتے ہیں گھر میں ———
اوّل تو کسی کی ہمت آپ سے سوال کرنے کی نہیں پڑے گی اور اگر پوچ
بھی لیا تو تلاشی کا کوئی نام بھی نہیں لے گا۔

"آخر اس دہشت کا سبب ؟

"چچا، چچی، نسیم سب یہی کہتے ہیں کہ بھئی وہ بہت بد دماغ ہے۔ اس
سے کوئی منہ لو لے ——— اور آپ منہ لگاتے بھی کب ہیں کسی کو؟
ابّا جان تک سے تو سیدھے منہ بات نہیں کرتے !

———

(۶)

نسیم اعجاز کی بنت عم تھی - احراز کی لڑکی ، احراز اور امتیاز سگے بھائی تھے - امتیاز بڑا تھا ، احراز چھوٹا - دونوں بھائی ایک دوسرے کا بہت زیادہ خیال اور لحاظ رکھتے تھے - مزاج اور طبیعت کے اعتبار سے بھی بڑی حد تک دونوں میں یکسانیت تھی - وہی سختی ، وہی رعب ، وہی گھر کے ماتحتوں کے ساتھ رعونت اور نخوت کا برتاؤ - وہی بیوی کے سامنے اپنے آپ کو لئے دیئے رہنا - وہی لوگوں کے سامنے جھوٹے وقار اور رعب کی نمائش -

البتہ ایک فرق تھا ، گو معمولی سہی لیکن ایسا بھی نہیں کہ اسے نظر انداز کر دیا جائے -

احراز کا برتاؤ کلثوم کے ساتھ وہ نہیں تھا جو امتیاز کا مریم کے

ساتھ تھا - بس وہی فرق تھا جو چھوٹے اور بڑے میں ہوتا ہے یعنی انیس بیس کا فرق - امتیاز ہمہ وقت مریم کے ساتھ درشتی اور سختی سے پیش آتا تھا، احراز کبھی کبھی - امتیاز اولاد کے سامنے بھی بیوی کو ذلیل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا تھا، لیکن احراز اولاد کے سامنے ماں کے وقار کو کبھی مجروح نہیں ہونے دیتا تھا چاہے جتنا غصہ میں ہو

احراز بھی ایک لڑکی —— نسیم —— اور ایک لڑکے ریاض کا باپ تھا - نسیم بڑی تھی، ریاض چھوٹا - احراز کی مالی حالت اگر امتیاز سے اچھی نہ تھی تو بری بھی نہ تھی - یہ پولیس انسپکٹر تھا اور بڑے مزے میں زندگی کے دن بسر کر رہا تھا - دوست احباب پر - مجلس طرب اور ہاؤ ہو پر بے شمار خرچ کرتا تھا - لیکن امتیاز کی طرح آنکھیں بند کر کے نہیں - آمدنی کا معقول حصہ وہ اپنی بیوی اور بچوں پر بھی صرف کرتا تھا - ان کے اچھے اچھے کپڑے بناتا تھا - ان کے کھانے پینے کی فکر رکھتا تھا - ان کی ضدیں اور فرمائشیں پوری کرتا تھا - امتیاز نے مریم اور زلیخا سے کبھی کوئی واسطہ نہیں رکھا - صرف اعجاز کا تھوڑا بہت خیال رکھتا تھا - لیکن احراز نسیم کو بھی اتنا ہی چاہتا تھا جتنا ریاض کو - نسیم چونکہ ریاض سے عمر میں ایک سال بڑی تھی اس لئے اس کا مان بھی زیادہ رکھتا تھا - بیوی

.... کے ساتھ زیادہ اپنایت اور بے تکلّفی تو نہ تھی لیکن کبھی کبھار اس سے کچھ بول لینے میں بھی مضائقہ نہیں سمجھتا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ گھر کے تمام معاملات کلثوم کے ہاتھ میں تھے ۔ وہ مختارِ مطلق تھی جو چاہے کرے۔ اس سے کسی طرح کی پوچھ گچھ یا باز پرس نہیں کرتا تھا ۔ اس بیچاری کے سامنے مریم کا انجام تھا۔ وہ اس کو غنیمت سمجھتی تھی اور خوشی سے پھولی نہیں سماتی تھی!

اعجاز کو جو ماحول ملا تھا اور جس فضا میں اسے زندگی بسر کرنا پڑ رہی تھی اس نے اسے بہت دل برداشتہ ، مایوس اور مغموم و مضمحل بنا رکھا تھا ۔ وہ گھر میں کم سے کم وقت صرف کرتا تھا ۔ اس ڈر سے کہ کہیں امتیاز کا سامنا نہ ہو جائے کہیں وہ اس کے سامنے اس کی ماں کو ذلیل نہ کرے۔ پھر بھی گھر گھر ہی تھا، اسے چھوڑا نہیں جا سکتا تھا ۔ کم سے کم وقت بسر کرنے کے باوجود رہتا یہیں تھا ۔ یہاں کے علاوہ کہیں اور اسے پناہ بھی تو نہیں مل سکتی تھی ۔

لیکن اس گھر میں ایک ہستی ایسی بھی تھی جسے دیکھ کر جس سے باتیں کر کے ، جس کی باتیں سن کر ، جس کے سامنے سے گزر کر ، جسے اپنے سامنے گزرتا دیکھ کر ، جسے چھیڑ کر جس کی شرارت کا ہدف بن کر اسے چین آتا تھا ۔ خوشی ہوتی تھی ———— اور یہ ہستی نسیم

کی تھی۔!

ابھی وہ اس منزل پر نہیں پہونچا تھا کہ باقاعدہ عشق شروع کر دیتا۔ لیکن غیر محسوس طور پر وہ اس سے واقعی عشق کرنے لگا تھا۔ اگر اس سے پوچھا جاتا

"تم نسیم سے عشق کرتے ہو؟"

تو اس کا جواب شاید انکار ہی ہوتا۔ لیکن اگر اس سے پوچھا جاتا۔

"تم کس سے محبت کرتے ہو؟"

تو بے اختیار اس کی نگاہ تصور کے سامنے نسیم کی تصویر آجاتی

اس کا دل دھڑکنے لگتا۔

اور وہ اپنے آپ سے یہ سوال کئے بغیر نہ رہتا

"کیا میں نسیم سے محبت نہیں کرتا؟"

لیکن یہ انجانی سی، اور لذت سے آشنا نہ ہو سکنے والی حالت اندر ہی اندر جڑ پکڑ رہی تھی!

آج جب زلیخا نے گوٹی کا قصہ چھیڑا اور اس نے لطف سے لے کر ساری داستان سنی اور پھر نہایت اطمینان کے ساتھ

اس سے گھڑی لے کر اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لی۔

اس نے سوچا واقعی لطف رہے گا نسیم کو پریشان کرنے میں اور اسے پریشان دیکھ کر۔

اس نے سوچا، گھڑی تو بہرحال اسے واپس کرنی ہے۔ لیکن کیا جرم ہے اگر اس پہلے اسے تھوڑا سا ستا لیا جائے۔ آخر وہ بھی تو جب موقع پاتی ہے، شرارت سے نہیں چوکتی۔

اعجاز نے جب گھڑی اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لی تو زلیخا مطمئن ہو گئی۔ پھر بھی احتیاطاً اس نے کہا:

"دیکھئے، خبردار، خبردار نسیم کو پتہ نہ چلنے پائے!

وہ جواب میں گویا ہوا

"اب تو بھئی چور کے ساتھی بن چکے۔ اب اس راز کا افشا کر کے اپنی شامت بلانا ہے؟"

زلیخا کے ہونٹوں پر تبسم کھیلنے لگا، کہنے لگی

"ہاں ٹھیک ہے!"

اعجاز نے کہا لیکن زیادہ عرصہ تک میں ضبط نہیں کر سکوں گا۔ کیونکہ اسے پریشان دیکھ کر مجھے بھی کچھ پریشانی سی ہونے لگتی ہے۔ لہذا آج ہی کل میں اس کی امانت اسے واپس کر دینا۔"

زلیخا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا

"ہاں بھیا واپس کر دوں گی، اطمینان رکھیئے"!

پھر دفعتہً سوال کیا۔

"آپسے پریشان دیکھ کر واقعی آپ پریشان رہتے ہیں ——؟"

اعجاز کچھ سٹ پٹا سا گیا۔ اس نے جواب دیا۔

ہاں ہوتا تو ایسا ہی ہے —— نہ جانے کیوں؟——

زلیخا نے کہا۔ "اور یہی حال خود نسیم کا بھی ہے۔ اس سے بھی آپ کا غم اور صدمہ نہیں دیکھا جاتا۔"

اعجاز کے دل میں کچھ گدگدی سی پیدا ہوئی۔

"یہ تم نے کیسے جانا؟"

"وہ بولی، "اس کی باتوں سے"!

"کس طرح کی باتیں"؟ —— مثلاً"؟

جب سے امی کا انتقال ہوا ہے۔ آپ کتنے پریشان رہتے ہیں

---

اعجاز نے ایک ٹھنڈا سانس لے کر کہا:۔

"ہاں زلیخا، انہیں میں کبھی نہیں بھول سکتا۔"! ——

لیکن نسیم کا اس واقعہ سے کیا تعلق؟"

"وہ اکثر میرے پاس آکر مجھے اکسایا کرتی ہے کہ آپ کو سمجھاؤں اتنے زیادہ پریشان نہ ہوں۔ اس طرح آپ بیمار پڑ جائیں گے"——

اعجاز نے مسکراتے ہوئے کہا:۔

"شاید وہ ڈرتی ہے تیمارداری کرنی پڑے گی"

زلیخا نے بچوں کی طرح ٹھنک کر کہا "ہٹیے بھی —— آپ نے بھی کیا بات کی ہے ...... وہ بیچاری تو محبت سے ایسا کہتی ہے"!

---

(۷)

زلیخا اور اعجاز میں یہ باتیں ہو رہی تھیں اور باہر امتیاز کچھ برہم، کچھ پریشان، کچھ مضطر بیٹھا نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔

اتنے میں احراز آگیا۔ بھائی کو فکر مند دیکھا تو پوچھا:-

"آج خلافِ معمول آپ کچھ پریشان سے نظر آتے ہیں ۔۔۔۔۔ کوئی خاص بات ہے؟"

امتیاز نے بجھے ہوئے حقہ کا ایک کش لگایا، اور کچھ سوچتے ہوئے کہا:-

"ہاں پریشان ہوں اور فکر مند بھی ۔۔۔۔۔۔۔ اور حد درجہ مشتعل بھی!"

احراز نے حیرت سے بھائی کی طرف دیکھا اور پوچھا:-

"خیریت تو ہے؟ ـــــ کیا بات ہوئی؟ ـــــ آج تو آپ کو بہت خوش ہونا چاہیئے تھا؟"

امتیاز نے سوال کیا

"کیوں! آج بہت زیادہ خوش کیوں ہونا چاہیئے تھا؟"

احراز نے نشاطِ طرب کے عالم میں جواب دیا۔

"کیا سارے صوبہ میں اعجاز کا اوّل آنا آپ کے لئے باعثِ مسرت نہیں ہے؟ ـــــ بھائی جان اس خوش خبری پر تو دشمن بھی بادل نخواستہ سہی مگر خوش ہو رہے ہیں۔"

"دشمن ـــــ؟"

جی ہاں ـــــ ابھی میں آ رہا تھا کہ راستے میں سکندر صاحب ملے۔ میرے اور آپ کے پرانے دشمن ہیں بلکہ کہنا چاہیئے ہمارے خاندانی دشمن ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی آگے بڑھے اور اعجاز کی کامیابی پر مبارکباد دی۔ کہہ رہے تھے، کسی وقت آپ کی خدمت میں بھی آئیں گے۔ بہ ذات خود مبارکباد دینے۔"

امتیاز نے ایک آہ سرد کے ساتھ کہا:۔

"لیکن میں مبارکباد کا نہیں۔ تعزیت کا مستحق ہوں!"

"تعزیت" کا لفظ سن کر احراز نے سوچا۔ شاید بھائی صاحب کو

آج بھابی مرحومہ یاد آرہی ہیں ، وہ کبھی کبھی کہا بھی تو کرتی تھیں ــــــ ــــــ یاد آئے گی تمہیں میری وفا میرے بعد ــــــ شاید آج بھابی کی وفاداریاں یاد آرہی ہیں ۔ اسے مریم سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا لیکن وہ بھی ایسے لوگوں میں تھا جو بیوی کے ساتھ امتیاز کے برتاؤ کو انتہا پسندی کی انتہا سمجھتے تھے ۔ اسے ایک گونہ خوشی ہوئی کہ چلو بھابی صاحبہ یاد تو آئیں کسی نہج سے ۔ اس نے بھی ایک آہ سرد کے ساتھ کہا :۔

" بھائی جان ۔ یہ غم تو زندگی بھر کا ہے ۔ ان کے مرنے کا کسے افسوس نہیں ہے ۔ سارا گھر سونا ہو گیا ہے ۔ ایک ان اکیلی کے اٹھ جانے سے ۔ وہ نہ کسی کے بھلے میں تھیں نہ بُرے میں ۔ اپنے کام سے کام ۔ پھر بھی ان کے دم سے رونق تھی گھر میں اور ان کے اٹھتے ہوئے یہ رونق بھی اٹھ گئی ۔

امتیاز نے بادل کی طرح گرجتے ہوئے کہا :۔

"کیا بکتے ہو ؟"

احراز خاموش ہو گیا اور حیرت سے بھائی کی طرف دیکھنے لگا وہ چھوٹا تھا اور اکثر بچپن میں بڑے بھائی کے ہاتھ سے پٹ تک چکا تھا ۔ اور بہت دنوں تک یعنی بڑے ہونے کے بعد تک بھی اگر مار پیٹ کا نہیں تو ڈانٹ ڈپٹ کا سلسلہ جاری تھا ۔ لیکن جب

سے دونوں نے آزادانہ اور ———— جداگانہ زندگی بسر کرنا شروع کی تھی تو چھوٹا چھوٹے پن کے حدود میں رہتا تھا اور بڑا اپنے بڑے پن کے رکھ رکھاؤ کو ملحوظ رکھتا تھا مگر ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے یوں ڈانٹ دیا ہو۔ اسے سخت حیرت ہوئی اور وہ متحیر نظروں سے بھائی کی طرف دیکھنے لگا۔ امتیاز نے اس کی کیفیت محسوس کر لی اور کہا:۔

"تم خیال کرتے ہو، میں مریم کو یاد کر رہا ہوں! اس کی موت پر تعزیت کا سزاوار قرار دے رہا ہوں اپنے تئیں؟"

احراز نے ڈرتے ڈرتے کہا:۔

"جی میں تو یہی سمجھا تھا!"

امتیاز نے حقہ کا ایک زوردار کش لگایا، اور کہا:۔

تم بیوقوف ہو۔ ———— مریم کے مرنے کا مجھے یقیناً افسوس ہے لیکن میں ان لوگوں میں نہیں ہوں جو بیوی کے مرنے کا ماں کے مرنے سے زیادہ غم مناتے ہیں۔ اور میں تو غم غلط قسم کا آدمی ہوں۔ میں نے کبھی کسی کا ماتم نہیں کیا۔ سوگ نہیں منایا والدہ تک کے انتقال پر میری آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ

تک نہیں گرا، حالانکہ ان سے مجھے محبت تھی!
احراز نے بڑے بھائی کے ادب و احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے
کہا:-
"جی ہاں ——"
امتیاز نے گویا یہ —— لفظ سنا ہی نہیں لیکن سلسلۂ کلام جاری
رکھتے ہوئے کہا:-
"اور پھر اب مریم کا سوگ مناؤں گا - اس کے مرنے کے
پندرہ بیس دن کے بعد؟ —— کتنی غلط بات سوچی تھی
تم نے احراز"
احراز نے محسوس کیا، واقعی اس سے بہت بڑی حماقت سرزد
ہوئی جو اس نے سوچا کہ پتھر میں بھی جونک لگ سکتی ہے- چٹان بھی
آنسو بہا سکتی ہے- لیکن اتنا کہے بغیر بھی نہ رہ سکا"
"تو بھائی صاحب پھر آپ کیوں ملول و افسردہ نظر آ رہے ہیں
—— بلکہ اپنے آپ کو تعزیت کا مستحق قرار دے رہے ہیں
خدانخواستہ اور کیا واقعہ رونما ہوا؟"
امتیاز نے کہا "وہ بڑا جگر فگار، دل دوز اور حوصلہ فرسا
حادثہ ہے"

احراز کی کچھ پوچھنے کی ہمت نہ پڑی وہ سوالیہ نظروں سے بھائی کی طرف دیکھنے لگا۔

امتیاز نے خفیف سے تامل و توقف کے بعد پوچھا

"تم اب تک نہیں سمجھے شاید؟"

اس نے بے بسی کے ساتھ جواب دیا۔

"بھائی صاحب واقعی میں کچھ نہیں سمجھ سکا۔ مجھے سخت اختلاج ہو رہا ہے۔ خدا کے لئے بتایئے تو سہی، آپ کس حادثہ کی طرف اشارہ کر رہے ہیں؟"

امتیاز نے جذباتی لہجہ میں بتایا:-

"اعجاز کی طرف سے ——— کیا اس سے بڑا حادثہ بھی ہو سکتا ہے کوئی میرے لئے۔؟"

احراز کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ گھبرا گیا۔ اس نے انتہائی اضطراب اور بے چینی کے ساتھ سوال کیا۔

"اعجاز کو کیا ہو گیا، خدا کے لئے بتایئے۔ للّٰہ جلد ارشاد فرمایئے، کیا بات ہے؟ ——— کیا خدانخواستہ وہ ———

امتیاز نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا:-

"نہیں وہ مرا نہیں ہے۔ زخمی بھی نہیں ہوا ہے۔ زندہ ہے

صحیح سلامت ہے لیکن اس کا دماغ پھر گیا ہے" !

"یعنی پاگل ہو گیا ہے....؟"

"کاش وہ مر گیا ہوتا - وہ پاگل ہو گیا ہوتا - کاش وہ ـــ

احراز اس سے زیادہ نہ سُن سکا۔ اس نے کہا :-

"حد ہو چکی بھائی صاحب ، اب میں اس طرح کی باتیں نہیں سکتی - آپ اعجاز کو کہہ رہے ہیں کہ اس کا دماغ پھر گیا ہے - وہ پا ہو گیا ہے اور میں ـــــــ"

"اور تم مجھے پاگل سمجھ رہے ہو" ؟

احراز نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن اس کی خاموشی اس حقیقت کی غماز تھی کہ امتیاز نے اس کے خیالات کی بالکل صحیح ترجمانی کی ہے ا

امتیاز نے ہمدردی کی نظروں سے بھائی کو دیکھا اور پھر ا حسرت ناک انداز میں گویا ہوا۔

مریم مر گئی - زلیخا شادی کے بعد اپنے شوہر کے ہاں چلی جائے گی - گویا جس دن اس کی شادی ہو گی - اس دن وہ ہمیشہ کے لئے مر جائے گی - لڑکی جب پرائے گھر کی ہو گئی تو اس سے ناتہ کیا رہا - ایک اعجاز تھا جس سے میری امیدیں وابستہ تھیں جس سے میری نسل چل سکتی تھی - میرا نام زندہ رہ سکتا تھا جسے پڑھا لکھا کر اور جس کا مستقبل

سنوار کر میں امید کر سکتا تھا کہ بڑھاپے میں میرے کام آئے گا۔ میری خدمت کرے گا۔ میری آرزوئیں بر لائے گا۔"

احراز نے کہا۔

"بھائی صاحب یہ سب کچھ ہوگا۔ وہ تو بڑا سعید لڑکا ہے۔"

امتیاز نے زہر خند کرتے ہوئے احراز کی طرف دیکھا اور خاموش ہو گیا۔

(۸)

اس زہرخند میں غصہ، نفرت اور ایک آہنی فیصلہ جھلک
تھا۔

احراز بہرحال امتیاز کا بھائی تھا۔اس کا مزاج داں اور طبیعت
شناس تھا۔اس کے انداز و اطوار رفتار وگفتار اور سیرت وکر
سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔وہ دل ہی دل میں کانپ گیا۔اس نے
محسوس کرلیا کہ اعجاز سے کوئی بھیانک اور خوفناک غلطی ہو گئی ہے اور اب
یہ شخص اپنے اس اکلوتے لڑکے کو اس کے قصور کی سخت ترین سزا دیگا
اس سے سخت انتقام لے گا اور اسے عبرت ناک سبق دے گا ——
لیکن اسے اعجاز سے اس کی سعادت مندی، خوش اطواری کے
باعث گہرا لگاؤ تھا۔وہ اسے دِل سے چاہتا تھا۔وہ ہرگز یہ برداشت

نہیں کر سکتا تھا کہ اسے کسی ذراسی بات پر تختۂ مشق ستم بنا لیا جائے اور وہ بات یقیناً ذرا ہی سی ہوگی، کیونکہ اعجاز نہ چور ہے نہ ڈاکو، نہ شرابی، نہ آوارہ گرد، نہ عیاش، نہ اوباش۔ اس نے اپنے اندر ہمت پیدا کی اور ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

"لیکن بھائی صاحب اگر آپ نے مجھے اس قابل سمجھا ہے کہ یہ ذکر میرے سامنے چھیڑیں، تو میرا یہ مطالبہ بھی آپ کو ماننے میں تامل نہ ہونا چاہیئے کہ پورا واقعہ بتا دیں تاکہ میں بھی تو کچھ سوچ سکوں؟"

"امتیاز نے چڑھی ہوئی تیوری کے ساتھ پوچھا

"تم سوچ کر کیا کروگے؟" ———— کیا اسے راہِ راست پر لے آؤ گے؟

"مجھے امید تو یہی ہے"!

"پھر تم احمقوں کی جنت میں رہتے ہو"!

"لیکن بھائی صاحب بات تو بہرحال معلوم ہونی چاہیئے۔ میں اگر کامیاب ہو گیا تو فبہا ورنہ اپنی ناکامی کا اعتراف کر لوں گا۔

امتیاز نے ایک مرتبہ پھر بجھے ہوئے حقہ کا ایک کش لگایا اور کچھ کہنے والا تھا کہ اعزاز کا ملازم آیا اور اس نے کہا۔

"بیگم صاحبہ نے کہا ہے، کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے"۔

ابھی احراز نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ امتیاز نے اسے زور سے
گھر کا اور گرج دار آواز میں کہا
"بھاگ یہاں سے !"

وہ یہ فقرہ سن کر زمین سے ایک بالشت اچھل گیا اور فوراً الٹے
پاؤں تقریباً بھاگتا ہوا واپس چلا گیا - وہ میاں کے ڈنڈے سے اور
غصہ سے اچھی طرح واقف تھا اور کئی ہولناک واقعات کا شاہد عینی
بھی - لہٰذا اپنے آپ کو کسی خطرے میں ڈالنے کے لئے ہرگز تیار نہ
تھا -

اس نے گھر میں جاتے ہی کلثوم کو بتا دیا کہ میاں جلال کے عالم
میں بیٹھے ہیں اور "صاحب" سے نہ جانے کیا باتیں کر رہے ہیں - وہ بھی چپ
چاپ اور اداس سے بیٹھے ہیں - میں نے کھانے کو کہا تو صاحب نے کوئی
جواب نہیں دیا اور میاں نے بڑے زور سے ڈانٹا - میں تو بھاگ آیا
بیگم صاحب !

امتیاز کا غصہ، کوئی نیا واقعہ نہیں تھا - گھر کا ہر فرد اس سے واقف
تھا اور ڈرتا بھی رہتا تھا - لیکن نئی بات یہ تھی کہ "میاں" غصہ میں
بھرے بیٹھے ہیں اور "صاحب" (احراز) بھی چپ چاپ اور اداس سے
ان کے قریب بیٹھے ہیں -

اس کا کیا مطلب ؟

کیا دونوں بھائیوں میں کسی بات پر کھٹک گئی ؟ - لڑائی ہو گئی ؟ ؟

بہ ظاہر اس کا کوئی امکان نہ تھا - میاں کا پندار اس سے مطمئن ہو جاتا تھا کہ احراز ان کے سامنے سر جھکائے رہتا تھا - اور کبھی آنکھ ملا کر بات نہیں کرتا تھا - اور اگر کبھی وہ کچھ ارشاد فرماتے تھے تو وہ بے چون و چرا ان کے ارشاد کی تعمیل کرتا تھا ——— یہی وجہ تھی ، کہ دونوں بھائیوں کی اب تک بہت اچھی طرح نبھتی چلی آ رہی تھی - ورنہ ویسے خود احراز بھی کم جلالی نہیں تھا !

اور اگر آج واقعی کسی بات پر دونوں بھائیوں میں کھٹک گئی ، تو کیا ہو گا ؟ -

یہ سوچ کر کلثوم گھبرا گئی اور ضبط نہ کر سکی - بھوندو کو جو سامنے کھڑا تھا ، دبڑکا دے کر اس نے پیچھے ہٹا یا اور سیدھی ڈیوڑھی میں —!

وہ ڈیوڑھی میں دبے پاؤں پہنچی ، لیکن ڈر رہی تھی کہ اگر "میاں" کو معلوم ہو گیا تھا کہ کوئی ان کی کن سوئیاں لے رہا ہے تو پھر نہ وہ پھر کے نہ پھیر کے قابو سے باہر ہو جائیں گے اور قیامت آ جائے گی لیکن بات کچھ ایسی تھی کہ وہ غیر متعلق بھی نہیں رہ سکتی تھی - چنانچہ

بہت احتیاط سے ڈیوڑھی میں پہنچ کر دروازے سے ہٹ کر کھڑی ہو گئی اور پٹ کی درازسے باہر کا منظر دیکھنے لگی

بھوندو نے غلط نہیں کہا تھا!

واقعی معاملہ بے ڈھب نظر آرہا تھا؟

آج تک اس نے ایسا منظر کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"میاں" پیکرِ آتش بنے بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں چہرے پر انتہائی اضطراب اور اشتعال کے آثار نمایاں تھے اور احراز بھیگی بلی بنا اس طرح سر جھکائے بیٹھا تھا جیسے اس سے کوئی بہت بڑی خطا سرزد ہو گئی ہے۔ اور اب وہ سزا کا حکم سننے کا منتظر ہے۔

کلثوم کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا؟ —— یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

اس مختصر سی محفل پر جو صرف دو آدمیوں پر مشتمل تھی، سناٹا چھایا ہوا تھا۔

آخر امتیاز نے طلسم سکوت توڑا اور کہنے لگا۔

"تو تم معلوم کرنا چاہتے ہو کہ تمہارے بھتیجے نے کیا کیا ہے اور میں اس سے کیا سلوک کرنے والا ہوں؟"

احراز نے سر اٹھا کر ایک مرتبہ بھائی کی طرف دیکھا اور خاموش

ہو گیا۔

امتیاز نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:۔

"اس نے کیا کیا یہ پھر بتاؤں گا لیکن میں کیا کرنے والا ہوں ۔ پہلے وہ سن لو۔"

Nafrat

احراز نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا:۔

"ارشاد ——— ۔ سن رہا ہوں!"

امتیاز نے بتایا:

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے اور میرا یہ فیصلہ ایک حقیقت پر مبنی ہے کہ ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں ——— ——— لہٰذا میرا فیصلہ یہ ہے کہ صبح کا سورج طلوع ہونے کے بعد اعجاز اس گھر میں نہیں رہ سکے گا۔ میری موجودگی اور عدم موجودگی کسی حالت میں بھی وہ یہاں قدم نہیں رکھ سکتا۔ اسے ایک بینی دو گوش اس گھر سے نکلنا پڑے گا۔ اسے اختیار ہے کہ چاہے وہ مریم کی آغوش میں جا کر ہمیشگی کی نیند سو جائے یا در بدر کی ٹھوکریں کھائے اور بھیک مانگے اس گھر کا کوئی فرد، تم، کلثوم، زلیخا، نسیم ریاض کوئی بھی اس سے نہیں مل سکے گا۔ نہ اس گھر کے اندر، نہ اس گھر کے باہر

احراز یہ سن کر کانپ گیا۔ اس نے کہا :۔

"بھائی صاحب ، یہ فیصلہ تو بہت سخت ہے ؟"

امتیاز نے پوری امتیازی شان کے ساتھ جواب دیا۔

"ہاں ، لیکن میرا فیصلہ ہے اور تم جانتے ہو کہ میں اپنا فیصلہ بدلا نہیں کرتا ۔"

"بے شک بھائی صاحب آپ اپنا فیصلہ بدلا نہیں کرتے ۔ لیکن اس کا سبب ؟"

" ہاں وہ بھی سن لو ! "

اور پھر امتیاز نے سارا واقعہ از اوّل تا آخر سنا دیا ، اور کہا :۔

ایسا لڑکا کسی اعتبار سے بھی ، میرا لڑکا نہیں ہو سکتا میرے زیر سایہ نہیں رہ سکتا ! ۔ سن لیا تم نے ؟"

وہ خوشامدانہ لہجہ میں گویا ہُوا :۔

"سن لیا بھائی صاحب ———— لیکن غلطی انسان ہی سے ہو جاتی ہے ۔ بہر حال اسے ماں کا غم ہے ۔ اس لئے بھٹک گیا ۔ لیکن اپنی غلطی پر وہ نادم ہو گا ۔ ضرور آپ سے معافی مانگ لے گا ۔ اور میں یقین دلاتا ہوں ۔ پھر کبھی آپ کو اس

سے شکایت کا موقعہ نہیں ملے گا —— تا زندگی!"

"نہیں —— جاؤ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے اور مجھے بھی نیند آ رہی ہے!"

(۹)

احراز گھر میں داخل ہوا تو کلثوم پیشوائی کے لئے موجود تھی
اس نے احراز پر یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ دونوں بھائیوں کی باتیں سن چکی ہے
نہ اپنی اس بے پایاں مسرت کا اظہار کیا جو اعجاز کے بارے میں
امتیاز کے فیصلہ سے ہوئی تھی۔ بات یہ تھی کہ نسیم دو ملاؤں کی مرغی
بنی ہوئی تھی۔ احراز کی خواہش یہ تھی کہ اس کی شادی اعجاز سے ہو
بھتیجا ہے۔ سعادت مند ہے، خوش اطوار ہے مگر سب سے بڑا فائدہ یہ
ہے کہ لڑکی گھر کی گھر ہی میں رہے گی لیکن کلثوم کی دیرینہ تمنا یہ
تھی کہ نسیم صفدر سے بیاہی جائے۔ یہ اس کا بھتیجا تھا۔ گو
سعادت مند اور خوش اطوار نہ تھا لیکن اعجاز کے مقابلہ میں
کہیں زیادہ دولت مند تھا۔ اعجاز کے پاس باپ کی رشوت کی

آمدنی کے سوا جو آتی تھی اور اڑ جاتی تھی کیا تھا - تھوڑی سی زمین اور مکان کا آدھا حصّہ - اس کے برعکس صفدر ایک زمیندار باپ کا بیٹا تھا، ایسے باپ کا بیٹا - جس نے اپنی جزرسی اور کفایت شعاری ـــــ جسے بعض لوگ بخل سے تعبیر کرتے تھے ـــــ سے تھوڑی سی جائداد کو بہت بڑی املاک میں تبدیل کر لیا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ ماں باپ کا اکلوتا لڑکا تھا - اس کے معنی یہ تھے کہ ساری جائداد گویا نسیم کے ہاتھ آئے گی - دودھوں نہائے گی - پوتوں پھلے گی - لیکن یہ بات دونوں کے ذہن میں تھی - زبان پہ نہیں آئی تھی - احراز یوں خاموش تھا کہ جب چاہے گا لڑکی اور لڑکے کے ہاتھ پکڑے گا اور قاضی سے دو بول پڑھوا دے گا - نہ لڑکا انکار کر سکتا تھا، نہ اس کا باپ اور کلثوم یوں خاموش تھی کہ احراز کا عندیہ اس کے علم میں تھا اور اس میں اتنی سکت نہ تھی کہ شوہر کی مرضی کے خلاف کچھ کر سکے یا کہہ سکے، البتہ کسی حسنِ اتفاق کی منتظر تھی اور وہ حسنِ اتفاق آج پیدا ہو گیا تھا - خدا کی مہربانی سے، یعنی امتیاز حد درجہ برہم تھا، اعجاز سے اور اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس نالائق اور ناخلف بیٹے کو تنبیہاً اور تادیباً ایک نامعلوم عرصہ کے لئے نکال دے گا - اور یہ مجال احراز کی بھی نہیں تھی کہ اس

کے فیصلہ میں مداخلت کر سکے اور اس فیصلہ کے عمل میں آجانے کے
بعد بلاشبہ صفدر کے لئے میدان صاف تھا۔

اعزاز جب ہاتھ دھو کر دستر خوان پر بیٹھا تو کلثوم پنکھا لے
کر پاس بیٹھ گئی۔ مکھیاں اڑاتی جاتی تھی اور شوہر سے باتیں کرتی جا
تھی۔ اس نے کہا :-

"بھوندو کہہ رہا تھا آج بھائی صاحب (انتیاز) بہت خفا
اعزاز نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"ہاں انہیں جب غصہ آتا ہے تو اسی طرح آتا ہے ——
کلثوم نے بڑے معصومیت اور سادگی کے ساتھ کہا :-

" تو کیا آپ سے خفا ہو گئے کسی بات پر ؟"

اعزاز نے شامی کباب پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا :-

"ہو تو سکتے ہیں آخر بڑے بھائی ٹھہرے، لیکن اعجاز کی کسی
بات پر بگڑے ہوئے ہیں ؟"

اس طرح گویا یہ خبر سن کر اسے بہت صدمہ ہوا۔ بڑے ہمدرد
طور پر بولیں :-

"یہ لو —— اعجاز بے چارے نے کیا بگاڑا ہے ؟ وہ تو ا
نیک لڑکا ہے کہ میری نظر سے تو آج تک کوئی ایسا گزرا نہیں۔ خدا

عمر بڑی کرے ۔

احراز نے کھانا ختم کرتے ہوئے اور تولیہ سے منہ ہاتھ پونچھتے ہوئے کہا

"میں جانتا ہوں، بڑا نیک اور سعادت مند لڑکا ہے" —— —— بھونڈو حقہ —— لیکن بہر حال آدمی ہے، فرشتہ نہیں اور غلطی آدمی سے ہو ہی جاتی ہے!

نہایت اضطراب اور پریشانی کی کیفیت اپنے اوپر ظاہر کرتی ہوئی کلثوم گویا ہوئی

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن بھائی صاحب بڑے غصہ ور ہیں، نہ جانے کیسی سزا دینے کا فیصلہ کر بیٹھیں"

بھونڈو حقہ لے کر آگیا - احراز نے ایک کش لگاتے ہوئے کہا:-

"فیصلہ تو وہ کر چکے —— گھر سے نکالنے کا ——

یہ سنتے ہی جیسے کلثوم پر بجلی گر پڑی

"ہائے غضب اب؟"

احراز نے با تمکنت لہجہ میں کہا:-

"انشاء اللہ! میں رضامند کر لوں گا انہیں پریشان ہونے

کی بات نہیں"۔

یہ سن کر واقعی کلثوم پریشان ہو گئی ـــــــ

(۱۰)

صبح احراز وقت سے ذرا پہلے بیدار ہو گیا اس کا ارادہ تھا کہ ذرا اعجاز کو اچھی طرح سمجھا بجھا لے اور پھر امتیاز کی خوشامد و درآمد کر کے اسے فیصلہ نافذ نہ کرنے پر آمادہ کرے۔ غصہ بہر حال تھوڑی ہی دیر قائم رہتا ہے، رات بھر تو نہیں قائم رہ سکتا۔ اب اتر گیا ہو گا اور نہ بھی اترا ہو تو کم تو بہر حال ہو گیا ہو گا اور یہ معلوم کر کے تو اسے اور زیادہ خوشی ہوئی، کہ صبح چار بجے اپنے عملہ کے بعض آدمیوں کے ساتھ وہ کسی اسمگلنگ کرنے والی پارٹی پر چھاپہ مارنے گیا ہے اور ۱۱-۱۲ بجے دوپہر سے پہلے واپس نہیں آئے گا۔ اس نے سوچا اس عرصہ میں اعجاز کو بہت اچھی طرح راہ راست پر لایا جا سکتا ہے

اس نے اطمینان سے ناشتہ کیا۔ پھر بھوندو سے کہا:-

"ذرا اعجاز کو بلا لاؤ۔"

بھوندو اگر دو منٹ تاخیر سے پہنچتا تو شاید اعجاز باہر ج
آج اس کے اسکول کے لڑکوں اور استادوں نے ایک تقریب
کا انتظام کیا تھا۔ یہ تقریب صرف اس کیلئے منعقد ہو رہی تھی
اور استادوں سب کو فخر تھا کہ اعجاز سارے صوبے میں اوّل
وہ سائیکل لے کر باہر نکلنے ہی والا تھا کہ بھوندو نے جا لیا اور اح
کا پیغام پہنچایا، اس نے سائیکل وہیں ڈیوڑھی میں رکھی اور سیدھا چ
حضور میں پہنچ گیا۔

احراز نے شفقت اور محبت کی نظروں سے اسے دیکھا اور کہ
آؤ بیٹھو اعجاز ——— کیا تم نے ناشتہ کر لیا؟
وہ ادب سے سر جھکا کر گویا ہوا

"جی ہاں چچا جان ناشتہ کر چکا ہوں، ابھی ذرا دیر پہلے
"کہیں باہر جا رہے تھے تم؟"
"میری کامیابی کی خوشی میں آج اسکول کی طرف سے ایک تقریب
مبارکباد منعقد ہو رہی ہے۔ وہیں جا رہا تھا
(ہنستے ہوئے) "ہاں بھئی، تم ہی تو بارات کے دولھا ہو، تم نہ ج
گے تو تقریب کا لطف کیا؟ ——— مگر کس وقت ہے ت

"دس بجے کا وقت مقرر ہے" اوہ ابھی بہت وقت ہے۔ سائیکل پر جاؤ گے تو پندرہ منٹ میں پہنچ جاؤ گے۔ ابھی تو آٹھ بجنے میں بھی چند منٹ باقی ہیں ——

"جی ہاں —— ایک گھنٹہ کے بعد بھی جاؤں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ذرا پہلے اس لئے جا رہا تھا کہ بعض دوستوں نے تاکید کر دی تھی کہ ——

"ہاں بھئی دوستوں کا کہنا ماننا ہی پڑتا ہے۔ کبھی ہم بھی تمہاری طرح اسی اسکول میں پڑھتے تھے، لیکن فیل ہی ہوتے رہے۔ کبھی اتفاقاً پاس بھی ہوئے تو تیسرے درجہ میں

"(مسکراتے ہوئے)" لیکن آپ کی قابلیت کا تو سب لوہا مانتے ہیں"!

"مانیں گے —————— اندھوں میں کانا راجہ جو ہوا ——"

بھوندو کی طرف دیکھ کر) ابے کھڑا کیا کر رہا ہے۔ جا چائے لا، اعجاز میاں کے لئے —— کیوں بیٹے چائے پی لینے میں کیا حرج ہے"؟

"کوئی حرج نہیں، آپ کی خوشی ہے تو پی لوں گا۔"

اتنے میں بھوندو چائے لے کر آگیا اور ساتھ ہی ساتھ کچھ اور چیزیں بھی۔ پھر کہنے لگا۔

"بیٹا (نسیم) نے کہا ہے (سموسوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

یہ ضرور کھائیے گا !"

اعجاز نے زیرِ لب تبسم کے ساتھ ایک سموسہ اٹھا لیا۔ اعزاز نے قہقہہ لگایا اور کہنے لگا :-

"واقعی بڑے مزے کے ہیں۔ خود ہی پکائے ہیں اس نے۔ سب کھانے پڑیں گے۔ ہیں ہی کتنے۔ بس چار ہی تو ہیں۔"

کچھ تو اس لئے کہ سموسے واقعی مزے کے تھے اور کچھ اس لئے کہ نسیم نے بھیجے تھے اور خصوصیت کے ساتھ کھانے کی فرمائش کی تھی۔ وہ چاروں کے چاروں صاف کر گیا۔ پھر اس نے چائے کی پیالی اپنی طرف کھسکائی اور گھونٹ گھونٹ کر کے پینے لگا۔

---

## (۱۱)

اعجاز چائے پیتا رہا اور احراز سگریٹ سے شغل کرتا رہا۔ دونوں اپنے مشغلے سے ایک ساتھ فارغ ہوئے۔ پھر احراز سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس نے کہا

"بیٹے، بھائی صاحب تم سے بہت خفا ہیں!"

دفعتہً اعجاز کا رنگ رخ بدل گیا۔ ایک ہیجانی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ اس پر اس نے کہا۔

"یقیناً خفا ہوں گے —— لیکن چچا جان میں بھی خفا ہوں ان سے"!

اعجاز کے منہ سے اس طرح کی بات سن کر ایک دھچکا سا لگا احراز کو اس نے اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"تم؟ خفا ہو؟ —— بھائی صاحب سے؟"

وہ بولا "صرف انہی سے نہیں ساری دنیا سے، خود اپنے آپ
سے بھی!"

یہ باتیں اور زیادہ عجیب وغریب تھیں۔ اس نے سراپا حیرت بن
بھتیجے کو دیکھا اور گویا ہوا۔

"تم بھائی صاحب سے بھی خفا ہو، ساری دنیا سے بھی اور خود اپنے آپ
سے بھی۔ ——— لیکن کیوں؟"

"ابا جان سے اس لئے کہ میری ماں کی قبل از وقت موت کا سبب و
ہیں۔ وہ ایک دن بھی انہیں خوش نہ رکھ سکے۔ وہ انہیں جلاتے رہے
ذلیل کرتے رہے، ان کے ساتھ ان کا برتاؤ حد درجہ ظالمانہ اور سفاکا
تھا۔ ساری دنیا سے اس لئے کہ یہ دنیا ظالم کا ساتھ تو دیتی ہے لیکن
مظلوم کا ساتھ نہیں دیتی۔ اس کی مدد نہیں کرتی، اس کے کام نہیں
آتی۔ چنانچہ اس دنیا نے میرے والد کا ہاتھ کبھی نہیں پکڑا۔ ان کی مار دھ
کبھی نہیں روکی۔ انہیں کبھی اصلاح احوال کی ترغیب نہیں دی۔ خاموشی
کے ساتھ ان کے مظالم دیکھتی رہی اور میری مظلوم ماں کو ایڑیاں رگڑ رگڑ
کر مرتے دیکھتی رہی۔ وہ میری ماں کے آنسو بھی نہ پونچھ سکی۔ اس کا غم
کیا بٹاتی؟ بار بار میں اپنے دل سے پوچھتا ہوں کہ میری ماں کا قصور کیا تھا
اس سے کونسا جرم سرزد ہوا تھا جس کی اتنی سخت اور عبرت ناک سزا

سے ملی کہ بیمار پڑی اور علاج تک سے محروم رہی ۔ مگر صرف ایک ہی جواب
ملتا ہے، یہ کہ میری ماں کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ نیک تھی، شریف تھی،
خدا پرست تھی، اس کے سوا اس کا کوئی جرم نہیں جس کی طرف اشارہ کیا
جا سکے، اپنے آپ سے اس لئے خفا ہوں کہ بہرحال میں بچہ نہیں ہوں، ہوش
رکھتا ہوں، شعور رکھتا ہوں۔ بُرے بھلے کی تمیز رکھتا ہوں، آخر
میں نے کیوں اپنی ماں کا ساتھ نہیں دیا۔ میں نے کیوں مزدوری نہیں
کی اور اس ظلم کدے سے نکال کر اسے کسی جھونپڑی میں لے جاکر کیوں نہ رکھا
میرے پاس وہ فاقے کر کے بھی خوش رہتی۔ پھٹے کپڑے پہن کر بھی
گزارہ کر لیتی۔ فقر و فاقہ کی تکلیف کتنی ہی بڑی سہی مگر اس جہنم کے
مقابلہ میں بہت کم تھی، جہاں اسے زندگی گزارنی پڑتی تھی اور جہاں اسے
مرنا پڑا، ———— چچا جان! جب میں یہ باتیں سوچتا ہوں تو
میرا خون کھولنے لگتا ہے، جی چاہتا ہے خودکشی کر لوں، اس گھر کو ہمیشہ
ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دوں۔ میری اس سے بڑھ کر بدنصیبی بدقسمتی
اور بے بسی کیا ہو سکتی ہے کہ جب میں اپنی ماں کی قبر پر فاتحہ پڑھنے
گیا تو میں نے دیکھا کہ دو دن کی بارش نے اس کی قبر کو زمین
میں دھنسا دیا تھا ۔ گویا مرنے کے بعد بھی اسے چین نہ ملا ۔
گویا موت کے بعد اسے گوشہ قبر بھی امان نہ دے سکا، اس سے

بڑھ کر بھی بے پروائی اور سنگدلی ہو سکتی ہے کہ اسس کی قبر بھی اس ط
بنوائی جائے کہ پندرہ دن بھی ثابت نہ رہ سکے؟

احراز خاموشی کے ساتھ انجاز کی یہ مسلسل تقریر سنتا رہا۔ اس نے ک
مداخلت نہیں کی اور اعجاز اس بات سے بے پرواکہ اس کی باتوں
کیا اثر ہورہا ہے اور ہو بھی رہا ہے یا نہیں، اپنی دھن میں مست اپنی کہے
رہا تھا۔ اس نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا ۔

" میں اسس گھر میں نہیں رہ سکتا۔ یہاں کی چار دیواری مجھے کاٹ
کو دوڑتی ہے ۔ یہاں کے بام و در میرے نفرت کے جذبہ کو اور زیادہ ا
ہیں ۔ یہاں ہر وقت اور ہر لمحہ مجھے وہ مرنے والی یاد آتی رہتی ہے جس
شوہر ظلم وستم کرتا رہا۔ جس کی دنیا نے دادرسی نہ کی ۔ میں جو اسس سے ا
زیادہ محبت کا مدعی ہوں۔ میں بھی اس کے لئے کچھ نہ کر سکا۔"

اب احراز خاموش نہ رہ سکا، اس نے سوال کیا:

" پھر کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟"

اس نے بے تامل اور بغیر کسی جھجک کے صاف الفاظ میں کہا:

" میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اس گھر کو چھوڑ دوں گا۔ اس شہر

جی چھوڑ دوں گا“

”کہاں کا قصد ہے، کہاں جاؤ گے؟ کیا کرو گے؟ کیا ارادہ ہے؟“

”کچھ نہیں کہہ سکتا ——————“

”اتنا بڑا قدم اٹھا رہے ہو مگر کچھ نہیں کہہ سکتے، کیا اسٹیشن پر جاؤ گے اور جو پہلی گاڑی مل جائے گی اس پر بیٹھ جاؤ گے، خواہ وہ مشرق کی طرف جا رہی ہو یا مغرب کی جانب۔ شمال کا رخ ہو یا جنوب کا؟“

”نہیں چچا جان! میں گاڑی پر بیٹھ کر نہیں جاؤں گا۔“

احراز کچھ اور پوچھنے والا تھا کہ کلثوم آ گئی اور اس نے آتے ہی کہا:

”نسیم نے تو سارا گھر سر پر اٹھا رکھا ہے، جان دے رہی ہے۔“

احراز نے تیوری پر بل ڈال کر پوچھا

”کیوں؟ —————— کس بات پر؟“

کلثوم نے بتایا، ”اس کی گھڑی چوری ہو گئی ہے —————— وہی جو آپ نے سالگرہ کے موقع پر لا کر اسے دی تھی۔ وہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے، ساڑھے تین سو کی مالیت کی ہے —————— میں تو نام نکلواؤں گی۔“

احراز نے کچھ زیادہ نوٹس نہیں لیا اس خبر کا، بلکہ ایک حد تک

بگڑ کر کہا :-

" نام نکلوانے کا ڈھونگ رچانے سے کیا فائدہ ہوگا، ——— کیا گھڑی مل جائے گی ؟"

وہ بولی ، "نہیں کیسے ملے گی ؟ چور کا پتہ چل جائے گا تو فور[illegible] میں انگلی ڈال کر نکال لوں گی !"

لیکن سوال یہ ہے کہ نسیم اتنی حواس باختہ کیوں رہتی ہے [illegible] اتنی قیمتی چیز اور یہ بے پروائی ؟"

" تو وہ کیا کرے ؟" آدمی لاکھ اپنی چیز کی احتیاط کرے لیکن اگر کسی دن کسی اللہ کے بندے نے فیصلہ کر لیا ہو کہ چوری کرنی ہی ہے تو موقعہ مل ہی جاتا ہے ——— غضب خدا کا بھرے گھر سے یوں چیز[illegible] غائب ہونے لگیں تو کاہے کو زندگی بسر ہوگی اس گھر میں ؟"

" تمہارا شبہ ہے کسی پر ——— ؟"

"ہے بھی اور نہیں بھی ، سب پر ہے ، کسی پر نہیں !"

"یہ کیا بات ہوئی ؟"

" آنکھوں سے دیکھا ہو چوری کرتے تو نام بھی لے دوں ، جب اندازے ہی پر بات ٹھیری تو کئی نام ذہن میں آتے ہیں ——— آپ کی پولیس خود بخود پکڑ لے گی چور !"

"(مسکرا کر) پکڑ تو میں سکتا ہوں لیکن اس میں دیر بہت لگے گی۔ آسان
نسخہ یہی ہے جو تم نے سوچا ہے —— نام نکلواؤ۔"
لیکن ایک بات کہے دیتی ہوں۔"
ایک نہیں دس کہو لیکن جلدی۔ میں بہت ضروری باتیں کر
رہا ہوں۔
"جس کا نام نکل آیا اس سے اقرار آپکو کرانا پڑے گا، اور
مال بھی برآمد کرانا ہوگا!"
"یہ سب بھی ہوتا رہے گا۔" تم نام نکلواؤ پہلے —— ہاں
اعجاز سے مخاطب ہو کر۔ اگر ریل پر نہیں جاؤ گے تو کیا پیادہ پا
نوردی کرو گے؟"
اعجاز نے حسرت اور بے کسی کے ساتھ کہا
"اور کیا کر سکتا ہوں چچا جان۔ میری کل پونجی پانچ ....
روپے اور کچھ آنے ہیں —— دیکھ لیجئے!
یہ کہہ کر اعجاز نے کوٹ کی بالائی جیب الٹ دی۔ پانچ کا
نوٹ تو کہیں اٹک گیا۔ چند آنے پیسوں کے ساتھ گھڑی باہر
نکل آئی۔
وہی نسیم کی گمشدہ گھڑی جس کے لئے کلثوم نام نکلوانے کا انتظام کر
رہی تھی!"

(۱۲)

گھڑی دیکھتے ہی کلثوم اور احراز نے بیک وقت اسے اٹھانے کی کو
کی - پہلا ہاتھ کلثوم کا پڑا - اس نے اٹھا لی کچھ دیر تک ا
ہاتھ میں لئے دیکھتی رہی - پھر شوہر کی طرف بڑھاتی ہوئی بولی -
"دیکھ لیجئے وہی ہے!"

احراز نے بھی اسے الٹ پلٹ کر خوب اچھی طرح دیکھا اور ل
میز پر رکھتے ہوئے کہنے لگا

"ہاں وہی ہے!"

ادھر اعجاز کا یہ عالم کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں —— چہر
کا رنگ فق، ہوائیاں اڑتی ہوئی، آنکھوں میں شرمندگی اور ندامت

کے آثار، اضطراب، گھبراہٹ، پریشانی، وہ لاکھ صفائی دیتا، اصل واقعہ بیان کرتا مگر کون تھا جو اس کی بات پر یقین کرتا۔ وہ ایک چور کی طرح کان دبائے بیٹھا تھا۔ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر زبان ساتھ نہیں دیتی تھی۔

کئی منٹ تک مجلس پر سناٹا چھایا رہا۔ پھر کلثوم نے طنز کا تیر پھینکا۔

"واہ بھیا واہ، جیتے رہو، خوش رہو۔ نظر بد دور، واقعی بڑے نیک اور سعادت مند ہو۔ روپے کی ضرورت تھی، مجھ سے کہتے۔ میں دے دیتی اپنے چچا سے کہتے وہ دے دیتے۔ وہ تو اولاد کی طرح تمہارا مان رکھتے ہیں اور تمہیں چاہتے ہیں۔ پکّے سے پکّا چور بھی اپنے گھر سے سات گھر چھوڑ کر چوری کرتا ہے۔ تم نے ڈاکہ ڈالا اپنے ہی گھر میں، اپنی بہن کے مال پر۔ اپنے چچا کی کمائی پر ——

اعجاز نے اس وقت جس صفائی اور بے باکی سے گفتگو کی تھی اور باپ کو اور باپ کے ساتھ سارے خاندان کو دھنک کر رکھ دیا تھا، اعزاز اس پر بڑی دیر سے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ اب امتیاز سے وہ اس کی سفارش نہیں کرے گا اس لڑکے کی سعادت اور خوش اطواری کے بارے میں جو رائے اس

نے قائم کی تھی وہ قطعاً غلط تھی - یہ تو بڑا سرکش، باغی اور شو
معلوم ہوتا ہے ابھی یہ لچھن ہیں تو آگے چل کر نہ جانے کیا ستم
گا اور اب گھڑی کے واقعہ نے تو اسے نعل در آتش کر دیا۔ ا
جی چاہ رہا تھا کہ اس کے کان پکڑ کر خود ہی گھر سے باہر نکال د
کا انتظار بھی نہ کرے ۔

لیکن اس کی ضرورت یوں نہیں پیش آئی کہ دفعتہً امتیاز
اسے آتا دیکھ کر کلثوم نے دل ہی دل میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر اد
اس سے بہتر موقعہ اس کانٹے کو راستے سے ہٹانے کا کوئی نہیں
یہ خداداد موقعہ ہے اس سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیئے ۔

چنانچہ جیسے ہی امتیاز آکر بیٹھا - کلثوم نے گھڑی اٹھائی ا
سے کہا: -

"اب بھائی صاحب (امتیاز) سے یہ قصہ لے کر نہ بیٹھ ج
گا ——— (اعجاز سے) لیکن بیٹے تمہیں بھی آیندہ کے لئے توبہ
لینی چاہیئے - ابھی سے اگر چوری کرنے کی عادت پڑ گئی تو آئندہ چ
تو ڈاکہ ڈالو گے ۔ ———

یہ عجیب و غریب باتیں سن کر امتیاز کے کان کھڑے ہوئے
نے کلثوم سے پوچھا -

"کیا بات ہے بھئی؟"

کلثوم بات کو چھپانے کی کوشش کرتی ہوئی بولی :۔

"کچھ نہیں بھائی صاحب" ——— جو ہونا تھا ہو گیا"

امتیاز نے احراز سے سوال کیا ۔

"بتاتے کیوں نہیں کیا بات ہے؟"

اب احراز کو قطعاً کوئی ہمدردی اعجاز سے نہیں رہ گئی تھی اس نے وہ ساری گفتگو دوہرا دی جو اس کے اور اعجاز کے مابین ہوئی تھی اور گھڑی کا افسانہ بھی سنا دیا ۔

امتیاز نے خون آشام نظروں سے اعجاز کو دیکھا اور کہا

"کمبخت تو صرف بدتمیز آشفتہ دماغ اور اوباش نہیں چور بھی ہے" ——— کیوں میاں احراز اب بھی اس ناخلف کی سفارش کروگے ؟ (اعجاز سے) میں ہرگز اس گھر میں تیرا منحوس وجود نہیں برداشت کر سکتا !

اعجاز نے کہا "میں سب کچھ ہوں، مگر چور نہیں ہوں!"

امتیاز نے اٹھ کر تابڑ توڑ کئی زوردار طمانچے لگائے اور کہا۔

"تو چور کیوں ہوتا چور تو میں ہوں، احراز ہے، کلثوم ہے۔ نکل جا یہاں سے، خبردار جواب کبھی اپنا رِدّے زشت لے کر

اس گھر میں آیا، ——————— نالائق، ناخلف، ننگ خان

## دوسرا حصّہ

# منزل بہ منزل

○

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول

○

(۱)

اعجاز خاموشی کے ساتھ کمرہ سے باہر نکلا اور رخصت ہو گیا!

اس نے وہ گھر چھوڑ دیا جہاں وہ پیدا ہوا تھا جہاں اس نے ہوش کی آنکھیں کھولی تھیں۔ جہاں ماں کی ماتا کا جلوہ دیکھا تھا جہاں جورِ پدر کے کرشمے دیکھے تھے اور آج جہاں سے چور بنکر اسے نکلنا پڑا تھا

——— بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچہ سے ہم نکلے!

یوں تو اس نے خود ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ اب اس گھر میں نہیں رہے گا لیکن یہاں سے اس طرح نکلنا پڑے گا اس کا اس نے کبھی تصور نہیں کیا تھا۔ وہ ایک اصول کی خاطر، ایک جذبہ سے متاثر ہو کر خود سے رضاکارانہ طور پر جلا وطن ہو رہا تھا لیکن یہ کیا معلوم تھا کہ اس کی چوری پکڑی جائے گی اور نہایت ذلیل کر کے، گھر کے ہر آدمی

کی نظر میں ذلیل کر کے اسے یہاں سے نکالا جائے گا ۔

اس وقت کیفیت یہ تھی کہ وہ پاؤں رکھتا کہیں تھا، پڑتے کہیں تھے ۔ دماغ گھوم رہا تھا ۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھایا ہوا تھا ۔ سارے بدن میں سنسنی ہو رہی تھی ۔ آنکھیں خشک تھیں، لیکن دل خون کے آنسو رو رہا تھا ۔

کمرہ سے نکل کر صحن میں پہنچا تو تمام حالات سے بے خبر زلیخا اپنے کمرہ کے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی ۔ اس تبسم میں معصومیت بھی تھی اور ناواقفیت بھی !

وہ بولی، " بھیّا کہاں جا رہے ہیں ؟ ——— اپنا جلوس نکلوانے، مٹھائی ہمارے لئے بھی لائیے گا "

اسے معلوم تھا اعجاز کہاں جا رہا ہے ؟ وہ جانتی تھی کہ اس کے استادوں نے اور ساتھیوں نے آج تقریب مبارکباد کا اہتمام کیا ہے اور وہ نہایت شان کے ساتھ اس میں شرکت کے لئے جا رہا ہے ۔

لیکن اس کا چہرہ اترا ہوا کیوں ہے ۔ یہ پریشان، مغموم، افسردہ اور دگرگوں کیوں نظر آ رہا ہے ؟

کیا کوئی خاص بات ہے ؟ کوئی خاص حادثہ پیش آیا ہے ؟

اس نے کچھ تذبذب اور تامّل کے بعد کہا : ۔

"بھیا وہاں تو خوش خوش جانا چاہیئے - تم اتنے پریشان اور حواس باختہ کیوں نظر آرہے ہو؟

اعجاز نے نظر اٹھا کر زلیخا کو دیکھا - ان نگاہوں میں رحم بھی تھا ہمدردی بھی - اور فریاد بھی -

لیکن زلیخا یہ کچھ نہ پڑھ سکی اور اعجاز اس کے سوال کا جواب دیئے بغیر تیزی سے باہر نکل گیا ۔

زلیخا کچھ نہ سمجھ سکی کہ ماجرا کیا ہے!

اعجاز کے جانے کے تھوڑی دیر بعد نسیم ادھر سے گزری ۔ زلیخا اب تک اپنے کمرے کے دروازے پہ کھڑی تھی - اسے دیکھ کر شرارت سوجھی ، پوچھا

کیوں بی نسیم ، بہت کھوئی کھوئی سی رہتی ہو آج کل ——
سنا ہے گھڑی جاتی رہی تمہاری لیکن اگر ہمارا منہ میٹھا کرنے کا وعدہ کرو تو —"

———

نسیم نے تیوری چڑھا کر سوال کیا

"تمہارا منہ میٹھا کرنے کا وعدہ کر دوں تو کیا ہوگا؟"

وہ بولی "تلاش کرنے کی کوشش کریں گے ہم بھی!"

نسیم نے بے پروائی اور حقارت کے ساتھ کہا :-

"جی بخشیئے، آپ کی کوشش کے بغیر میری گھڑی مل گئی۔"
زلیخا ہنس پڑی، کہنے لگی۔
"جھوٹی کہیں کی —— مل چکی!"
نسیم نے گھڑی نکال کر اسے دکھاتے ہوئے کہا:۔
"یہ رہی —— ہے وہی یا نہیں؟"
زلیخا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
"ہاں ہے تو وہی، لیکن کیسے مل گئی؟ ضرور چور سے ملی ہوئی ہو تم۔"
نسیم نے ابھی جواب نہیں دیا تھا کہ شبیر بھبر ادھر سے گذرا۔ اسے دیکھ کر دونوں چپ ہو گئیں۔ امتیاز نے نسیم سے پوچھا:۔
کیا باتیں ہو رہی تھیں بیٹی؟
وہ جلی ہوئی تو تھی ہی کہنے لگی:۔
"زلیخا کہہ رہی ہے اگر منہ میٹھا کرنے کا وعدہ کرو تو گھڑی تلاش کر دیں گے ہم۔ میں نے کہا۔ وہ تو مل بھی گئی تو کہنے لگی، ضرور تم نے چور سے ساز باز کر رکھی ہو گی۔ ——"
امتیاز کے لئے، اس سے زیادہ سننا دشوار ہو گیا، اس نے بادل کی طرح گرجتے ہوئے زلیخا سے سوال کیا۔

"تم یہاں تلاش کرتیں نسیم کی گھڑی؟"

زلیخا سے کوئی جواب نہ بن پڑا، وہ سٹ پٹا گئی۔ امتیاز نے پھر سوال کیا،

"تو جانتی تھی، یہ گھڑی کس کے پاس تھی؟"

زلیخا پھر چپ رہی، امتیاز نے ڈپٹتے ہوئے پوچھا:

"بتاؤ، میں کیا پوچھ رہا ہوں؟"

اس نے سوچا، جب بھیا (اعجاز) نے گھڑی دے ہی دی تو اب راز داری کی کیا ضرورت ہے، کہنے لگی:-

"بھیا کے پاس تھی، انہی نے دی ہو گی"

امتیاز نے ایک مرتبہ گھور کر زلیخا کو دیکھا۔ اس کا سارا بدن کانپ رہا تھا اور پھر اتنے زور سے کہ پانچوں انگلیوں کے نشانات ابھر آئے۔ گال پر ایک طمانچہ مارا اور کہا:

"تو بھی چور، وہ بھی چور ———

اور نکلا ہوا باہر چلا گیا۔

چوٹ اتنی زبردست تھی کہ زلیخا کو چکر آ گیا۔ سامنے کی تمام چیزیں گھومتی ہوئی نظر آنے لگیں۔ وہ جہاں کھڑی تھی اسی جگہ بیٹھ گئی۔

نسیم کو اعجاز کی اس حرکت پر صدمہ بھی تھا اور غصہ بھی، لیکن اب اسے یقین ہو گیا کہ زلیخا بھی اس جرم میں برابر کی شریک تھی، تو اس کا صدمہ اور غصہ بہت زیادہ بڑھ گیا، اسے زلیخا کے پٹنے پر افسوس نہیں ہوا آخر دل کی بات بے ساختہ زبان پر آگئی، اس نے کہا:

"مجھے تم سے یہ توقع نہیں تھی زلیخا۔ اعجاز بھائی سے اس کا گمان تھا۔ آخر میری گھڑی چرا کر تم بہن بھائی کو کیا مل جاتا؟"

زلیخا دفعتہً اٹھ بیٹھی، اس نے حقارت کی ایک نظر نسیم پر ڈالی اور کہا:

"کیا تم مجھے اور بھیا کو چور سمجھتی ہو؟"

وہ چڑ کر بولی "اکیلی میں ہی سمجھتی ہوں؟ ابھی بڑے ابا امتیاز کیا کہہ گئے ہیں سنا نہیں ——— تمہیں تو انہوں نے صرف ایک طمانچہ مارا، لیکن اعجاز بھائی کو تو گھر سے نکال دیا۔"

زلیخا اپنی مار اور اپنی چوٹ بھول گئی، اس نے باچشم پرنم سوال کیا:-

"کیا کہا تم نے؟ ——————— کیا بھیا کو گھر سے نکال دیا؟"

نسیم نے جواب دیا "نکال نہیں دیا تو بھر گئے کہاں ہیں؟
وہ بولی، "آج ان کے اسکول میں مبارکباد کا جلسہ ہے۔ وہاں گئے ہیں اور کہاں جائیں گے!
نسیم نے متجسّسانہ طور پر دریافت کیا۔
"مبارکباد کا جلسہ کیسا؟"
وہ بولی "سارے صوبے میں وہ اوّل آئے ہیں نا میٹرک کے امتحان میں۔ اسی خوشی میں انہیں مبارکباد دینے اور ہار پھول سے لاد دینے کے لئے ان کے استادوں اور ساتھیوں نے اپنے پاس سے چندہ جمع کر کے ایک شاندار جلسے کا انتظام کیا ہے"؟
نسیم کچھ کہنے والی تھی کہ کلثوم کا ادھر سے گزر ہوا وہ دونوں کے قریب ہو کر کھڑی ہو گئی، اور نسیم سے کہنے لگی:۔
بیٹی، اتنی مصیبت کے بعد تو گھڑی ملی ہے اب کیا کوئی اور چیز چرانا چاہتی ہو؟—— بس بھر پایا آؤ چلو۔ خبردار جواب کبھی اس طرف میں نے تمہیں آتے دیکھا"۔
آگے آگے کلثوم اور پیچھے پیچھے نسیم دونوں چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد وہ چوٹ پھر ابھر آئی۔ جو امتیاز کے طمانچے کا نتیجہ تھی، وہ اضطراب اور قلق کے عالم میں آ کر اپنے بستر پر لیٹ گئی۔

اتنے میں دبے پاؤں نادرہ آئی ـــــــ اسے لگائی بجھائی میں اور یہاں کی وہاں لگانے میں بڑا مزا آتا تھا برسوں سے اسس گھر میں ملازم تھی اور نہایت ہوشیاری کے ساتھ اپنے ذوق کا سامان پورا کر لیا کرتی تھی، اس نے آتے ہی ہمدردی اور اپنایت کے لہجہ میں کہا :

" اے بی کیا اسس طرح لیٹی رہو گی ـــــــ بھائی کی خبر تو لو"

زلیخا اٹھ کر بیٹھ گئی، نسیم نے جو کچھ کہا اعجاز کے بارے میں اور جسے اسکی تسلیم نہیں کیا تھا، اب وہ امر واقعہ نظر آنے لگا، اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، اس نے پوچھا:

" اور آخر بات کیا ہوئی نادرہ ؟"

نادرہ نے جو کن سوئیاں لینے کے فن میں ماہر تھی اور جس نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ دروازے کی آڑ میں کھڑے ہو کر سارا ماجرا اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور تمام باتیں اپنے کان سے سنی تھیں، ایک ایک حرف پوری تفصیل کے ساتھ بلکہ نمک مرچ لگا کر بتا دیا اور پھر نہایت مکاری کے ساتھ تیز آواز میں بولی

نہ جانے بے چارہ کہاں ہو گا اس وقت ؟ کیا کر رہا ہو گا؟ کہاں جائے گا ؟ کہاں رہے گا؟ کہاں سے اپنی ضروریات پوری کرے

گا ——— میرے پاس زیادہ تو نہیں پانچ روپے کا نوٹ تھا۔ جی چاہا، وہی اس کی جیب میں زبردستی ڈال دوں، لیکن بہن اس جلاد (اثمیانہ) کے ڈر سے ہمت نہ پڑی۔ میری بھی شامت آجاتی تو مجھے کہاں پناہ ملتی؟

## (۲)

اعجاز کو گھر سے نکال کے اور زلیخا کی پٹائی کر کے امتیاز مردانے میں آ کر بیٹھ گیا۔ اس کا غصہ اب تک نہیں اترا تھا۔ اگر اعجاز واقعی چلا نہ گیا ہوتا تو شاید زلیخا سے زیادہ اسے پیٹتا۔

حقہ سامنے رکھا تھا، اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد، بے دلی سے ایک آدھ کش لگا لیتا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد کچھ لڑکے جو تقریباً اعجاز کے ہم عمر تھے، سائیکل پر آتے ہوئے دکھائی دیئے، انہوں نے سائیکل دروازے کے پاس رکھی خود اندر کمرہ میں چلے آئے۔

امتیاز نے دونوں کے سر وپا پر ایک نظر ڈالی اور پوچھا:۔

"تم کون لوگ ہو اور کس سے ملنا چاہتے ہو؟"

ان میں سے ایک نے جواب دیا

" ہم اعجاز کے اسکول فیلو ہیں اور انہی سے ملنے آئے ہیں ۔۔۔ وہ ہیں یا گئے ؟

امتیاز نے ایک مرتبہ پھر غور سے دونوں کو دیکھا اور پوچھا :-

" ہے تو نہیں ، لیکن جانا کہاں تھا ؟

ایک بولا ، وہ سارے صوبے میں اوّل آئے ہیں ۔ یہ بات اگر اعجاز کے لئے باعثِ مسرت ہے تو ہمارے لئے باعثِ فخر ، چنانچہ ان کے اعزاز میں ہم نے ایک شاندار پارٹی کا انتظام کیا ہے ——

دوسرا ساتھی بولا " لیکن پر لطف بات یہ ہے کہ بارات کا دولہا غائب ہے ۔ انہیں ہم نے دس بجے کا وقت دیا تھا اور اب ساڑھے گیارہ بج چکے ہیں ۔ ——

امتیاز نے سب کچھ سننے کے بعد کہا

" وہ یہاں سے تو گیا کافی دیر ہو گئی اسے گئے ہوئے ۔"

" لیکن وہاں تو اب تک نہیں پہنچے ۔"

" شاید اب پہنچ گیا ہو گا ؟

لیکن راستہ تو ایک ہی ہے وہاں گئے ہوتے تو راستے میں مل نہ جاتے ؟

"تم لوگ بحث کیوں کر رہے ہو؟ —— کہہ دیا وہ یہاں
نہیں ہے۔ اب اسکول گیا ہے یا جہنم؟ میں نہیں جانتا
دونوں لڑکوں نے حیرت سے انتیاز پر ایک نظر ڈالی اور واپس
چلتے چلتے، ایک نے دوسرے سے سرگوشی کے لہجہ میں ——
جسے انتیاز نے سن لیا —— کہا۔
کتنا ڈراؤنا شخص ہے —— ہو نہ ہو یہی اعجاز کا باپ
ہے۔"

اور پھر دونوں اچک کر سائیکل پر بیٹھے اور نو دو گیارہ ہو گئے۔
اسٹیشن راستے میں پڑتا تھا اگر آتے وقت ان دونوں نے ادھر جھانک
لیا ہوتا تو شاید اعجاز سے ملاقات ہو جاتی، لیکن وہ ایسا کیوں کرتے
اعجاز گھر سے نکل کر سیدھا اسٹیشن پہنچا۔ میل جا چکا تھا۔ البتہ اتفاق
کی بات کہ پسنجر ٹرین کھڑی تھی۔ یہ رات کے گیارہ بجے فیض آباد پہنچتی
تھی۔ اعجاز بسم اللہ مجریہا دمرہا کہکر اس میں بیٹھ گیا۔ ٹکٹ اس نے ایک
درمیان کے سٹیشن سعادت گنج کا لیا تھا۔ وہ پانچ روپے کا نوٹ جو اس
نے احراز کو دکھانا چاہا تھا۔ اس وقت تو نہ ملا، اب دستیاب ہوا، اور
بڑا کام آیا۔ سعادت گنج کا ٹکٹ تین روپے بارہ آنے کا بنتا تھا۔ اس
نے خرید لیا اور سفر شروع کر دیا۔

سعادت گنج میں اس کی بیوہ خالہ رہتی تھیں۔ سوچا وہاں چند روز رہے گا۔ پھر دس پندرہ روپے ان سے لے کر فیض آباد چلا جائے گا۔ وہ بے چاری بھی مریم کی طرح بڑی نیک اور محبت کرنے والی بی بی تھیں اس طرح اور اس حالت میں وہاں جانے کو جی تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن مجبوری تھی۔ اس کے سوا کوئی تدبیر بھی نہ تھی فیض آباد پہنچنے کی۔

کمپارٹمنٹ کے ایک گوشہ میں بیٹھا وہ باہر کے مناظر کی بظاہر سیر کر رہا تھا۔ لیکن درحقیقت وہ سخت ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔

اسے گھر چھوڑنے کا صدمہ نہیں تھا لیکن جس طرح گھر چھوڑنا پڑا تھا اس کا بہت زیادہ صدمہ تھا۔

اور اب وہ ایک جلا وطن کی طرح فیض آباد کی طرف رواں دواں جا رہا تھا۔ لیکن سوچ رہا تھا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہاں قسمت کا لکھا کیا پیش آتا ہے؟

کالج میں داخلہ کہاں سے ہو گا؟ کتابیں کس طرح خریدی جائیں گی بورڈنگ کے مصارف کہاں سے آئیں گے؟ روزمرہ کی ضروریات کے مصارف کس طرح پورے ہوں گے؟

خالہ بیچاری بیوہ تھیں اور وہ جو مثل مشہور ہے، مولی اپنے پتوں

آپ ہی بھاری، ان پر بالکل صادق آتی تھی۔ شوہر کا انتقال ہو
ان کے چھوٹے چھوٹے کئی بچے تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت اور پرور
بار تمام تر انہی کے دوش ناتواں پر تھا۔ خالو نے کوئی جائیداد نہیں
تھی۔ صرف تین چار دوکانیں چھوڑی تھیں جن کا ماہوار کرایہ کم و بی
دو ڈھائی سو آجاتا تھا۔ بس اسی میں گزر بسر ہوتی تھی۔ ان حالات
ان سے مکمل یا معقول امداد کی توقع رکھنا حماقت تھی۔ وہ زیادہ سے
یہی کر سکتی تھیں کہ دس پندرہ یا حد سے حد ۲۵۔۔۳۰ روپے دے د
بلکہ سچ پوچھو تو اس رقم کا نکالنا بھی ان کے لئے خاصا دشوار ہوگا
بہر حال اتنی رقم تو ان سے مل جائے گی۔

لیکن اس رقم سے بنے گا کیا؟ ——— کالج اور بورڈنگ
داخلہ سے لے کر کتابوں کی خریداری تک کا مرحلہ کس طرح طے ہوگا؟

یہی سوچتے سوچتے وہ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے سو گیا!

اعجاز کے ساتھیوں کو رخصت کرنے کے بعد امتیاز پر خلش،
اور وحشت کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس نے حقہ ایک طرف رکھا،
اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اتنا تیز، اتنا ذہین ساتھیوں
استاد دل میں اتنا ہر دلعزیز لڑکا ——— اور اس کے یہ لچھن
کتنے افسوس اور غیرت کا مقام ہے کہ اس نے چوری کی، گھر میں

کی - چچازاد بہن کی چیز چرائی ؟

لیکن اس نے چوری کیوں کی ؟

یقیناً اسے روپیہ کی ضرورت تھی ——— لیکن کیوں ؟

شاید اس لئے کہ وہ اپنے ظالم باپ کے پاس نہیں رہنا چاہتا تھا۔

احراز نے اس کی جو گفتگو میرے سامنے دوہرائی اس سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مجھے مریم کا قاتل سمجھتا ہے۔ مجھ سے متنفر ہے اور اس گھر سے رخصت ہونے کا منصوبہ پہلے ہی سے تیار کر چکا تھا۔

تو گھڑی اس لئے چرائی تھی کہ اسے فروخت کر کے یہاں سے رختِ سفر باندھے !

"بے وقوف لڑکا !"

اتنے میں پوسٹ مین آیا۔ امتیاز لپک کر آگے بڑھا۔ اس نے پوچھا "کیوں بھئی کوئی خط لائے ہو ؟

پوسٹ مین نے دو خط بڑھاتے ہوئے کہا :-

"جی ہاں ، ——— اعجاز میاں کے نام ہیں !

خط دے کر پوسٹ مین چلا گیا۔ امتیاز نے لفافوں پر ایک نظر ڈالی پہلا لفافہ کھولا - یہ محکمہ تعلیمات کے ڈائرکٹر کا خط تھا۔

"اتنے نمایاں طور پر تمہاری کامیابی سے متاثر ہو کر حکومت نے تمہارے

لئے تیس روپے ماہوار کا وظیفہ منظور کیا ہے۔ چونکہ تمہارے وطن سے قریب
ترین شہر فیض آباد ہے، لہٰذا وہاں کے گورنمنٹ کالج کے پرنسپل کو ہدایت کر دی گئی
ہے کہ تمہارا داخلہ کرلے، وظیفہ کی رقم پرنسپل کے توسط سے ہر مہینہ تم
کو مل جایا کرے گی۔"

امتیاز نے اس خط کو کئی مرتبہ پڑھا۔ پھر نہایت احتیاط سے جیب میں
رکھ لیا۔

اب دوسرے خط کی باری تھی یہ گورنمنٹ کالج فیض آباد کے پرنسپل
کا خط تھا۔

"حکومت کی طرف سے ۳۰ روپے ماہوار وظیفہ کی اطلاع تمہیں مل
گئی ہوگی۔ میں نہایت مسرت سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ تم آؤ تمہیں
داخلہ کے سلسلہ میں ہر امکانی سہولت دی جائے گی۔ نیز میں نے تمہاری
حوصلہ افزائی کے لئے یہ بھی طے کیا ہے کہ حکومت کے وظیفہ کے علاوہ
پرنسپل فنڈ سے بھی تمہیں پندرہ روپے ماہوار بطور وظیفہ کے دیئے جائیں
تاکہ بغیر کسی دشواری کے پوری یکسوئی کے ساتھ تم تعلیم کی تکمیل کر سکو
میں تمہیں اطلاع دیتا ہوں کہ تمہارے لئے مزید سہولتیں بھی زیر غور ہیں"

اس خط کو بھی امتیاز نے کئی مرتبہ پڑھا اور پھر کانپتے ہوئے
ہاتھوں سے جیب میں رکھ لیا۔

اس وقت امتیاز کی آنکھیں پرنم تھیں۔

وہ سوچ رہا تھا۔ اتنے ہونہار، اتنے ذہین، اتنے قابل لڑکے کو میں نے گھر سے نکال دیا! ——— میں نے اس کا مستقبل تباہ کر دیا۔ اگر وہ یہاں ہوتا تو یہ خط پا کر کتنا خوش ہوتا۔ کتنی خوشی اور مسرت کے ساتھ فیض آباد کا رُخ کرتا

لیکن اب نہ جانے وہ کہاں ہوگا؟ کہاں کی ٹھوکریں کھا رہا ہوگا!

نسیم کی گھڑی اگر اس نے چرائی تھی تو اس لئے کہ اسے فروخت کر کے زادِ راہ کا انتظام کرے۔ کالج میں داخلہ لے اور اپنے مستقبل کی تعمیر کرے!

وہ مجھ سے متنفر تھا اس لئے اسے چوری کرنی پڑی؟

بے شک وہ مجھ سے نفرت کرتا لیکن کیا حرج تھا اگر چوری نہ کرتا اسے جتنے روپے درکار ہوتے لے لیتا کیا میں انکار کر دیتا۔

انکار کس طرح کر سکتا تھا میں تو بڑی خوشی سے جو وہ مانگتا دے دیتا۔

اتنے میں دروازے کے پاس آہٹ سی ہوئی۔ امتیاز نے کڑک کر پوچھا:۔

"کون ہے"؟

زلیخا سامنے آکر کھڑی ہو گئی

ماں کی تصویر، مظلومیت کا پیکر - اس کے گال پہ واقعی پانچوں ا

کے نشانات ابھر آئے تھے !

آج پہلی مرتبہ امتیاز کو احساس ہوا کہ واقعی اس نے نہ بیوی کا حق

کیا - نہ اولاد کا ، اگر اسنے بیوی کا حق ادا کیا ہوتا تو مریم ابھی نہ مرتی ،

اسے ابھی مرنا ہی نہ چاہیئے تھا - اس کی ضرورت تھی ، بچوں کو بھی -

اور مجھے بھی ؟

دل ہی دل میں اس نے اعجاز کو معاف کر دیا -

اس نے ضمیر میں ایک طرح کی خلش محسوس کی ، اور اپنے آپ کو

ملامت سمجھنے لگا - اس نے اپنے آپ سے پوچھا مجھ جیسے باپ سے اولاد کو

ہی ہونی چاہیئے اور پھر دفعتہً اس نے زلیخا سے پوچھا :

" کیا تو بھی مجھ سے نفرت کرتی ہے ؟ "

زلیخا اس بے ہنگم سوال کا جواب نہ دے سکی - ٹکر ٹکر باپ کی طر

دیکھنے لگی - امتیاز نے بڑھ کر اسے اپنی طرف گھسیٹا اور اس کا سر اپنے سی

لگا کر رونے لگا - اسے روتا دیکھکر اور مہر پدر کا یہ جلوہ دیکھ کر زلیخا

بندِ غم بھی ٹوٹ گیا - وہ بھی اس کے سینے پہ سر رکھے رکھے رونے

اس برتاؤ نے وہ ساری دوری ختم کر دی، جو باپ اور بیٹی کے درمیان ہمیشہ سے چلی آ رہی تھی۔ دفعتہً اس نے سر اٹھایا اور باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا :-

"اباجی، نہ میں چور ہوں، نہ بھیّا نے گھڑی چرائی تھی!"

اتیانہ کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ اس نے پوچھا :-

"کیا کہا تو نے بیٹی؟"

"اور پھر بیٹی نے گھڑی کی چوری کا سارا افسانہ شروع سے آخر تک سنا دیا۔"

## (۱۳)

امتیاز خاموشی کے ساتھ لیکن باچشم پرنم یہ ساری داستان سن
رہا۔ پھر اس نے ایک آہ سرد کے ساتھ کہا:۔

"تو یہ تھی اصل بات؟"

زلیخا نے اقرار میں گردن ہلاتے ہوئے کہا:۔

"ہاں اباجی یہی بات تھی۔ صرف یہی بات تھی۔ کہئے تو قرآن شہ
اٹھا کر قسم کھا لوں!

امتیاز نے کچھ سوچتے ہوئے کہا:۔

"نہیں اس کی ضرورت نہیں، مجھے تمہاری زبان کا یقین ہے!"

زندگی میں آج پہلی مرتبہ باپ نے شفقت اور محبت کا اظہار کیا
لڑکی تھی کہ بچھی جا رہی تھی، جوش مسرت سے بے تاب ہوتی جا رہی

وہ ذرا دیر کے لئے ماں کا غم بھول گئی۔ اس نے محسوس کیا باپ کی ذات میں مہر پدر اور الفت مادر دونوں چیزیں جمع ہو گئی ہیں۔ یہ کتنی خوشی کی بات تھی۔ آج تک ایسا نہیں ہوا تھا۔ آج تک باپ نے کبھی اس کی بات نہیں پوچھی تھی۔ اس نے سیدھے منہ بات نہیں کی تھی۔ اس کی گفتگو کو درخور اعتنا نہیں سمجھا تھا لیکن آج وہ گھل مل کر باپ سے باتیں کر رہی تھی۔ یہ انقلاب، یہ ان ہونا انقلاب اپنے جلو میں مسرت اور نشاط و انبساط کی کتنی لازوال نعمتیں لایا تھا۔

کچھ سوچتے ہوئے زلیخا نے کہا:۔

"شاید بھیا اپنے اسکول گئے ہوں؟"

افیانہ نے افسردہ لہجہ میں جواب دیا۔

نہیں بیٹی، وہاں نہیں گیا وہ۔ ابھی اس کے ساتھی تلاش کرتے ہوئے آئے تھے یہاں!

زلیخا نے بے کلی کے ساتھ کہا:۔

"تو پھر کہاں گئے وہ؟"

"میں نہیں جانتا"

"شاید غیرت کے مارے بھاگ گئے کہیں"

ہاں شاید ایسا ہی ہو — لیکن نہ بھاگتا تو بھی جاتا؟

صاف ہے"

"اسی لئے تو مجھے اور تجھے چھوڑ کر چلا گیا!"

"اباجی لیکن سچ کہئیے گا اگر آپ ان کی جگہ ہوتے کیا کرتے ؟"

امتیاز نے کچھ سوچا اور کہا :-

"میں ؟ ——— میں بھی وہی کرتا جو اس نے کیا ہے!"

پھر وہ قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا اور فوراً ہی یہ قہقہہ گریۂ بے اختیار میں تبدیل ہو گیا۔

---

Nafrat

(۴)

زلیخا یہ تو ہمیشہ سے محسوس کرتی تھی کہ گھر میں اگر ابا جی کسی کا کچھ تھوڑا بہت خیال کرتے ہیں تو وہ اعجاز ہے، لیکن اسے چاہتے ہیں اور اتنا زیادہ چاہتے ہیں، اس کا اندازہ آج ہُوا۔ باپ کی اس زار و زبوں حالت پر اس کا دل بہت کڑھا۔ وہ کچھ کہنے والی تھی کہ امتیاز کے لب ہلے، اس نے کہا:۔

"مجھے غم اس کا ہے کہ یہاں سے وہ ایک داغ لے کر گیا ہے —— چوری کا داغ!"

"لیکن ابا جی! وہ ہر گز چور نہیں تھے۔ گھڑی پر میری نظر پڑی تھی میں نے اٹھائی تھی۔ میں نے سازش کی تھی۔ میں نے زبردستی انہیں سازش میں شریک کیا تھا، اور میں نے ہی اسے ان کی جیب میں رکھا اور اپنی جان

کی قسم دے کر رازداری کی تاکید کی تھی۔ اگر چور ہوں تو میں ہوں، ا
کہاں سے ہوئے ؟"

"لیکن بیٹی! انگلی تو اس کی جیب سے"

"اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"کیوں نہیں ہوتا؟ ۔۔۔۔ دیکھ لو سب کچھ ہو گیا، اب باقی
کیا رہا ہے؟"

"لیکن میں۔ اپنے بھیا پر یہ داغ نہیں لگنے دوں گی؟"

"کیا کروگی تم؟"

"میں ابھی جاتی ہوں اور نسیم کو سارا ماجرا سنا دوں گی۔ چچی اماں کو
اور چچا جان کو سارا واقعہ بتا دوں گی"

"اور وہ یقین کر لیں گے؟"

"کیوں نہیں کریں گے؟"

"وہ سمجھیں گے بھائی کے ماتھے سے کلنک کا ٹیکہ چھڑانے کی
ترکیب گھڑی گئی ہے ۔۔۔۔ نہیں بیٹی نسیم احراز یا کلثوم کس
سے کچھ نہ کہنا: اب تو جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب اسے قسمت کے
حوالے کرو!"

"کیا آپ بھیا کو بلائیں گے نہیں؟"

"مجھے کیا معلوم وہ کہاں ہے؟"

"ڈھونڈیئے، تلاش کیجئے۔ مل ہی جائیں گے؟"

"میں یہ بھی نہیں کر سکتا، میری بچی!"

"کیوں ابا جی۔ کیوں نہیں کر سکتے؟"

"کیا ایک چور کو گھر میں بلواؤں، کیا ایک چور کی تلاش کروں؟ میں ایسا نہیں کر سکتا؟"

"پھر چور ——"

"میری اور تمہاری نظر میں نہیں، لیکن کلثوم، احراز اور نسیم کی نگاہ میں وہ چور ہی ہے۔ ہم اس کی صفائی دینے کی جتنی کوشش کریں گے، وہ الٹی پڑے گی۔ رہنے دو اس بات کو نہ چھیڑو، اگر وہ بے گناہ ہے، اور میرا دل کہتا ہے کہ بے گناہ ہے تو قدرت خود ہی اسے بے گناہ ثابت کر دے گی؟"

"اس عرصہ میں جو کچھ بھی ان پر گزرتی رہے؟"

"ہاں —— اور بلانے کا جہاں تک تعلق ہے۔ اگر یہ واقعہ پیش نہ آیا ہوتا، لیکن وہ چلا گیا ہوتا۔ تب بھی میں اسے نہ بلاتا؟"

"کیوں نہ بلاتے؟"

"(پندار کے ساتھ) میں اس کا باپ ہوں، لاکھ خطا کار اور عصیاں

شعار سہی، لیکن اپنے بیٹے کے سامنے جھک نہیں سکتا۔ اس کی خودخا
نہیں کر سکتا۔ وہ بہر حال میرا بیٹا ہے اور میں اس کا باپ ہوں ؟

اور پھر ذرا دیر خاموش رہ کر، امتیاز نے سلسلۂ کلام جاری رکھ
ہوئے کہا:۔

"بیٹی زلیخا تم نہیں جانتیں۔ مجھے اس کے جانے کا کتنا صدمہ ہے
یہ صدمہ اس لئے اور زیادہ ہے کہ میں اپنے آپ کو خطاوار اور اسے بے
سمجھتا ہوں، لیکن امتیاز نے آج تک کسی کے سامنے گردن نہیں جھکا
کسی تیس مار خاں اور طرم خاں کے سامنے بھی نہیں۔ وہ اپنے بیٹے کے سا
جھک جائے گا؟ —— یہ کیسے ہو سکتا ہے، اس غم میں گھل گھل کر
مرجانا منظور ہے۔ مگر اپنی آن توڑ دوں، یہ نہیں ہو سکتا"؟

"تو پھر اب کیا ہوگا اباجی" —— بھیا کس طرح آئیں گے"؟

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا بیٹی!" —— اور ایک بار پھر تاکید
کرتا ہوں، خبردار کلثوم یا نسیم، یا احراز کے سامنے اعجاز کی بے گنا
کا قصہ کبھی نہ چھیڑنا، ورنہ مجھے صدمہ ہوگا اور میں تم سے خفا ہو جاؤں گ

"آپ کے حکم کے خلاف میں کچھ نہیں کر سکتی لیکن بھیا۔ ——"
اور یہ کہتے کہتے پھر اس کا گریہ گلوگیر ہو گیا۔ امتیاز نے ایک مرتبہ پ
اس کا سر سینہ سے لگایا اور شفقت و محبت کے ساتھ اس کے سر پ

ہاتھ پھیرنے لگا۔ زلیخا دیکھ نہ سکی، دیکھ سکتی تو یہ دیکھ کر اور زیادہ رونے لگتی کہ اس کا آن اور شان والا باپ بھی رو رہا تھا اور پوری قوت سے اپنے آنسو اور اپنی سسکی روکنے کی کوشش کر رہا تھا! — خود اس کا جی چاہ رہا تھا کہ روئے اور پھوٹ پھوٹ کر روئے،!

---

## (۵)

بڑی دیر تک اعجاز اپنی سیٹ پر بیٹھا سوتا رہا۔ آنکھ کھلی، تو کوئی بڑا اسٹیشن تھا۔ مسافروں کا ایک ریلا چڑھنے کی اور دوسرا ریل سے اترنے کی کوشش کر رہا تھا۔ خاصی کشمکش سفر ختم کرنے والوں اور سفر شروع کرنے والوں کے درمیان ہو رہی تھی، بعض منچلے کھڑکی کے راستے کود رہے تھے اور اتر رہے۔ گاڑی یہاں زیادہ دیر تک ٹھیرتی تھی لیکن اتنی دیر بھی نہیں کہ سارا وقت یہیں صرف کر دے۔ کافی کشمکش اور کافی دیر کے بعد یہ طوفان اور افرا تفری کا دور ختم ہوا۔ جنہیں جگہ ملی وہ بیٹھ گئے، جو جگہ نہ پا سکے وہ اس امید میں کھڑے ہو گئے کہ اگلے اسٹیشن پر کون مسافر اترتا ہے۔ جیسے اترے فوراً اس کی سیٹ پر قبضہ کر لیں، کچھ لوگ اس آس میں کھڑے تھے کہ کوئی مسافر پاخانہ یا پیشاب کے

کے لئے اٹھے تو اس کی جگہ پر براجمان ہوجائیں اور جب وہ اعتراض کرے
تو اسے اپنا ٹکٹ دکھادیں اور کہیں :-
"ہم نے بھی ٹکٹ خریدا ہے، کوئی یہ سیٹ ریزرو تھوڑی ہی
ہے تمہارے لئے۔ ایسے ہی دھنا سیٹھ ہو تو سکینڈ یا فسٹ کلاس میں
سفر کرو۔ یہاں تھرڈ میں کیوں مرے تھے آکر!"
گارڈ نے رخصت ہونے کا بگل بجایا لیکن ابھی جنبش میں نہیں آئی
تھی کہ پاس بیٹھے ہوئے مسافر نے اعجاز سے پوچھا :-
"آپ کہاں تشریف لے جارہے ہیں؟"
اعجاز نے بے رخی اور سرد مہری کے ساتھ جواب دیا۔
"فیض آباد تک ——————"
وہ ہنسا اور کہنے لگا :-
"یعنی آپ فیض آباد سے فیض آباد تک کا سفر کررہے ہیں؟"
اعجاز نے تیوری چڑھا کر سوال کیا :-
"مطلب کیا ہے آپ کا؟"
وہ ہنستا ہوا بولا "مطلب یہ ہے کہ جس اسٹیشن سے گاڑی چھوٹ
رہی ہے، یہ فیض آباد ہے۔ اس کے بعد دوسرا فیض آباد اب کہاں
آئے گا۔ یہ آپ ہی جانتے ہوں گے!"

یہ سن کر اعجاز ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا، بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا :-

"ارے ـــــــــ"

اور پھر، ٹھسا ٹھس بھرے ہوئے کمپارٹمنٹ سے باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔ اتنی دیر میں گاڑی نے رینگنا شروع کر دیا تھا۔ بہرحال جس طرح بھی ہو سکا۔ بعد از خرابیٔ بسیار دروازے تک پہنچا۔ اب گاڑی نے اسپیڈ پکڑ لی تھی لیکن اس نے ہمت کی اور پلیٹ فارم پر کود گیا جیسے ہی زمین پر پاؤں ٹکے ایک نئی مصیبت ٹکٹ کلکٹر کی صورت میں نظر آئی۔ اس نے ایک مرتبہ اعجاز کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا پھر پوچھا :-

"کودے کیوں؟"

وہ بولا "میں سو گیا تھا۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ فیض آباد آگیا"

اس جواب سے وہ مطمئن نہیں ہوا۔ اس نے پوچھا :-

سامان کہاں ہے کیا گاڑی میں رہ گیا؟

اعجاز نے ہراساں ہو کر جواب دیا :-

"سامان میرے ساتھ کچھ نہیں تھا"

"اب ٹکٹ کلکٹر اس کی طرف سے مشکوک ہو چلا تھا۔ اس نے

اور چبھتا ہوا سوال کیا

"اور ٹکٹ ؟ ـــ وہ ساتھ ہے یا نہیں ؟"

اعجاز کے چہرے پہ ہوائیاں اڑنے لگیں، اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ٹکٹ نکالا اور اس کی طرف بڑھتے ہوئے ایک مجرم کی طرح بجھے ہوئے لہجہ میں کہا:

"ٹکٹ تو یہ ہے، ـــــ لیکن سعادت گنج کا ہے ؟"

"ٹکٹ کلکٹر نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا، کہنے لگا :-

بہت اچھے قابلِ رشک ذہانت رکھتے ہو۔ کتنا اچھا گر ہے فیض آباد اترنے کے لئے "ٹکٹ سعادت گنج کا لیا جائے، اسے کہتے ہیں "ہلدی لگے نہ پھٹکڑی رنگ آئے چوکھا"

اعجاز لاجواب ہو کر خاموش ہو گیا - ٹکٹ کلکٹر نے پوچھا :-

"جواب کیوں نہیں دیتے بھئی ؟

وہ بولا، جواب کیا دوں، سوا اس کے کہ غلطی ہو گئی، دراصل مجھے اترنا سعادت گنج ہی تھا - اس کے بعد فیض آباد آج آنا تھا،

وہ گرگ باراں دیدہ ٹٹولنے والی نظروں سے گھورتا ہوا بولا :

بہت اچھے جا رہے ہو بھئی ـــــــــ گویا آپ فیض آباد قبل از وقت تشریف لائے -

جی نہیں وہاں مجھے کام تھا:

"اور یہاں بے کام ہی سے آنے والے تھے؛ لیکن وہاں کے بجا[ئے] یہاں آگئے۔ خیر زیادہ بحث و گفتگو کی ضرورت نہیں۔ جرمانے سمی[ت] بارہ روپے ساڑھے تین آنے نکالو جیب سے!

---

(۶)

لیکن اعجاز کے پاس روپے کہاں تھے جو پیش کرتا - ایک خطا کار کی طرح دم سادھے چپ چاپ کھڑا رہا - ٹکٹ کلکٹر کو غصہ آ گیا، اس نے کہا:

"نکالتا ہے یا پولیس کے حوالے کر دوں؟"

نہایت سکون کے ساتھ اعجاز نے جواب دیا

"پولیس کے حوالے کر دیجئے"

"تم روپے نہیں دو گے؟"

"میں کہاں سے دوں؟"

"پھر سفر کس بوتے پر کیا تھا، جب جیب خالی تھی؟"

اسی لئے تو سعادت گنج جا رہا تھا کہ یہاں آنے کے لئے

کرایہ کا بندوبست کر لوں؟

خیر تم کرایہ کا بندوبست نہیں کر سکے۔ ہم تمہارے روٹی کپڑے
بندوبست کئے دیتے ہیں۔ جیل میں بڑی اچھی خوراک ملتی ہے اور بڑا اچھا
ستھرا لباس رہنے کو شاندار کمرے۔ خدمت کو ملازم دست بستہ
ریڈیو کا بندوبست بھی ہوتا ہے۔ بڑے ٹھاٹھ سے رہو گے، آؤ چلو۔"

وہ چپ چاپ ٹکٹ کلکٹر کے پیچھے ہو لیا، دل ہی دل میں اپنے
کو اور اپنی بے وقت کی نیند کو ملامت کر رہا تھا، لیکن اب کیا
ہو سکتا تھا۔

اتنے میں سٹیشن ماسٹر کا کمرہ آگیا۔ ٹکٹ کلکٹر نے اسٹیشن ماسٹر سے
اعجاز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:۔

"آپ سے ملئے ———— آپ جیل جانے کے لئے
بے تاب ہیں؟

اسٹیشن ماسٹر صاحب نے عینک اتار کر الگ رکھدی اور غور سے اس
کا معائنہ کیا، پھر فرمایا:۔

"کیوں صاحبزادے جیل کیوں جانا چاہتے ہو؟

اعجاز نے اپنی اور ٹکٹ کلکٹر کی گفتگو مختصر طور پر دہرادی!

اسٹیشن ماسٹر صاحب غور سے اعجاز کی باتیں سنتے رہے، پھر پوچھا:-

"سعادت گنج کس کے پاس جا رہے تھے؟"

"وہاں میری خالہ رہتی ہیں!"

"کیوں جا رہے تھے ان کے پاس؟"

"گو ان کی بھی حالت اچھی نہیں لیکن مجھے امید تھی کہ وہ پندرہ بیس روپے مجھے دے دیں گی!"

"ان روپوں کا کیا کرتے؟"

"فیض آباد کا ٹکٹ لیتا اور یہاں آجاتا!"

"یہاں آکر کیا کرتے؟"

"کالج میں داخلہ لیتا"

"کیا تم نے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا ہے؟"

"جی ہاں ——"

"مارک کتنے لئے؟"

"ہزار میں ۹۱۵"

"یہ مارک تو اس لڑکے کے ہیں جو سارے صوبے میں اوّل آیا ہے آج ہی میں نے کسی سے سنا تھا!"

"وہ میں، ہی ہوں۔"

"(حیرت سے) سارے صوبے میں اوّل آنے والے تم ہو؟"

"جی ہاں —— جس طرح چاہے تصدیق کر لیجئے!"

خوب —— لیکن کالج میں داخلہ کچھ خالہ جی کا گھر تو ہے نہیں۔ داخلہ کے لئے روپے چاہئیں، کتابیں بھی خریدنی ہوں گی بورڈنگ میں رہو گے تو اس کے مصارف الگ ہوں گے۔ ڈے اسکالر بن کر رہنا چاہتے ہو تو بھی قیام وطعام کا بندوبست کرنا پڑے گا!

"جی ہاں، یہ سب ہو گا!"

"لیکن کس طرح؟" ——

—— اگر خالہ سے پندرہ بیس روپے مل جاتے تو یہ سارے کام اس سے انجام پا جاتے؟

"جی نہیں —— ان روپوں سے تو یہاں تک آجاتا اور دو چار روز کا خرچ چلا لیتا؟"

"اس کے بعد کیا کرتے؟"

"سب کچھ کر سکتا ہوں!"

"کیا کر سکتے ہو، کچھ معلوم بھی تو ہو؟"

"میں ایک نوجوان شخص ہوں، ٹیوشن کر سکتا ہوں - پارٹ ٹائم ملازمت کر سکتا ہوں ــ"

اور اگر ٹیوشن نہ ملے - پارٹ ٹائم ملازمت کا بندوبست بھی نہ ہو سکے تو؟ ــــ کیونکہ ضروری نہیں جو ٹیوشن کی تلاش میں نکلے اسے مل ہی جائے - یہی حال ملازمت کا بھی ہے - ملی تو ملی، نہ ملی تو نہ ملی!"

"جی ہاں یہ پہلو بھی غور طلب ہے!"

"پھر کیا غور کیا تم نے؟"

"مزدوری تو مل ہی جائے گی!"

"مزدوری بھی کر لو گے؟"

"کیوں نہیں؟ ــــ اگر آپ اجازت دیں اس اسٹیشن پر قلی کی حیثیت سے بھی کام کرنے کو آمادہ ہوں - اس طرح اتنی بات تو ہو ہی جائے گی کہ اپنے مصارف پورے کر لوں"

"کیا واقعی اس کے لئے تیار ہو تم؟"

بے شک، ــــ آخر مجھے اپنی زندگی بنانی ہے، اپنے مستقبل کی تعمیر کرنی ہے، اپنی حالت سدھارنی ہے، ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنے سے تو کچھ نہیں ہوگا"

"کیا تمہارے کنبہ میں کوئی ایسا نہیں جو کفالت کر سکے؟"

"جی نہیں"

ٹکٹ کلکٹر نے پوچھا :-

"ماں باپ سب مر گئے؟"

اسٹیشن ماسٹر نے اسے ٹوکا :-

کیوں ایسے بے دردانہ سوالات کرتے ہو، دو ہی باتیں ہو
تو ماں باپ مر گئے یا زندہ ہیں مگر کفالت نہیں کر سکتے، کر سکتے ہو
تو خالہ کے ہاں سعادت گنج کیوں جاتا؟

ٹکٹ کلکٹر نے پھر چوٹ کی "گیا کہاں؟ وہ تو سٹیشن ہی سے
سلام کرتا ہوا یہاں آن ٹپکا ——"

اسٹیشن ماسٹر نے اعجاز سے خطاب کرتے ہوئے کہا :

"بہرحال اگر تم سچے ہو تو میں تمہاری مدد کروں گا" ——
جتنے زیادہ تم سچے ثابت ہو گے، اتنی ہی زیادہ میری مدد بڑھتی جائے
گی"

---

## (٧)

اسٹیشن ماسٹر صاحب کا نام خلیق احمد تھا اور واقعی یہ اسم بامسمّٰی ثابت ہوئے ، حد درجہ خلیق، متواضع اور شریف ، انہیں اعجاز کی باتوں میں صداقت جھلکتی محسوس ہوئی انہوں نے ایک پریشان حال اور آشفتہ روزگار کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھا ۔ جس کوارٹر میں وہ رہتے تھے اس کا ایک کمرہ جس کا رُخ باہر کی طرف تھا ، انہوں نے اعجاز کے لئے خالی کرا دیا ، کھانا کھلایا ، بستر کا انتظام کیا ، اور بڑی دیر تک دلجوئی کی باتیں کرتے رہے

صبح ناشتہ کے بعد وہ اعجاز کو لے کر خود گورنمنٹ کالج گئے پرنسپل صاحب سے ان کی دیرینہ شناسائی تھی ، ادہر چٹ بھیجی ادھر بلا لیے گئے ۔ خلیق نے اعجاز کا تعارف کر دیا اور سفارش کی کہ

کہ اسے زیادہ سے زیادہ رعایت کے ساتھ داخل کر لیا جائے اور
زیادہ سے زیادہ سہولتیں ممکن ہوں بہم پہنچائی جائیں۔ پرنسپل
ایک زوردار قہقہہ لگایا اور کہا:۔

"آپ کس کی سفارش کر رہے ہیں؟ جو لڑکا سارے صوبے میں
آیا ہو اس کے لئے بھی سفارش کی ضرورت پیش آ سکتی ہے اور پھر
و سہولت کا سوال ہی کیا ہے۔ حکومت کی طرف سے تیس روپے ماہوا
وظیفہ کا اس کے لئے اعلان ہوا ہے اور پندرہ روپے ماہوار میں پرنس
فنڈ سے دوں گا۔ اس کے بعد بھی اگر کچھ کمی رہی تو دیکھا جائے گا،
کا بھی کوئی نہ کوئی بندوبست ہو جائے گا ——— کیوں میا
صاحبزادے میرا خط اور گورنمنٹ کا لیٹر مل گیا تھا؟"

اعجاز کچھ سٹ پٹا سا گیا، پہلو بدل کر رہ گیا۔ پرنسپل زندہ دل
اور خوش طبع آدمی تھے، ایک بار پھر زور سے ہنسے اور فرمایا:۔

"شاید وفورِ شوق میں تم خط ملنے سے پہلے ہی چل کھڑے ہوئے"
پھر پرنسپل صاحب نے دریافت کیا، بورڈنگ میں رہو گے؟ یا
شہر میں کہیں بندوبست کر سکتے ہو قیام کا؟

اعجاز نے کہا:۔ "شہر میں تو کہیں انتظام نہیں ہے۔"

پرنسپل صاحب نے سر کھجاتے ہوئے فرمایا:۔

"اچھا بھئی گنجائش نکالنا ہی پڑے گی ــــ بات یہ ہے اس مرتبہ بورڈنگ پر بڑی یلغار ہے ہر چہار طرف سے"!

اسٹیشن ماسٹر صاحب بول پڑے :-

کوئی مضائقہ نہیں، قیام کا انتظام ہو جائے گا۔ جب تک میرا تبادلہ نہیں ہو جاتا۔ یہ میرے پاس رہے گا۔

پرنسپل صاحب کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ پھر انہوں نے چند رسمی سی کارروائیوں کے بعد داخلہ کر لیا اور اعجاز سے کہا :-

"اب تم جا سکتے ہو، داخلہ ہو گیا۔ کل سے پابندی کے ساتھ حاضری دو۔ جس طرح تم نے اپنے اسکول کا نام روشن کیا ہے، اسی طرح مجھے امید ہے اس کالج کا نام روشن کرو گے۔ اپنے کنبہ اور خاندان کا نام روشن کرو گے"؟

کالج میں داخلے سے اور ۴۵ روپے ماہوار وظیفہ سے اور اسٹیشن ماسٹر صاحب کے ہاں قیام کے بندوبست سے اعجاز کو بڑی خوشی ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا اور بجا خیال تھا کہ بورڈنگ میں وقت بہت ضائع ہوتا ہے۔ ڈے اسکالر رہ کر آدمی زیادہ محنت اور یکسوئی کے ساتھ پڑھ سکتا ہے، لہٰذا اسٹیشن ماسٹر کی پیش کش کو اس نے دلی شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا تھا :-

لیکن جب پرنسپل صاحب نے اس کی حوصلہ افزائی کرتے
یہ امید ظاہر کی کہ وہ کالج کا، باپ دادا کا، کنبہ اور خاندان کا نام
کرے گا تو وہ دبی ہوئی سی آہ کرنے پر مجبور ہو گیا، اسے اپنا باپ
آیا جس سے وہ نفرت کرتا تھا، چچا یاد آیا، چچی اماں یاد آئیں،
یاد آئی، ان سب کی بے مہریاں اور کج ادائیاں یاد آئیں۔ گھر
آبرو ہو کر نکلنا یاد آیا۔ چوری کا الزام یاد آیا۔ باپ کے ہا
پٹنا یاد آیا اور وہ سوچنے لگا:۔

کیا میں اس خاندان کا، اور اس باپ کا نام روشن کر سکوں گا؟
اور پھر آنکھوں کے سامنے مرحومہ ماں کی تصویر گردش کر
—— زلیخا کا اترا ہوا چہرہ نظر کے سامنے آ گیا۔
ساری خوشی کافور ہو گئی، سارا ولولہ ختم ہو گیا!

---

(۸)

فیض آباد ایک پرانا شہر تھا ۔ یہاں کی جامع مسجد، یہاں کا امام باڑہ۔ یہاں کے شاہی مقبرے، یہاں کے اہل اللہ کے مزارات اور صوفیوں کی خانقاہیں اپنے اندر بڑی کشش رکھتی تھیں ۔

کالج سے واپسی پر اسٹیشن ماسٹر صاحب خود تو اسٹیشن اپنی ڈیوٹی پر چلے گئے مگر اپنے لڑکے لئیق کو حکم دے گئے کہ بہت اچھی طرح اعجاز کو شہر کے قابلِ دید مقامات کی سیر سہ پہر کو اپنے ساتھ لیجا کر کرا دے

دوپہر کے کھانے سے فراغت کے بعد اعجاز لیٹ گیا اور اپنے ماضی، حال اور مستقبل پر غور کرنے لگا :

لوگ ماضی کو بڑے شوق سے یاد کرتے ہیں لیکن اس کے ماضی میں اشک و آہ اور حسرت و محرومی کے سوا کیا تھا ۔ لوگ حال میں اتنے مگن

ہوتے ہیں کہ مستقبل کو یکسر فراموش کر دیتے ہیں لیکن اس کا حال کیا تھ
——— سعی ناتمام ، طلب نارسا۔
لوگ مستقبل کے سہارے زندہ رہتے ہیں ، کیسی کیسی امیدیں باندھ
ہیں ، اپنے روشن مستقبل سے ۔
لیکن اس کا مستقبل بھی روشن ہوگا ؟
کیا وہ بھی مستقبل کے دامن میں ماضی کی محرومیوں اور حال کی نارسا
کی تلافی کر سکے گا ؟ ———
یہ تھے وہ خیالات جو رہ رہ کر اس کے دماغ میں گردش کر
رہے تھے وہ کروٹوں پہ کروٹیں بدل رہا تھا لیکن نہ نیند آتی تھی
نہ ان خیالات کی یورش سے پیچھا چھوٹتا تھا ۔؟
اتنے میں چار بج گئے اور لیئق ، ایک نوخیز ، خوب رو اور تنو
، نوجوان بہت اچھے لباس میں ملبوس آکر بالکل سامنے کھڑا ہوگیا
اور آتے ہی تقاضا کیا :۔
" چلئے سیر کرا لائیں آپ کو ! "
اعجاز اٹھ کھڑا ہوا اور افسردگی کے ساتھ گویا ہوا :۔
" آیئے ——— چلیں سیر کر آئیں ! "
لیئق ٹھٹھا مار کر ہنسا اور کہنے لگا :۔

"کیا یوں ہی ؟"

اعجاز نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور کہا:-

"جی ہاں —— پھر اور کس طرح ؟

لیئق ان لوگوں میں تھا جو بہت جلد بے تکلف ہو جاتے ہیں، چنانچہ بڑے بے تکلفانہ لہجہ میں گویا ہوا:-

"خدا کے بندے، ہم باہر جا رہے ہیں سیر کو جا رہے ہیں - قابل دید مقامات کی زیارت کو جا رہے ہیں، آدمی بن کے چلو —— کپڑے تو بدل لو"!

اعجاز تلملا گیا۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا:-

"اچھا تو پھر کبھی دیکھا جائے گا"!

اور یہ کہہ کر وہ اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔

لیئق نے متحیّر ہو کر اسے دیکھا اور پوچھا:-

"پھر کبھی کیوں دیکھا جائے گا؟ —— تم جاتے جاتے بیٹھ کیوں گئے؟ ارادہ کیوں بدل دیا؟

اعجاز نے ایک پھیکے سے تبسم کے ساتھ جواب دیا:- "بات یہ ہے کہ جو کپڑے میرے بدن پر ہیں۔ ان کے سوا میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے نہ لباس، نہ ٹوپی، نہ جوتا"

لئیق نے خلوص اور محبت کی نظروں سے اپنے اس نئے
عجیب مہمان کو دیکھا اور بولا :-

تو اتنی سی بات پر حضور نے ارادہ ملتوی کر دیا، حد ہوگئی
کی - ہم تو تمہیں بھائی سمجھیں اور تم ——

اور پھر کچھ کہے بغیر وہ تیزی سے اندر گیا اور ذرا دیر میں ایک
سا سوٹ لیکر واپس آگیا

لیجئے جناب، "زیب تن فرمایئے اس ملبوس کو!"

اعجاز نے انکار کر دیا، لاکھ لاکھ انکار کیا، لیکن لئیق کے
اور بے تکلفی میں کچھ اس درجہ اپنایت تھی کہ آخر اسے ہتھیار
پڑے اور لئیق کا لایا ہوا لباس پہن لینا پڑا، لئیق نے اسے
جاکر آئینہ کے سامنے کھڑا کر دیا اور کہا :-

"سچ کہنا، کیا بالکل یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ سوٹ تمہارے
ہی سیا گیا تھا ؟"

اور واقعہ بھی یہی تھا، لئیق اعجاز کا ہم عمر بھی تھا اور ہم
اس کا سوٹ اعجاز کے بالکل فٹ آگیا، اس نے مسکراتے
کہا :-

"کہیں یہ میرا ہی تو نہیں ہے ؟"

لیئق ہنستا ہوٗا بولا، اگر نہیں تھا تو اب ہے! ——

—— آؤ چلیں، مغرب تک ہمیں واپس آجانا چاہیئے!

اعجاز منہ سے کچھ کہے بغیر اس کے ساتھ ہولیا، کبھی وہ اپنے آپ کو دیکھتا تھا، کبھی اپنے لباس کو، کبھی لیئق کو!

---

## (۹)

تھوڑی ہی دیر میں اعجاز نے محسوس کر لیا کہ لئیق بہت اچھ
ساتھی، بہت اچھا دوست اور بہت اچھا رفیق راہ ہے، ساتھ ہی
ساتھ بذلہ سنج، حاضر جواب اور خوش طبع بھی۔ خلوص سے بھرپور
اخلاق کا پیکر۔ یہ اعجاز کا نہیں لئیق کا کمال تھا کہ اس نے راستہ چلتے
چلتے اسے بھی بے تکلف دوست بنا لیا۔ ورنہ وہ تو آہوئے رم خورد
کی طرح کسی سے مانوس ہونا جانتا ہی نہیں تھا۔ محرومیوں اور مایوسیوں
نے شوق کی چنگاری افسردہ کر دی تھی۔ زمانہ کی ٹھوکروں اور اپنو
کی بے اعتنائیوں نے نشاط کار کا جذبہ اس سے چھین لیا تھا۔ باپ
چچا اور دوسرے عزیزوں کے سنگدلانہ برتاؤ نے اس کا اعتماد انسا
کے اوپر سے اٹھا دیا تھا۔ وہ سوچا کرتا تھا۔ جب یہ لوگ اپنے نہ ہوئے

دوسروں سے کیا توقع کی جا سکتی ہے ؟
لیکن اسٹیشن ماسٹر صاحب اور ان کے فرزند دلبند لئیق نے سے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ ——— ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں ہیں! ——— اس کا وہ اعتماد جو متزلزل ہو چکا تھا اتنی ہی سی دیر میں پھر بحال ہونے لگا، اب تک وہ اپنے آپ سے بھی نفرت کرتا تھا اور دوسروں سے بھی - اپنے بزرگوں اور عزیزوں تک سے بھی لیکن اب اس مختصر سی مدت میں وہ محسوس کرنے لگا، ہر شخص نفرت کا سزاوار نہیں ہوتا، ایسے لوگ بھی ہیں جو دوسروں کو اپنے ساتھ مانوس ہونے پر، محبت کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں ——— لئیق نے بھی تو یہی کر دکھایا ہے !

بہت دنوں کے بعد آج پھر اعجاز اپنے آپ کو چونچال محسوس کر رہا تھا۔ مسرت کا چشمہ ابل رہا تھا - اس کے دل حسرت نصیب سے

لئیق نے اسے بہت اچھی طرح سارے شہر کی سیر کرائی، کوئی بھی قابلِ دید اور قابلِ ذکر مقام ایسا نہیں تھا جو اس نے نہ دکھایا ہو - جہاں تک اعجاز کا تعلق تھا - آج زندگی میں پہلی مرتبہ اس تپاک اور گرمجوشی کے ساتھ اس کی پذیرائی ہو رہی تھی - اس کی

دلجوئی کی جا رہی تھی۔ ان باتوں کا نفسیاتی طور پر اثر پڑنا ہی چاہئے
تھا اور وہ پڑا بھی۔ یعنی اب اسے زندگی میں رعنائی اور کشش محسو[س]
ہونے لگی۔ وہ زندگی جو اسے کاٹنے کو دوڑتی تھی۔ جو اس کے لئے بارِ
جان ہو گئی تھی جس کا رُوئے زشت اس کے لئے سوہانِ روح بن
چکا تھا۔ اب اس کی کشش اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی اور وہ کھنچتا
چلا جا رہا تھا ——— نے ہاتھ باگ پر تھا نہ پا تھا رکاب
میں۔

مغرب کے قریب یہ سفر ختم ہو گیا۔ اعجاز نے جواب
دیا:۔

"اب چلنا چاہیئے۔ تم کہہ رہے تھے، مغرب تک ہمیں گھر
واپس آجانا ہے"!

لئیق نے جواب دیا:۔ ہاں بھئی اصول تو یہی ہے۔ اماں اسے
گوارا ہی نہیں کر سکتیں کہ ہم میں سے کوئی بھی غروب آفتاب کے بعد
گھر سے باہر رہے، لیکن آج کی آزادی ہمیں معاف ہے

اعجاز نے پوچھا:۔ "وہ کس طرح"؟

لئیق نے جواب دیا" تمہاری وجہ سے آج کسی طرح کی باز
پرس نہیں ہوگی ——— آخر مہمان کا بھی تو کچھ حق ہو[تا]

S. M.



...تا ہے۔

اعجاز نے کہا" لیکن مہمان تو گھر چلنے کے لئے تیار ہے۔"

...گر میزبان کی یہ مرضی نہیں ہے ———— سینما دیکھیں

...گے ذرا۔"

...سینما ————"

اس سے زیادہ اعجاز کچھ نہ کہہ سکا، اس نے سینما کا ذکر تو بہت ...سنا تھا، لیکن آج تک دیکھنے کا موقع نہ ملا تھا، اگر لئیق کا کوئی اور ...پروگرام ہوتا تو شاید وہ انکار کر دیتا اور اصرار کر کے واپس جاتا، لیکن ...سینما کی دعوت ایسی نہیں تھی جو مسترد کی جا سکتی، خود اس کا جی بھی ...چاہ رہا تھا کہ اس عجیب وغریب چیز کو ایک مرتبہ تو دیکھ لے ...جس کے لئے خلقت ٹوٹی پڑتی ہے، لوگ ٹکٹ کے انتظار میں گھنٹوں ...دوپہروں قطار بنائے کھڑے رہتے ہیں۔

لئیق نے پوچھا "تو پھر کیا ارادہ ہے؟"

اعجاز نے جواب دیا، "وہی جو تمہارا ہے۔"

"اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے، البتہ اگر گھر میں باز پرس ...ہوئی تو جواب وہی تمہیں کہنی پڑے گی، سوچ لو اچھی طرح ابھی ...وقت ہے اور موقع ہے۔"

لیکن لیئق نے قلندرانہ شان سے کہا :-

"جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا ، اب تو چلتے ہیں ۔

(۱۰)

کھیل خاصا دلچسپ تھا!

اور نہ دلچسپ ہوتا تو بھی دلچسپ تھا کیونکہ آج پہلی مرتبہ لسے سینما ہال میں قدم رکھتے اور پردۂ سیمیں پر متحرک بلکہ "بولتی گاتی" تصویریں دیکھنے کا موقع حاصل ہوا تھا

لئیق کے لئے یہ کوئی نئی چیز نہ تھی۔ وہ مہینے میں ایک آدھ بار کبھی ماں سے اجازت لے کر —— کیونکہ والد اس طرح کے معاملات میں بالکل غیر جانبدار تھے —— کبھی چوری چھپے دیکھ ہی آیا کرتا تھا، چنانچہ وہ سینما بھی دیکھتا رہا اور فلم پر تنقید بھی کرتا رہا اعجاز اتنا محو تھا فلم بینی میں کہ یہ تنقید اسے بے لطف کئے دے رہی تھی۔ لیکن ہوں ہاں کرنے پر مجبور تھا!

تنقید کے ساتھ ہی ساتھ تعارف کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ لیئق نے اپنے سارے معلومات کا دفتر آج اعجاز کے سامنے کھول دینے کا تہیہ کر لیا تھا۔ ہر اداکار کے بارے میں وہ ایک مستقل رائے رکھتا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ اعجاز گمراہی میں مبتلا ہو کر کوئی ایسی رائے قائم کرے جو اس کی رائے سے مطابقت نہ رکھتی ہو، لہٰذا وہ اپنا فرض سمجھ رہا تھا کہ اعجاز کی رہنمائی کرتا رہے۔

"یہ ایکٹر نہایت نالائق ہے۔ کبھی کوئی اچھا پارٹ نہ کر سکا، نہ جانے فلم والے کیوں اسے سر پر اٹھائے ہوئے ہیں!

"یہ ایکٹرس خوب صورت ضرور ہے لیکن مکالمے بولنے کی صلاحیت سے بالکل محروم ہے، لاحول ولا قوۃ۔ اور گانا تو بالکل نہیں جانتی"

"افسانہ اچھا ہے لیکن ڈائرکشن کمزور ہے!"

"فوٹوگرافی ٹھیک ہے لیکن صدابندی بالکل لغو اور مہمل۔"

جب تک فلم چلتی رہی۔ لیئق کی تنقید و تعارف کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ نہایت بے دلی، لیکن پوری مستعدی کے ساتھ اعجاز برابر ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ لیکن درحقیقت اس کی ساری توجہ فلم کی طرف مرکوز تھی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ وہ بہت لطف اندوز ہوا۔

انٹرول کے وقت لیئق نے آئس کریم کا آرڈر دیا۔ پھر بیٹھ

خستہ بادام اور پستے خریدے۔ خود بھی ان چیزوں سے لذت اندوز ہوئے ہوا اور اعجاز کو بھی اپنے ساتھ برابر کا شریک رکھا:۔

آئس کریم کھانے کے دوران میں اس نے پوچھا

"کہو کیا رائے ہے فلم کے بارے میں؟"

اعجاز نے جو کچھ لئیق کی زبان سے ابھی ذرا دیر پہلے سنا تھا۔ وہی دوہرا دیا۔ اس سعادت مندی سے وہ بہت خوش ہوا اس نے پوچھا:۔

"کس کمپنی کی فلمیں تم زیادہ پسند کرتے ہو؟"

اعجاز نے بڑے بھولے پن سے جواب دیا:۔

"اسی کمپنی کی جس کی یہ فلم ہے۔"

یہ جواب لئیق کو بالکل پسند نہیں آیا، کہنے لگا:۔

"بڑے بد ذوق ہو گیا" ایورگرین پکچرز" کی فلمیں تمہیں پسند نہیں آتیں؟"

اعجاز نے اس سادگی اور معصومیت کے ساتھ جواب دیا

"دیکھے بغیر کیسے رائے قائم کر سکتا ہوں؟"

لئیق کو بڑی حیرت ہوئی، اس نے پوچھا:۔

"تم نے آج تک ایورگرین کی کوئی پکچر نہیں دیکھی؟"

اعجاز نے جواب میں کہا :-

"میں نے زندگی میں آج پہلی فلم دیکھی ہے، لہٰذا جو کچھ پوچھنا ہے، اس کے بارے میں پوچھو"!

لیئیق اچھل پڑا "واقعی ——— تم نے اس سے پہلے کوئی فلم نہیں دیکھی"؟

اعجاز نے جواب دیا "قسم لے لو ——— جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے مجھے"؟

لیئیق کا یقین کرنے کو جی نہ چاہا، لیکن الفاظ کی بے ساختگی نے اسے یقین کرنے پر مجبور کر دیا

اتنے میں انٹرول ختم ہوا اور فلم پھر شروع ہو گئی

———

(۱۱)

کوئی نو بجے کے قریب یہ لوگ گھر واپس پہنچے، خلیق صاحب کوارٹر کے صحن میں خاموشی کے ساتھ ٹہل رہے تھے، لئیق کو دیکھتے ہی پوچھا،

"کہاں تھے اب تک؟ —— بے چارے اعجاز کو بھی تھکا مارا ہوگا؟"

لئیق نے جواب دیا "ابا جان انہوں نے، اعجاز نے آج تک فلم نہیں دیکھی تھی۔ شہر کی سیر کرانے کے بعد انہیں سینما لے گیا تھا!"

"تم اسے بھی خراب کرو گے —— کس سے پوچھ کر گئے تھے؟"

"امی سے پوچھ لیا تھا میں نے جاتے وقت!"

جھوٹ، —— وہ خود پریشان ہو رہی تھیں اور بار بار مجھ

سے دریافت کر رہی تھیں "

" (ہنستے ہوئے) تو وہ بھول گئی ہوں گی ——— یہ تو ان کی عاد

تھوڑی دیر تک اس طرح کی باتیں ہوتی رہیں، پھر خلیق صاحب

حکم دیا:-

"جاؤ کھانا لاؤ!"

اور اعجاز سے کہا آؤ بیٹے:

وہ اعجاز کو لیکر اسی کمرہ میں پہنچے جو اس کے لئے انہوں نے مخصو
کر دیا تھا - اعجاز یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس عرصہ میں کمرہ کی کایا پلٹ گ
تھی - ضرورت کی تمام چیزیں وہاں رکھ دی گئی تھیں - تولیہ، صابن، ج
گلاس، لوٹا، گھڑا، بستر پہلے ہی سے آراستہ کیا جا چکا تھا - ایک میز ج
موجود تھی اور اس کے ساتھ دو کرسیاں بھی -

خلیق نے کہا "اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو فوراً طلب کر لینا - د
لو سب ٹھیک ہے؟"

اعجاز نے ممنون نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا:-

"یہ آسائش تو مجھے گھر میں بھی نہیں ملتی تھی" -

پھر خلیق نے الماری کھولی اور ایف اے کا کورس لا کر سامنے ر
دیا - سب نئی کتابیں تھیں اور ان کی مالیت دو ڈھائی سو سے کسی ط

کم نہیں تھی۔

اعجاز کے دل میں رہ رہ کر یہی خیال آرہا تھا کہ نصاب کی کتابوں کا کیا ہوگا؟ خود اس کے پاس خریدنے کے لئے روپے تھے نہیں۔ خلیق سے وہ کہنا نہیں چاہتا تھا، لیکن خدا نے یہ مشکل خود ہی حل کر دی۔ خلیق نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور خود ہی لے آیا جا کر، اس نے اور زیادہ متشکر نگاہوں سے اسے دیکھا اور کہا:۔

"یہ اتنا بڑا احسان ہے جس سے میں زندگی بھر سبکدوش نہیں ہو سکوں گا۔"

خلیق نے حسبِ عادت ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ اتنے میں لیئق کھانا لے کر آ گیا۔ تینوں نے بیٹھ کر ایک ساتھ کھایا۔ پھر تھوڑی دیر بات چیت کر کے خلیق چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد اعجاز نے پوچھا

"گھر میں پٹائی تو نہیں ہوئی دیر سے آتے پر؟"

وہ ہنسنے لگا اور گویا ہوا:۔

"تم بیچ میں نہ ہوتے تو ضرور ہوتی —— بات یہ ہے کہ امی مغرب کے بعد گھر سے باہر رہنے کی قطعاً اجازت نہیں دیتیں۔ ہیشما کی بھی اگر اجازت دیتی ہیں تو دن ہی میں رات کو نہیں اور اس اصول میں اتنی

سخت ہیں کہ میں تو میں ابا جان تک کو تعمیل کرنی پڑتی ہے اس کی

اعجاز نے حیرت بھری نظروں سے اسے دیکھا اور پوچھا :۔

" یعنی وہ بھی مغرب کے بعد غیر حاضر نہیں رہ سکتے گھر سے ۔۔۔"

لئیق نے کہا " قطعاً نہیں ۔ ڈیوٹی کی بات اور ہے ورنہ انہیں بھی حاضر رہنا پڑتا ہے ۔۔۔ بھئی بات یہ ہے کہ امّی سے سب ہی ڈرتے ہیں ۔۔۔۔۔۔

" اباجان بھی ؟"

ہاں وہ بھی ۔۔۔۔۔ کیا وہ گھر کے فرد نہیں ہیں ؟"

تھوڑی دیر گپ شپ کر کے لئیق بھی چلا گیا

لئیق کے جانے کے بعد بڑی دیر تک اعجاز ان کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا جو خلیق اس کے لئے لایا تھا ۔ پھر انہیں ایک طرف احتیاط سے رکھ کر کوئی ساڑھے گیارہ بجے کے قریب سونے کے لئے بستر پر لیٹ گیا ۔

لیکن نیند کا کہیں کوسوں پتہ نہیں تھا ۔

اس کے کانوں میں اپنے اور لئیق کے الفاظ گونج رہے تھے ۔

" امّی سے سب ہی ڈرتے ہیں "

" ابّا جان بھی ؟"

"ہاں وہ بھی، —— کیا وہ گھر کے فرد نہیں ہیں؟"

اور پھر نہ جانے کیوں اسے مریم یاد آگئی جو شوہر سے اس طرح ڈرتی تھی جیسے شیر سے بکری۔ امتیاز یاد آگیا جو بیوی پر اس طرح حاوی تھا جیسے ملک الموت —— بس آج کی شب بھی سو چکے ہم

---

## حصۂ سوم

# بپتا

جو گزرتے ہیں داغؔ پر صدمے
آپ بندہ نواز کیا جانیں

(

جاز کی گمشدگی کی گھر بھر میں کسی نے پروا نہیں کی، احراز کو
ہوئی کہ ایسا نالائق اور گستاخ لڑکا جو باپ تک سے نالاں اور
تھا اور جو چوری کر کے "ننگِ خاندان" ثابت ہو چکا تھا، اچھا
رخصت ہو گیا۔ احراز اس سے کامل طور پر مایوس تھا۔ اسے
تھا، یہ اب نہیں سدھر سکتا، چچی اماں بھی بہت مسرور تھیں
گئی اور صفدر کے لئے راستہ ہموار ہو گیا اگر وہ یہاں رہتا تو
نہ تھا کہ نسیم کی شادی اس سے نہ کرنی پڑتی اور خود نسیم کا
تک تعلق تھا بے شک اس کو تھوڑا بہت ربط اور لگاؤ اس
پیدا ہو گیا تھا لیکن اب وہ ختم ہو چکا تھا۔ ایسے ہی وہ رٹیلے
اور مال و دولت کے معاملہ میں ماں پر پڑی تھی یعنی ایک پیسہ کی

چیز کو بھی ایک لاکھ روپے سے زیادہ سمجھنا، اور زیور پہ تو جان دیتی تھی اور گھڑی تو اسے بہت ہی زیادہ محبوب تھی - بھلا اپنی گھڑی کے چور کو وہ ڈاکو کیوں نہ سمجھتی - امتیاز کا نقطہ نظر اصل حقیقت معلوم ہونے کے بعد بالکل بدل چکا تھا لیکن اسے وہ اپنی ہیٹی سمجھتا تھا کہ بھائی کے سامنے بیٹے کی صفائی دے وہ اسے اپنی توہین خیال کرتا تھا کہ جس بیٹے کو غلط یا صحیح نالائق اور ناخلف سمجھ کہ اس نے گھر سے نکال دیا تھا، اسے اس وقت تک گھر میں داخل ہونے دے جب تک وہ خود آ کر قدموں پہ سر نہ رکھ دے اور اس کے بعد بھی جب تک گھر کے دوسرے ممتاز لوگ مثلاً اعزاز وغیرہ سفارش نہ کریں - لہٰذا اسے بے گناہ سمجھتے ہوئے بھی اور اس کے فراق و جدائی سے کڑھتے ہوئے بھی، نہ وہ اس کا نام زبان پہ لا سکتا تھا، نہ اس کے ذکر کو برداشت کر سکتا تھا - صرف زلیخا اس پابندی سے مستثنیٰ تھی وہ البتہ اس کے سامنے جب چاہے اعجاز کا ذکر کر سکتی تھی، اور وہ خاموشی سے سنتا رہتا تھا، کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ایک آہ سرد بھر کہ کوئی اور ذکر چھیڑ دیتا،

جب سے اعجاز گیا تھا - امتیاز کا گھر سے تعلق اور زیادہ کمزور پڑ گیا تھا - وہ دورے پر نکل جاتا تو کئی کئی دن نہ آتا، رات کو احباب

محفل میں جا بیٹھتا تو گھر اس وقت پہنچتا جب سب لوگ سو جاتے لیخا کے ساتھ اس کا طرزِ عمل اب بہت اچھا ہو گیا تھا، لیکن س سے بھی دنوں اور ہفتوں ملنے کی فرصت نہ ہوتی - مردانہ حصہ پہلے ی اس کا مستقل نشیمن تھا اور اب تو گویا گھر میں قدم نہ رکھنے کی اس نے سم کھائی تھی - زلیخا کو اگر کوئی بات پوچھنی ہوتی یا اسے زلیخا سے کوئی ت کہنی ہوتی تو وہیں مردانہ میں پردہ ہو جاتا اور وہ جا کر بات کر آتی لیکن یہ ملاقات اور گفتگو ہمیشہ نامکمل رہتی، اس لئے کہ کسی نہ کسی ملاقاتی کے آنے کی اطلاع ملتی اور جو بات کہنا یا کرنا ہوتی وہ کسی اور دن کے لئے ملتوی رہتی

اس صورت حال سے کلثوم اور نسیم نے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا اور زلیخا کو دق کرنا اور ستانا شروع کر دیا - وہ طبعاً لگائی بجھائی سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتی تھی جو ستم اس پہ ٹوٹتے رہتے برداشت کرتی رہتی - باپ سے ایک لفظ نہ کہتی اور کہتے ہوئے ڈرتے بھی تھی، کیونکہ جانتی تھی وہ بھائی اور بھاوج کے اثر میں ہیں

ایک روز وہ اپنے کمرے میں چپ چاپ اداس اور مضمحل بیٹھی تھی اور اعجاز کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ نہ جانے زندہ بھی ہے یا مر گیا کہ دبے پاؤں نادرہ آئی، اسے دیکھ کر زلیخا چونک پڑی -

اور ذرا بگڑے ہوئے لہجہ میں کہا:۔

"بس تمہاری یہ باتیں زہر لگتی ہیں مجھے، کئی مرتبہ کہا ہے چوروں کی طرح دبے پاؤں نہ آیا کرو میرے پاس"

نادرہ نے اس گرم گفتاری کا کوئی اثر نہیں لیا، سرگوشی کے لہجہ میں کہنے لگی

"تم تقریر بند کرو تو میں کچھ کہوں"

زلیخا نے غور سے جو دیکھا تو محسوس کیا کہ کوئی خاص بات ہے، اس نے پوچھا:۔

"تو اتنی تمہید کی کیا ضرورت ہے، جو کچھ کہنا ہے کہہ ڈالو، کس نے تمہاری زبان پکڑ رکھی ہے"

نادرہ نے ادھر ادھر دیکھ کر آہستہ سے کہا:۔

"آج تلاشی ہوگی، —— ہوشیار رہنا"

زلیخا نے سراپا تحیّر بن کر اسے گھورا اور سوال کیا:۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟"

وہ بولی، "ہاں بیٹا، جھوٹ نہیں کہتی، خدا تمہاری ماں کو جنت نصیب کرے، مجھے ان سے محبت تھی"

زلیخا نے الجھتے ہوئے کہا، وہ تو ٹھیک ہے نہیں ——

ں سے محبت تھی لیکن بات کیا ہے ؟

اس نے گویا کچھ سنا ہی نہیں ، اپنی ہی کہتی چلی گئی

" اعجاز کا کیا ہے ؟ وہ ٹھہرا مرد ذات ، چوری نہیں ڈاکہ ڈالے ،

ر بھی دو دکو کِھلا کر کھائے گا ، لیکن تم ؟

زلیخا نے آگے نہ کہنے دیا ۔

" میں کیا ؟

وہ بولی " تم ٹھہریں عورت ذات ـــــ اگر تمہارے دامن پر

چوری کا دھبہ لگ گیا تو زندگی بھر نہیں چھوٹ سکے گا !"

زلیخا کا بدن سنسنانے لگا ، کچھ حیرت ، کچھ غصہ ، کچھ غم ، کچھ تجسس

اس نے پوچھا :-

" تو کیا میں چور ہوں ؟ ـــــ نادرہ تم مجھے چور سمجھتی ہو ؟"

وہ بولی " نہیں جو چور سمجھے وہ کافر ، لیکن ہر کوئی نادرہ کے دماغ

سے تو نہیں سوچتا ۔"

پریشان ہو کر زلیخا بولی

" تو اور کون مجھے چور سمجھتا ہے ؟ ـــــ تمہارے چچا ،

تمہاری چچی ، تمہاری بہن نسیم سب "

غلبۂ تاثر اور وفورِ جذبات سے زلیخا کی آواز لڑکھڑانے لگی ، اس

نے سوال کیا:۔

"یہ سب لوگ مجھے چور سمجھتے ہیں نادرہ؟"

"ہاں ——— سب —"

"لیکن کیوں؟ ——— کیا ہے، کوئی چیز چوری گئی ہے"

"ہاں، ——— سونے کے بندے نسیم کے۔"

"تو ان لوگوں کا خیال ہے، میں نے چرائے ہیں؟"

"اور اتنی دیر سے کہ کیا رہی ہوں۔ سمجھ ہی میں نہیں آ چکتا کس طرح اور کیوں کر کہوں؟"

"یہ لوگ تلاشی لیں گے میرے کمرے کی؟ میری؟"

"ہاں، ———"

"آنے دو ——— دیکھتی ہوں، کون تلاشی لیتا ہے؟"

"اس طرح تو تم الزام اوڑھ لو گی اپنے اوپر!"

"وہ کیسے ——— ؟"

"پھر بات میاں (امتیاز) تک پہنچے گی۔ پھر ان کے سامنے تلاشی لی جائے گی اور بندے ضرور برآمد ہو جائیں گے یہاں سے دیکھ لینا"

"کس طرح برآمد ہو جائیں گے؟ کیا ان کے پاؤں ہیں کہ چل کر یہاں آ جائیں گے؟"

"ایسا ہی سمجھ لو، وہ تو بہر حال آ چکے۔"

"تو کہاں ہیں؟"

"تمہارے کپڑوں کے بکس میں۔ کسی قمیص کی جیب میں، کسی جوڑے کی تہ میں، کسی کپڑے کے نیچے"!

"اتنی جگہوں پر؟"

"نہیں ــــ ان میں سے کسی ایک جگہ!"

"لیکن یہ سب کچھ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"میں نے اپنے کانوں سے سازش کی یہ پوری اسکیم سنی ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے۔ ان بندوں کو اس (اشارہ کرتے ہوئے) کالے بکس میں رکھتے ہوئے دیکھا ہے؟"

زلیخا کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ اس نے سوچا، یہ تو غضب ہو گیا، اگر واقعی بُندے میرے کمرے سے اور میرے بکس کے اندر سے نکل آئے تو قیامت آ جائے گی۔ بات ابا جی تک پہنچے گی، بھیا کے بارے میں تو انھوں نے مان لیا کہ مذاق تھا لیکن جب چوری ہو اور مال مسروقہ ہم بھائی بہن کے پاس سے برآمد ہو تو ان کی رائے ہی بدل جائے گی۔ وہ بھیا سے بھی اور زیادہ نالاں ہو جائیں گے، اور میری صورت دیکھنا بھی زندگی بھر گوارا نہیں کریں گے۔ ممکن ہے مجھے بھی بھیا کی طرح

نکال دیں گھر سے - پھر میں کہاں جاؤں گی - وہ تو ٹھہرے مرد آدمی ا
منہ اٹھایا، جہاں سینگ سمایا چل دیئے - میں کہاں جا سکتی ہوں ا
کہاں پناہ ملے گی ؟ میں تو اکیلی سعادت گنج تک بھی نہیں جا سکتی
گرتی پڑتی چلی بھی جاؤں تو ہماری خالہ خود اپنی مصیبت میں گرفتار ہیں
مجھے کہاں سے کھلائیں گی ؟ میرا بوجھ کس طرح اٹھا سکیں گی ——

ہائے ابا جی کا غصہ، پھر وہ ہوش میں کہاں رہتے ہیں جو کچھ بھی نہ کر گزر
دہی کم ہے - کتنی اللہ آمین کے بعد تو ذرا ٹھیک ہوتے ہیں - ٹھیک
باتیں کرنے لگے ہیں - اب اگر ایسا ہوا تو مرتے مر جائیں گے ا
خوش نہیں ہونے کے، یا اللہ یہ نئی مصیبت کیسی آ کھڑی ہوئی میرے
سر پر ؟

میں کیا کروں ؟
کیا کروں یا اللہ ؟

---

(۲)

دفعتہً زلیخا اپنی جگہ سے اٹھی ، اس نے وہ سیاہ رنگ کا بکس کھولا جس میں اس کے کپڑے رکھے رہتے تھے ، ایک ایک چیز اٹھا کر دیکھنا شروع کی ۔ اور واقعی فیروزی رنگ کی شلوار کی تہہ میں دونوں بُندے جگمگا رہے تھے !

اس نے جلدی سے ان بندوں کو اٹھایا ۔ بکس بند کیا اور نادرہ کے پاس آکر کھڑی ہو گئی ——— بُندے اس کے ہاتھ میں تھے ۔

نادرہ نے مسکراتے ہوئے کہا : ۔

" دیکھا ؛ میں نہ کہتی تھی ——— میں نے خود اپنی آنکھوں

سے اس دروازے کی درازیں سے جھانک کر نسیم کو دیکھتے ہوئے دیکھا
زلیخا نے کہا :- "لیکن وہ تو میرے کمرے میں بہت دنوں سے
آئی - جس دن سے بھتیا گئے ہیں - اس نے قدم تک نہیں رکھا"
"نہیں رکھا تو یہ آ کہاں سے گئے ؟"
"یہی تو سوچ سوچ کر میں خود حیران ہو رہی ہوں ۔"
"کل تم شہر گئی تھیں ؟"
"ہاں ——— پھر ؟"
"اسی وقت یہ کارروائی ہوئی تھی ؟"
"(ڈرتے ہوئے) یا اللہ میری مصیبتوں کے دن ختم ہونگے بھی
——— اب میں کیا کروں - اگر وہ لوگ آگئے تو کیا جواب دوں
گی میں ؟
"ابھی نہیں آئیں گے ؟ ———
وہ اس وقت آئیں گے جب کھانے کے وقت میاں (انتیاز)
چکے ہوں گے یا آنے والے ہوں گے تاکہ مجرم ان کے سامنے پیش
کیا جاسکے اور اسے حسب دلخواہ سزا دلوائی جائے اور ان کے آنے
میں ابھی ایک گھنٹہ کی دیر ہے ؟
"اچھا تو ان بندوں کا کیا کروں ——— پھینک

جاکر باہر ؟"

"کہیں اب ایسا غضب بھی نہ کرنا ! ہر آن کمرہ تمہاری نگرانی کر رہی ہے۔"

"پھر ؟ —— پھر آخر کیا کروں ؟"

"مجھے دے دو !"

"تمہیں دے دوں ؟ — تم کیا کرو گی ؟

"میں وہ کروں گی کہ مزا آجائے گا !" —— جانتی ہو کیا کرو گی ؟"

"میں کیا جانوں ؟ سوچا ہوگا کچھ تم نے ؟"

"ہاں میں نے سوچ لیا ہے —— جس وقت نسیم اپنی امی جان کے ساتھ یہاں تلاشی لینے آئے گی اور جب تلاشی لے چکے گی تو میں آکر یہ پیش کر دوں گی کہوں گی یہ تو آپ کے تکیہ کے نیچے رکھے ہوئے تھے ابھی جب میں بستر صاف کرنے گئی تو وہاں ملے۔ تم وہاں جاتی نہیں، لہذا یہ گمان کیا نہیں جا سکتا کہ یہ حرکت تمہاری ہے --- گھڑوں پانی نہ پڑ جائے۔ ہاں بیٹی پر تو، میرا ذمہ !"

کچھ سوچتے ہوئے رنجنا نے بندے نادرہ کو دے دیئے اور اس طرح کھڑے کھڑے رونے لگی۔

نادرہ نے پیار اور محبت کی نظر سے اسے دیکھا اور پوچھا:۔

"ارے! ——— یہ رونے کا کیا موقع ہے؟"

وہ بولی "خدا اب مجھے موت بھی نہیں دے دیتا کہ اس آئے دن کی [illegible]

اور روسیاہی سے نجات ملے؟

نادرہ نے بڑھ کر اس کے آنسو پونچھے اور کہا:۔

"یہ نہ کہو، ان باتوں سے اللہ میاں خفا ہو جاتے ہیں۔"

زلیخا نے اس طرح جیسے وہ اللہ میاں سے مخاطب ہے، بولی [illegible]

"تو آخر کب تک یہ روسیاہی برداشت کرتی رہوں؟"

وہ بولی، ان آزمائشوں سے بھٹی سے سونے کی طرح تپ کر نکل [illegible]

ہراساں کیوں ہوتی ہو؟ ——— خدا پہ بھروسہ رکھو، جو ا[illegible]

بھروسہ رکھتا ہے، اسے وہ کبھی مایوس اور نا امید نہیں کرتا۔"

"لیکن ان باتوں کا مقصد کیا ہے آخر؟"

"وہ تو بڑا دلچسپ ہے تم نہیں جانتیں؟"

"بالکل نہیں جانتی، مجھے کیا معلوم؟"

"تمہارے باپ اور چچا دونوں کی مرضی یہ تھی کہ اعجاز [illegible]

شادی نسیم سے کی جائے، لیکن بی بی (کلثوم) اپنے بھتیجے صفد[illegible]

سے بیاہنا چاہتی ہیں اسے۔"

"بیاہ دیں، یہاں کون مرا جارہا ہے نسیم کے لئے!

"سنو تو! ——— اصل بات تو آگے آتی ہے؟"

"سن رہی ہوں، کہے جاؤ"

صفدر کا ایک بھائی ہے منور ———

"وہی کانا، جس کا سارا بدن سفید ہے؟"

"ہاں وہی، جانتی تو ہو اسے!"

"اچھا پھر؟ تو منور؟"

"اسکیم یہ ہے کہ جب تمہاری چوری پکڑی جائے اور میاں دانتیانا تمہارا خون چوسنے پر تیار ہو جائیں تو ان سے سفارش کر کے تمہاری جان بخشی کرالی جائے، اور منور کا پیغام تمہارے لئے دیا جائے کہ ایسی لڑکی کا کہیں غیر جگہ جانا ٹھیک نہیں، خاندان کے نام کو بٹہ لگائے گی۔ منور بہرحال ایک آدمی ہے، گزارہ کرلے گا اور یہ منور میاں وہ ہیں جنہیں بیوی جڑتی نہیں، کس کی لڑکی ایسی بھاروہے کہ وہ اٹھا کر ان کے حوالے کردے گا ——— اور اس میں صرف یہی عیب تو نہیں کہ وہ کانا ہے اور اس کا بدن سفید ہے، اور بھی ہزاروں عیب ہیں، جواری، شرابی، نہ جانے کیا کیا، میاں انجانہ سے نفرت کرتے ہی ہیں۔ تم سے بھی کرنے لگیں گے، اور بڑی آسانی سے اس کے لئے

تیار ہو جائیں گے کہ تمہیں منور کو بیاہ دیں —— پھر یہ کو[illegible]
جائیگی کہ وہ منور کو خانہ داماد بنا لیں - یہ ہے ساری اسکیم، ا[illegible]
لیے چور بنائی جا رہی ہو تم"!

زلیخا پھر رونے لگی، اس نے کہا:-

" اور پھر تم کہتی ہو کہ میں اپنے تئیں نہ کوسوں؟ نادرہ خدا کی
قسم میں زہر کھا لوں گی - چھت سے کود پڑوں گی، جان دے دوں گی
مگر ان لوگوں کی یہ اسکیم، ہرگز کامیاب نہیں ہونے دوں گی"!

" تم کیا کر سکتی ہو؟ بندہ کیا چیز ہے، یوں کہو خدا دشمنوں
کے منہ میں کالک لگائے گا"؟

" زلیخا نے دونوں ہاتھ دعا کے لئے اٹھاتے ہوئے کہا:-

" آمین ——

نادرہ ہنسنے لگی اور گویا ہوئی:-

بہت بدحواس ہو گئیں، اس اسکیم کا ماجرا سن کر؟

" زلیخا کی آنکھوں میں پھر آنسو بھر آئے، لیکن زبان سے اس نے
کچھ نہ کہا، نادرہ نے پھر اپنے دوپٹہ سے اس کے آنسو پونچھے، اور
کہنے لگی -

" خدا پر بھروسہ رکھو، ناامید نہ ہو"!

پھر وہ بولی " اچھا میں جاتی ہوں ——— تم امتحان کے لیے تیار ہو جاؤ ۔ اور دیکھو میری ایک بات گرہ میں باندھ لو ، ہرگز کوئی ایسی بات نہ کرنا جس سے انہیں یہ شبہ ہو کہ اس سازش کا تمہیں علم ہے ، نہ غصہ اور خفگی کا اظہار کرنا ، بلکہ دل ہی دل میں ہنستی رہنا لطف لیتی رہنا ! ——— کرو گی ایسا ؟

زلیخا نے گردن کے اشارے سے اقرار کیا ، نادرہ جس طرح دبے پاؤں آئی تھی ، اسی طرح واپس چلی گئی ۔

---

Nafrat

Nafrat
Nafrat

(۳)

اور واقعی دوپہر کو امتحان کی وہ گھڑی آگئی جس کی بشارت نادرہ دے گئی تھی ۔

سب سے پہلے کلثوم بیگم وارد ہوئیں ۔ یہ خلاف معمول بات تھی ۔ بھلا وہ اس غم کدہ میں کہاں قدم رکھتی تھیں ؛ لیکن زلیخا نے سروقد کھڑے ہو کر خیر مقدم کا فریضہ انجام دیا ۔ کلثوم کے چہرے سے خشونت اور درشتی ہویدا تھی ۔ زلیخا نے کہا :-

" آیئے چچی اماں تشریف رکھیئے "

وہ اس کے بستر پر رونق افروز ہوتی ہوئی بولیں ۔

" بیٹھوں کیا بیٹی ، یہاں تو زندگی اجیرن ہو گئی ہے ——

—— ارے بھونڈو ، !

بھوندو فوراً آ موجود ہوا ۔ کلثوم نے کہا :۔

" جا باہر دیکھو صاحب بڑے صاحب اور چھوٹے صاحب آئے یا نہیں، کھانے کا وقت ہو گیا اور اب تک ——

بھوندو جا چکا تھا !

کلثوم نے اب زلیخا کو مخاطب کیا ۔

ایسا معلوم ہوتا ہے چور نے گھر دیکھ لیا ہے !

زلیخا نے بڑی سادگی سے سوال کیا

" لیکن بچی اماں ہوا کیا —— کوئی چیز چوری ہو گئی کیا" ؟

وہ بولیں :۔ " ہاں —— پہلے نگوڑ ماری گھڑی کی باری آئی وہ اللہ اللہ کر کے ٹلی تو اب بندوں کی باری آئی —— یہ تو گھڑی سے کئی گنا زیادہ قیمتی ہیں" !

زلیخا اب واقعی لطف لینے لگی تھی ، پوچھا :۔

ارے —— نہیں چوری ہو گئے ؟

وہ کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورتی ہوئی بولیں :۔

" ہاں —— کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں ! —— خدا غارت کرے ان چوروں کو ، کوڑھ ٹپکے ان کے ہاتھوں پر ، میری بچی کے بندے چرا کر ۔ ایک پل بھی چین نہ پائیں ، لیکن میں بھی پولیس افسر کی

بیوی ہوں، نہ ڈھونڈھ نکالوں تو میرا نام کلثوم نہیں۔"
طنز و تعریض سے بھری ہوئی ان باتوں سے زلیخا ذرا بھی متاثر نہیں ہوئی، البتہ بڑے ہمدردانہ لہجہ میں وہ گویا ہوئی
"لیکن چچی اماں یہ بندے گئے کس طرح؟"
انہوں نے فوراً تیر پھینکا، فرمایا:-
"جس طرح گھڑی گئی تھی۔"
زلیخا کا چہرہ فق ہو گیا، سٹ پٹا گئی، کچھ جواب نہ دے سکی۔ اتنے میں خراماں خراماں نسیم آئی۔ زلیخا نے اس سے بھی ہمدردانہ لہجہ میں کہا:-
"سنا ہے تمہارے بندے چوری ہو گئے ہیں؟"
بے پروائی سے اس نے جواب دیا۔
ہاں — لیکن مل جائیں گے۔ اماں نے بڑا زبردست عمل کیا ہے۔ اور ان کا عمل کبھی خالی نہیں جاتا۔ گھڑی والی دفعہ میں تو قائل ہو گئی۔
بار بار گھڑی کا ذکر سن کر زلیخا کو غصہ تو بہت آیا، آخر امتیاز کی بیٹی اور اعجاز کی بہن تھی، لیکن نادرہ کی نصیحت یاد آ گئی لہذا ضبط سے کام لیا اور خاموش رہی۔ اینٹ کا جواب پتھر سے

نہیں دیا۔

اتنے میں نسیم نے بچوں کی طرح مچلتے ہوئے کہا :-

"اماں آج میں سینما دیکھنے ضرور جاؤں گی"

وہ بولیں "خدا تمہیں سلامت رکھے، ضرور جاؤ"

"اور وہ میری شلوار؟"

"شلوار کیسی؟"

میں نے کہا نہیں تھا کہ فیروزی رنگ کی ایک شلوار بنا دیجئے، مجھے یہ رنگ بہت پسند ہے!"

ہاں بیٹی کہا تو تھا، لیکن مجھے یاد نہیں رہا!" ——————

بنوا دوں گی"

"تو پھر میں سینما کیسے جاؤں؟"

"یہ کیوں؟ وہاں جانے کو کس نے منع کیا ہے؟"

لیکن میں تو وہی شلوار پہن کر جاؤں گی!"

اتنے میں بھوندو حاضر ہوا۔ کلثوم نے بیتابی اور بیقراری کے ساتھ اس کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھا کہ کیا خبر لایا ہے؟ اس نے کہا :-

"بڑے صاحب (انتیاز) تو آگئے ہیں۔ چھوٹے صاحب

ابھی نہیں آئے

یہ سن کر کلثوم اور نسیم کے چہرے پر رونق آگئی، زلیخا اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کھانا نکال دوں تو ڈسے آ جا کر"

نسیم نے اسے روکا کہنے لگی،

"کھانا ذرا دیر کے بعد نکال دینا۔ ہمارا کام کرتی جاؤ"

زلیخا جاتے جاتے ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی، اس نے پوچھا:۔

کون سا کام تمہارا؟ ـــ بتاؤ؟ ـــ

وہ بولی "مجھے یاد پڑتا ہے، تمہارے پاس ایک فیروزی رنگ کی شلوار ہے؟"

زلیخا نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا

"ہاں ہے تو"

وہ بولی "تو نکال دو، اماں تو اسی طرح بولتی رہیں گی، نہ جانے کب بنائیں، تمہاری ہی پہن لوں گی۔"

زلیخا نے جواب دیا، لے لو، لیکن تنگ تو نہ ہو گی، آ جائے گی؟"

کلثوم بیگم درشتی کے ساتھ گویا ہوئیں

"اے ہے تم کون سی ایسی دبلی ہو اور وہ کون سی ایسی موٹی ہے آ کیوں نہ جائے گی؟"

زلیخا بولی، "تو میں کب منع کرتی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ سیاہ بکس کی طرف بڑھی، نسیم بھی ساتھ ساتھ آئی، اس نے بیٹھ کر بکس کھولا، نسیم بھی اس کے پاس بیٹھ گئی وہ اپنے کپڑے ایک ایک کر کے نکالنے لگی، نسیم غور سے بیٹھی دیکھتی رہی، اتنے میں فیروزی رنگ کی شلوار کی باری آ گئی۔ نسیم نے بے ساختہ کہا:

ہاں یہ

زلیخا نے شلوار نکال کر اس کے ہاتھ پہ رکھ دی اور کہا:

"لے لو ——— پہن جاؤ۔"

نسیم نے شلوار کی تہہ بگاڑ کر ایک مرتبہ اسے جھٹکا۔ پھر مایوسی کے عالم میں ماں کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے کی رونق بھی حیرت اور بے کلی سے بدل گئی۔ جھپک کر اٹھیں اور شلوار نسیم کے ہاتھ سے لے لی:

"یہ ہے ——— ؟"

نسیم نے کہا "ہاں امّی یہی ہے —— بالکل یہی۔"

کلثوم نے بھی ایک مرتبہ خوب زور سے اسے جھٹکا کہ شاید گوہر مقصود اب گرے اور اب گرے۔ مگر وہاں تھا کیا جو گرتا؟ دونوں نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا:۔

اتنے میں نادرہ دوڑتی ہوئی آئی، اس کی ہتھیلی پہ دونوں بُندے رکھے ہوئے تھے، وہ نسیم سے مخاطب ہوئی

"بیٹا یہ رہے بُندے ——

کلثوم نے سراپا برق و آتش بن کر پوچھا:۔

"ماں زادی کہاں سے ملے تجھے؟"

وہ بولی۔ بیٹیا کے تکیہ کے نیچے رکھے تھے۔"

کلثوم نے وہ شلوار وہیں زمین پہ پٹخ دی اور بُندے لے کر تیزی سے نکلی ہوئی چلی گئیں —— ان کے پیچھے پیچھے نسیم بھی

---

نیف اسٹیشنری اینڈ جنرل اسٹور
دکان نمبر ۸۹۷ رحمانیہ مسجد لیاقت آباد کراچی

(۱۴)

طوفان گزر گیا !

لیکن زلیخا کے دل میں ایک طوفان برپا ہو گیا - اس کی آنکھوں میں طوفان اشک امڈ آیا - جب تک کلثوم بیگم چوری کا ذکر فرماتی رہیں - اور جب تک نسیم شلوار کے سلسلے میں اس کا جائزہ لیتی رہی وہ لطف لیتی رہی - جب لوگ چلے گئے تو وہ سوچنے پر مجبور ہو گئی ——

آخر یہ کیا ہو رہا ہے ؟

اس گھر میں میری حیثیت کیا ہے ؟

کیا اباجی نے اس لئے شادی کی تھی کہ ایک لڑکے اور لڑکی کے باپ بن جائیں - بیوی کو کڑھا کڑھا کر اور جلا جلا کر مار ڈالیں - لڑکے کو

گھر سے نکال دیں ۔ اس کی بے گناہی کا یقین رکھتے ہوئے بھی ۔ اسے واپس بلانے پر آمادہ نہ ہوں اور لڑکی کو بھیڑیوں کے آگے ڈال دیں ۔ خود سارا وقت یار باشیوں اور مجلس آرائیوں میں صرف کر دیں ۔ یا باہر بیٹھے دوست احباب کے ساتھ گپ شپ کرتے رہیں ۔ دورے پر جاتے رہیں اور ان کی لڑکی گھر میں چورنی بیٹھی رہے ، آئے دن نت نئے الزامات اس پر عاید کئے جایا کریں ۔ اسے ذلیل کیا جایا کرے اس کے مستقبل کو برباد کرنے کی اسکیمیں بنائی جایا کریں اور وہ کچھ نہ کر سکے ، سوا اشک حسرت بہانے کے ، سوا دل ہی دل میں آہ کرنے کے !

کیا زندگی اس طور سے بسر ہو سکتی ہے ؟

آج جب یہ سب کچھ ہو رہا ہے تو کل کیا کچھ نہ ہوگا ؟ کیا میرا وجود ایک کانٹا ہے جسے یہ لوگ راستے سے ہٹا دینا چاہتے ہیں ، اور اس کے بعد اس کی ہر چیز پر قبضہ کر لینا چاہتے ہیں ۔

اور یہ منور ؟

یہ کیا بلا ہے ؟ ——— کیوں اسے میرا مالک نہ مختار بنانے کی تدبیریں کی جا رہی ہیں ؟ کیا میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے ؟ میری حیثیت اس مشت خاک کی ہے ، جسے ہوا کے جھکڑ ادھر سے

ادھر اور ادھر سے ادھر اُڑائے پھرتے ہیں؟ کیا ہیں وہ سنگریزے ہوں جو صرف اس لئے ہے کہ پامال ہو؟ ٹھوکریں کھائے؟

میرا اپنا وجود کچھ نہیں؟ میری اپنی ہستی کچھ نہیں؟ میں خود کچھ نہیں؟

بھائی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یہ گھر چھڑوا دینے کے بعد بھی ان لوگوں کو قرار نہیں آیا۔ اب یہ میرے درپے آزار ہیں۔ چاہتے ہیں مجھے فنا کے گھاٹ اتار دیں

اور میرا باپ؟

وہ ایک غیر جانبدار تماشائی کی حیثیت سے یہ ناٹک دیکھ رہا ہے۔ اگر خدا نے نادرہ کو میری دستگیری پر آمادہ نہ کر دیا ہوتا۔ تو آج میری قسمت کا فیصلہ تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہو گیا تھا۔ پہلے میرے منہ میں سیاہی لگتی۔ پھر مجھے ذلیل کیا جاتا اور اس کے بعد مجھے منور کے حوالہ کر دیا جاتا!

آج اگر اماں زندہ ہوتیں تو یہ ہو سکتا تھا؟

بے شک ابّا کی نظر میں ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ یہ بھی سچ ہے کہ ابّا کے سامنے انہیں مجال دم زدن بھی نہ تھی، اور یہ بھی واقعہ ہے کہ ان کے ہر فیصلہ کو وہ بے چون و چرا تسلیم کر لیتی تھیں

لیکن اگر ان کے سامنے بھیا کو گھر سے نکالا جاتا تو کیا وہ گوارا کر لیتیں؟ کیا وہ بھی ان کے ساتھ ہی اس گھر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ کر رخصت نہ ہو چکی ہوتیں؟

کیا ان کی زندگی میں بھی مجھے اسطرح ذلیل کیا جا سکتا تھا؟ مجھ پر چوری کی تہمت لگائی جا سکتی تھی۔ میری تلاشی لی جا سکتی تھی بے...

اور

اور مجھے منور کی باندی بنا دینے کا، ایک بدصورت جواری اور شرابی کی باندی بنا دینے کا فیصلہ کیا جا سکتا تھا؟ کیا وہ ان لوگوں کا خون نہ چوس لیتیں؟

لیکن اب کیا ہوگا؟

اگر ان لوگوں کا واقعی یہی پروگرام ہے تو کسی نہ کسی طور پر، کسی نہ کسی بہانے سے یہ اباجی کو راضی کر ہی لیں گے۔ خود اباجی کئی مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ اب زلیخا سیانی ہو چکی ہے، اس کا کوئی بندوبست کرنا چاہیئے۔

اگر ان لوگوں نے اباجی کو راضی کر لیا تو کیا ہوگا؟

کاش اس وقت بھیّا ہوتے، وہ کسی قیمت پر بھی ان گھناؤنی چالوں کو کامیاب نہ ہونے دیتے۔

لیکن نہ جانے وہ کہاں ہیں ؟ میں لاکھ لاکھ چیخوں چلاؤں، فریاد کروں - مگر ان تک میری آواز نہیں پہنچ سکتی - میں روتے روتے جل تھل کر دوں - مگر ان کی آنکھیں میری چشم نمناک کو نہیں دیکھ سکتیں - اس دھڑکے میں میری جان چلی جائے - مگر انہیں خبر بھی نہ ہو گی کہ زلیخا پر کیا بنی ؟ اس کا کیا حشر ہوا -

اگر میں لڑکا ہوتی تو ان باتوں کی ذرا پروا نہ کرتی - میں بھی بھیا کی طرح بیک بینی و دو گوش کسی دن چپ چپاتے یہاں سے سدھار جاتی اور کسی کو خبر بھی نہ دیتی ، لیکن میں تو لڑکی ہوں ، عورت ذات ہوں - میں کس طرح گھر سے باہر قدم نکال سکتی ہوں ؟ میں کس طرح در در کی ٹھوکریں کھا سکتی ہوں -

پھر کیا ہو گا ؟

یا اللہ تو ہی میری دستگیری کر -

کیا ابا جی کو یہ سارا واقعہ بتا دوں جا کر ؟

کیا وہ سن لیں گے ؟ —— مان لیں گے ؟

اور پھر بے چاری نادرہ کا کیا حشر ہو گا ؟ اس نے تو اپنی عزت آبرو اور نوکری کو خطرے میں ڈال کر اتنا بڑا کام کیا ہے ، کیا اس بے گناہ کو بھی پھنسوا دوں ؟

اسی حیص بیص میں وہ بیٹھی تھی کہ مسکراتی ہوئی نادرہ آگئی اور کہنے لگی

"اب مسکوٹ ہو رہی ہے۔ ماں بیٹی میں؟"

زلیخا نے آنسو بھری ہوئی آنکھوں سے نادرہ کو دیکھا، اور ٹھنڈی سانس لے کر بولی:-

"نادرہ تم کب تک مجھے بچاؤ گی۔ آخر ایک ہی گھر ہے اور اقتدار اختیار انہی کے ہاتھ میں ہے۔ آج تم نے اتفاق سے سب کچھ سن لیا۔ دیکھ لیا اور ان کی تدبیر ناکام بنادی، لیکن کل وہ کچھ اور سوچ لیں گے اور اس پر عمل بھی کر گزریں گے سیدھی بات ہے کہ بکری کی ماں کب تک خیر منائے گی"۔

نادرہ توجہ سے زلیخا کی باتیں سنتی رہی، پھر گویا ہوئی:-

"تم تو خواہ مخواہ پریشانی میں مبتلا ہو ——"

زلیخا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا:-

"خواہ مخواہ کی پریشانی ——"

وہ بولی، "ہاں اور کیا —— اتنا بڑا داؤں ان کا ناکام ہوا ہے کہ چکرا گئے ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا یہ کیا ہو گیا۔ ماں لڑکی کو دوش دے رہی ہے۔ اور لڑکی ماں کو۔ دونوں میں بڑے زور

کی لڑائی ہو رہی ہے ۔ مجھے تو مزا آگیا، اللہ قسم، اس وقت ان لوگوں کی باتیں سن کر۔

وہ بولی "تمہیں مزہ آگیا لیکن میری تو جان پر بن گئی ۔"

وہ کہنے لگی " جان پر بنانے کی کوئی ضرورت نہیں ۔ اب انشاءاللہ عرصہ تک یہ لوگ اس طرح کی کوئی بات چیت کرتے ہوئے ہچکچائیں گے ۔ اور میں نے بھی تو یہ سوچ ہی لیا ہے !

زلیخا نے پوچھا کیا سوچا ہے تو نے؟

" وہ بولی، چاہے جوتے پڑیں یا چٹیا تونڈی جائے ، ملازمت رہے یا جائے ۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے ۔ موقعہ دیکھ کر میاں کو سب کچھ بتا دوں گی، اور ان سے صاف صاف بات کر کے رہوں گی ۔

(۵)

نادرہ کی باتوں سے کسی حد تک زلیخا کے دل کا بوجھ اترا، وہ
سوچنے لگی، اس کی وفاداری اور خدمت گزاری کے اباجی بھی قائل ہیں
اس نے اگر اپنے طور پر سارا کچا چٹھا سنا دیا تو وہ ضرور متاثر ہوں گے
کیونکہ اماں کے انتقال اور بھیا کے جانے کے بعد سے ان کی روش پر
بہرحال تبدیلی آچکی ہے، بہت ممکن ہے وہ کوئی ایسا قدم اٹھائیں جو
ہمیشہ کے لئے ان جھگڑوں کا خاتمہ کر دے اور یہ سوچتے سوچتے اس کا ذ
نہ جانے کیوں ارشاد کی طرف منتقل ہو گیا اور مسرت، انبساط اور ر
کی ایک کون سی اس کے تاریک خانۂ قلب میں پھوٹنے لگی۔

ارشاد ——

یہ اس کی بیوہ خالہ کا جو سعادت گنج میں رہتی تھیں لڑکا تھا

ارشاد کے تصور نے ذرا دیر کے لئے اسے دوسری دنیا میں پہنچا دیا۔

یہ بڑا تیز، بڑا ہونہار، بڑا سعادت مند اور خوش اطوار لڑکا تھا مریم اسے بہت ہی زیادہ چاہتی تھی اور زلیخا کو یاد آیا کہ ایک مرتبہ جب اس کی کسی بات پر خوش ہو کر شاباش دے رہی تھی اور پیار سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیر رہی تھی، نورالعبہ نے کہا تھا۔

"آپا اگر ارشاد کو سچ مچ اتنا چاہتی ہو تو اسے باقاعدہ اپنا بیٹا کیوں نہیں بنا لیتیں؟ ارشاد تمہارا زلیخا ہماری، بولو یہ سودا منظور ہے؟

اور مریم جس کے ہونٹ تبسم سے نا آشنا ہی رہے تھے، بے ساختہ مسکرا پڑی تھی اور محبت بھری نظروں سے ارشاد کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی:۔

"ہاں منظور ہے ——

اور پھر ارشاد سے کہنے لگی

"کیوں لے امیرا لڑکا بن کر میرے پاس رہے گا؟"

اور ارشاد نے جواب دیا تھا

میرا تو آپ ہی کے پاس جی لگتا ہے۔ اماں کے پاس ذرا بھی نہیں

لگتا ہے، انہیں سعادت گنج بھیج دیجئے۔ میں اب نہیں جاتا،
اور پھر دونوں بہنیں کھلکھلا کر ہنس پڑی تھیں اور رابعہ...
تھا۔

"کیوں ارے بے مروت؟ ہمیں چھوڑ دے گا؟"

ارشاد نے جواب دیا، "مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا۔ ویسے...
سے بحث کرنا میری عادت نہیں ہے۔"

دونوں بہنیں کھلکھلا پڑیں۔ مریم نے کہا:۔

"دیکھا رابعہ میرے بچہ کو؟"

وہ بہ ظاہر چڑتی ہوئی بولی،

مجھے کیا پڑی ہے تمہارے لڑکے کو دیکھنے کی۔ میں تو اپنی بچی زلیخا
کو دیکھ رہی ہوں۔ کیسی ماشاءاللہ چاند سی شکل پائی ہے!"

مریم نے کہا:۔ "اب لگا دو نظر اسے ——— وہ تو خاصی
بدصورت ہے!

اور زلیخا چڑ گئی تھی۔ کہنے لگی:۔

"وہ کیوں ہوتی بدصورت ———

اور پھر، دوسرے دن موقعہ پا کر ارشاد نے زلیخا سے کہا تھا:۔
"کیوں جی اگر ہم خالہ جان کے پاس رہ جائیں تو برا تو لگے گا تمہیں

اور زلیخا نے جواب دیا تھا :-

"مجھے کیوں برا لگنے لگا؟ میں خود خالہ کے ساتھ سعادت گنج جا رہی ہوں"

اور ارشاد مچل گیا تھا، اس نے کہا تھا۔

"واہ تم کیسے جا سکتی ہو؟"

اور زلیخا نے پوچھا تھا "کیوں نہیں جا سکتی؟"

اور پھر بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گیا تھا

"پھر میں یہاں رہ کر کیا کروں گا؟ ——— میرا یہاں اتنا جی جو لگتا ہے وہ تمہاری ہی وجہ سے تو ہے؟"

اور وہ پوچھ بیٹھی تھی "کیوں میری وجہ سے کیوں؟"

اور اس نے جواب دیا تھا "اماں سچ ہی تو کہہ رہی تھیں۔ ان کی بھانجی نے بالکل چاند کی سی شکل پائی ہے، اور وہ باتیں بھی کیسی من موہنی کرتی ہے۔ اس کی ہر بات اچھی لگتی ہے۔ بس یہی جی چاہتا ہے اس کے پاس بیٹھے رہو۔ اسے ہنستا دیکھتے، اسے کام کرتا دیکھتے رہو۔ جب سو جاؤ تو خواب میں بھی اس کو دیکھتے رہو ———"

---

اور اس خواب والی بات پر بے ساختہ وہ ہنس پڑی تھی،

اور شرما کر بھاگ کھڑی ہوتی تھی۔ نہ جانے کیوں اس کے سامنے ٹھہرنے
اور اس سے بات کرتے اور اب وہ جھجک سی محسوس کر رہی تھی!
اس واقعہ کے بعد کئی دن تک ارشاد اس گھر میں رہا۔ مگر
وہ اس کے سامنے نہ پڑی۔ یعنی اس نے کوئی ایسا موقع نہ آنے
دیا کہ وہ بات چیت کر سکتا۔ لیکن ایک روز یہ موقع مل ہی گیا
وہ اعجاز کا کمرہ صاف کر رہی تھی اور اعجاز اسکول گیا ہوا تھا،
اتنے میں کچھ آہٹ سی ہوئی۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو دروازے
پر ارشاد کھڑا تھا۔ وہ کام کرتے کرتے رک کر ویسے ہی کھڑے کھڑے
اسے تکنے لگی۔ آج ارشاد کے چہرے پر شوخی اور شرارت اور زندہ دلی
نہیں تھی۔ وہ کچھ کھویا کھویا سا تھا، کچھ سنجیدہ سا، کچھ متفکر سا،
اس نے کہا:۔

"زلیخا ایک بات بتاؤ گی؟ —— بس تمہارا جواب سنتے
ہی چلا جاؤں گا!"

زلیخا کا دل دھڑکنے لگا، اس نے جواب دیا:۔

"وہ کون سی بات ہے جو آپ خاص طور پر یہاں پوچھنے آئے ہیں
ہے زلیخا۔"

"اچھا تو پوچھئے!"

کیا تم مجھ سے خفا ہو؟ کیا اس دن کی میری باتوں سے تم روٹھ گئیں۔ کیا میں نے تمہارے احساسات کو صدمہ پہنچایا ——

"اگر یہ بات ہے تو کہہ دو۔ میں آج بلکہ ابھی سعادت گنج چلا جاؤں گا۔ میں کسی قیمت پر بھی تمہیں رنجیدہ اور اپنے سے خفا نہیں دیکھنا چاہتا۔"

زلیخا نے نگاہ اوپر اٹھائی تو ارشاد پر کچھ عجیب سا عالم طاری تھا اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں، یہ حالت دیکھ کر خود اس کا دل بھی ڈوبنے لگا، اس نے چاہا کہ اسکے زخم پر پھاہا رکھ دے وہ مسکرانے لگی، اس نے پوچھا:-

"یہ بات آپنے کیوں سوچی؟"

"کیا غلط سوچی ہے"

"ہاں بالکل غلط۔"

"کیا تم خفا نہیں ہو؟"

"بالکل نہیں —— اور ہو بھی کیسے سکتی ہوں، اتنے اچھے تو آدمی ہیں آپ، میرا خود ہر وقت دل چاہا کرتا ہے کہ آپ کی دلچسپ باتیں سنا کروں۔ اماں تک کو ہنسا دیتے ہیں آپ جو بیچاری ہنسنا اور مسکرانا بالکل بھول چکی ہیں جب بھی آپ جائیں گے تو دل اداس اداس سا رہے گا اور کئی دن تک طبیعت گھبرائے گی۔"

"کیا یہ سچ ہے زلیخا؟"

"آخر آپ مجھے جھوٹا کیوں سمجھتے ہیں؟"

ارشاد دو قدم آگے بڑھا، اس نے زلیخا کا ہاتھ مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے لیا۔

---

2 - 30 - 0
0 - 60 - 0
0 - 50 - 0
0 - 30 - 0
0 - 50 - 0
0 - 50 - 0
1 - 25 - 0
0 - 75 - 0
0 - 75 - 0
0 - 88 - 0
2 - 50 - 0

9 - 83 - 0

(۶)

لیکن زلیخا اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑا نہ سکی، شاید اس نے چھڑانا بھی نہ چاہا!

اور پھر دفعتہً ارشاد نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور وہیں دروازے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا:۔

"زلیخا آج میں کتنا خوش ہوں، صرف میرا ہی دل جانتا ہے!"

وہ زیر لب تبسم کے ساتھ بولی:۔

"صرف آپ ہی؟ —— میں نہیں؟"

ارشاد نے کچھ عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا اور کہنے لگا۔

"اب تم ہمارے گھر چل کر رہو گی، سعادت گنج میں —— دیکھنا وہاں تمہاری کتنی خاطریں ہوتی ہیں۔ میں تمہاری دلجوئی کے لئے وقف رہوں گا، کسی بات کا جی چاہے، کوئی کام ہو، کوئی ضرورت ہو

مجھے تم ہر وقت اور ہمیشہ مستعد پاؤ گی ۔

وہ ہنستی ہوئی بولی ،

" پھر جھوٹ بولے آپ "؟

وہ کہنے لگا ، " اس میں جھوٹ کیا ہے "؟

" یہ سفید جھوٹ ہے "

" وہ کس طرح ؟ — یہ بھی بتا دو "؟

" یہ ٹھیک ہے کہ میں سعادت گنج جاؤں گی اور یہ بھی درست ہے وہاں میری خوب خاطر داری بھی ہو گی —— لیکن آپ وہاں کہاں ہوں گے "؟

" کیوں ؟ ——— میں کہاں چلا جاؤں گا "؟

" آپ تو یہاں رہیں گے ہماری امّی کے پاس ؟ کیا آپ بھول گئے ہم دونوں کا تبادلہ ہو چکا ہے ۔ آپ امّی کے پاس یہاں رہیں گے میں خالہ کے پاس وہاں "!

ارشاد کھلکھلا کر ہنس پڑا ، کہنے لگا :-

" آجی جناب ، اس بھول میں بھی نہ رہیئے گا ، یہ سب کچھ چالیں ہیں آپ کو لے جانے کی ، ورنہ جہاں آپ ، وہاں بندہ ، چاہے وہ جنّت ہو یا جہنّم "!

زلیخا کو بھی ہنسی آگئی ، کہنے لگی

" جہنم تک بھی آپ ساتھ دینے پر تیار ہیں "؟

وہ ہنستے ہوئے بولا :-

"اور کیا؟ ——— یقین نہ ہو تو جاکر دیکھ لو"

وہ پھر ہنسی ضبط نہ کر سکی، کہنے لگی:—

"واہ میں کیوں جانے لگی جہنم میں!"

پھر جتنے دن ارشاد رہا، دونوں اسی طرح کی باتیں کرتے رہے، باتیں شروع ہوجاتیں تو ختم ہونے میں نہ آتیں۔

اس زمانے میں انتہائی زیادہ تر ددرے میں مصروف رہا، لہٰذا گھر میں بھی کوئی ایسی بات نہیں ہوئی جو تکلیف دہ ہوتی، بڑے مزے میں یہ دن گزر رہے تھے، اور اسی روز دفعتہً سعادت گنج سے تار آیا کہ خالوجان کا، جنہیں خالہ اچھا بھلا چھوڑ کر آئی تھیں، انتقال ہوگیا۔ اس خبر نے سارے گھر میں کہرام مچادیا۔ مریم کا روتے روتے برا حال ہوگیا، رابعہ پر غشی کے دورے پڑنے لگے، ارشاد کی ساری زندہ دلی اور خوش طبعی اور جادو بیانی رخصت ہوگئی، اور پہلی ٹرین سے یہ غمزدہ قافلہ سعادت گنج روانہ ہوگیا۔ مریم نے کتنا کتنا چاہا کہ وہ بھی اپنی چھوٹی اور بیوہ بہن کے ساتھ چلی جائے۔ مگر وہ نہ جا سکی۔

---

اس لئے وہ گھر سے باہر نہ جا سکی کہ اس لونڈی کا آقا گھر سے باہر تھا اور اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر اگر وہ خود بھی مر جاتی تو قبر میں داخل ہونے کے لئے گھر سے باہر نہیں جا سکتی تھی۔

کلیجہ پر پتھر کی سل رکھ کر اس نے بہن کو اور بھانجے کو

بادیدۂ گریاں اور باسینۂ بریاں رخصت کیا

اور پھر زمانہ کی چکّی کچھ اس طرح چلی کہ دونوں بہنیں ایک دو
کی صورت نہ دیکھ سکیں۔ کچھ عرصہ کے بعد مریم کا انتقال ہوگیا، ا
کے حالات اتنے ابتر تھے اور رابعہ خود اتنی شدید بیمار تھی کہ گھر سے
باہر نہ نکل سکی۔ نہ بیمار بہن کی عیادت کو آسکی، نہ اس کے مرجانے
بعد پرسے اور تعزیت کو۔

زلیخا سوچنے لگی، اس کے بعد تو خالہ نے ہم لوگوں کو بالکل
فراموش کر دیا، کبھی خط تک نہ لکھا، بات تک نہ پوچھی، کیا یہ سارا چاو
پیار، امی جان ہی کی زندگی تک تھا،

اور ارشاد؟

کیا وہ — بھی بھول گیا، —— وہی وعدہ یعنی نباہ کا۔

ہاں سب بھول گئے، اب اس دنیا میں خدا کے سوا کوئی اپنا نہ
ہے، جب باپ اپنا نہ ہوسکا تو خالہ، اور ارشاد سے کیا توقع کی جا

وہ خوشی کی لہر جو ارشاد کے تصور سے اٹھی تھی ختم ہوگئی
قلب کے خانۂ تاریک میں امید، آرزو اور حسرت کی جو کرن پھوٹی
تھی۔ وہ پھر غائب ہوگئی اور پھر تاریکی ہی تاریکی تھی، ——
گھٹا ٹوپ اندھیرا۔

اور جیسے ہی ارشاد کا دامن تصور اس کے ہاتھ سے چھوٹا، کلثو

کی بھیانک تصویر، سامنے آکر کھڑی ہوگئی اور کلثوم کے تصور کے ساتھ ہی منور سامنے آکھڑا ہوا۔ اس کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی اس نے نادرہ سے کہا۔

تم ہی بچا سکتی ہو اس بربادی سے مجھ کو —— کیا واقعی تم موقعہ نکال کر اباجی سے گفتگو کرو گی؟

نادرہ نے اطمینان دلاتے ہوئے جواب دیا۔

"ہاں ضرور کروں گی اور مجھے کامل یقین ہے کہ میری باتیں سن کر ان کی آنکھیں کھل جائیں گی، ان لوگوں کی حقیقت ان پر آشکارہ ہو جائے گی!"

---

(۷)

دن اسی طرح گزرتے رہے!

مگر حالات میں کوئی خاص تغیر نہیں ہوا۔ وہی شب و روز تھے، وہی ماحول، وہی فضا۔

کلثوم کا برتاؤ اب اور زیادہ خراب ہو گیا تھا۔ نسیم کے برتاؤ میں پہلے سے کہیں زیادہ حقارت آگئی تھی

ایک روز زلیخا اپنے کمرے میں بیٹھی کچھ سی رہی تھی کہ نسیم آئی، نسیم کو اپنے کمرے میں، اپنے پاس آتا دیکھ کر اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ سوچنے لگی۔ یہ تشریف آوری خالی از علت نہیں ہو سکتی ——— "ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں"

بہر حال اس نے مسکراتے ہوئے نسیم کا خیر مقدم کیا۔ سوئی اسی طرح ہاتھ میں لیے لیے اس سے مخاطب ہوئی اور کہنے لگی۔

"آج کدھر بھول پڑیں ———"

نسیم نے منہ بنا کر کہا :- "ہر وقت وہی طنز، مجھے ان باتوں سے سخت نفرت ہے"

زلیخا نے سوئی کپڑے میں لگا کر اسے الگ رکھتے ہوئے کہا :-

"کیا لڑنے آئی ہو؟"

وہ چمک کر بولی "تم سے لڑ کر کچھ اپنی اوقات خراب کر دوں گی؟ کچھ ہوش میں ہو؟" ——

یہ سن کر زلیخا کا خون کھولنے لگا، خاموش نہ رہ سکی، گویا ہوئی :-

"تو میں اتنی گئی گذری اور نیچ ہوں کہ مجھ سے لڑنے میں بھی تمہاری توہین ہے"

وہ بولی "اور کیا نہیں بھی!" —— دوستی اور لڑائی دونوں برابر والے سے ہوتی ہیں!

"اور میں اس گھر کی خانہ زاد ہوں"

"ان حالوں کو پہنچ گئیں، مگر زبان کی تیزی میں فرق نہیں آیا"

"کن حالوں کو پہنچ گئی؟"

"ماں کو کھا گئیں۔ بھائی بھاگ کھڑا ہوا۔ ابا جان کبھی تھوکتے نہیں۔ نہ گھر میں جھانکیں۔ نہ اپنے پاس کھڑا ہونے دینے کے روادار مگر مزاج ہے کہ چرخ چہارم کی سیر کر رہا ہے

"تو کیا یہی باتیں کرنے آئی تھی تم یہاں؟"

"میری آئی ہے بیزار، میں کیوں آتی؟"

"تو جس سے میں باتیں کر رہی ہوں، وہ کون ہے؟
دیکھو بھئی ہمارا مزاج خراب ہے۔ زیادہ ٹپاپٹ مت بولو
ورنہ میرا ہاتھ چل جائے گا۔"

زلیخا اس وقت بالکل مقابلہ پر تلی ہوئی تھی، کہنے لگی:۔
"تو تم نے مجھے کوئی لنجا سمجھ لیا ہے؟ ——— دو ہاتھ
تمہارے پاس ہیں، دو ہی خدا نے مجھے دیئے ہیں۔"

نسیم یہ سن کر برق جہندہ کی طرح چمکی اور آکر بالکل زلیخا کے
سر پر کھڑی ہو گئی۔ خونخوار آنکھوں سے اسے دیکھا اور کہنے
لگی:۔

"تو مجھے مارے گی؟ تیری یہ اوقات؟"

وہ بولی "اوقات کا کیا سوال ہے؟ جو تم سو ہیں، ایک بھائی
کی تم بیٹی ہو، ایک کی ہیں۔ تم ایک مارو گی، ممکن ہے میں دو لگا دوں
آخر تم نے مجھے سمجھا کیا ہے"؟۔

"میں کیا سمجھوں گی، خدا ہی نے لعنت بھیج رکھی ہے تم پر"

"چلو تم تو ہر طرح کے عذاب سے محفوظ ہو؟"

وہ چلاتی، کوستی ہے، بددعا دیتی ہے۔
اور یہ کہتے کہتے بالکل اس کے بدن سے لگ کر کھڑی ہو گئی
زلیخا نے محسوس کر لیا، اب یہ زور سے ایک چانٹا مارے گی،
لیکن اس نے بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ ترکی بہ ترکی جواب ضرور دے گی ——
اینٹ کا جواب پتھر اور ساتھ ہی ساتھ دل میں کہہ رہی تھی کہ اس کا
ساتھ دینے کے لئے گھر کا ذرہ ذرہ موجود ہے اور میں اپنے باپ پر بھی
بھروسہ نہیں کر سکتی، یہ سوچ کر ذرا نرم پڑی اور ٹھنڈے لہجہ میں کہا،
"میرا کچھ دماغ تو خراب نہیں ہے کہ کوسنے بیٹھ جاؤں تمہیں،
تم لاکھ کچھ نہ سمجھو لیکن میں تو اس رشتہ کو قطع نہیں کر سکتی، جو اٹوٹ
ہے اور خدا کا بنایا ہوا ہے۔"

نسیم نے منہ بگاڑ کر کہا:-
"چل ہٹ —— بڑی آئی اللہ والی"

زلیخا نے چپ ہو جانا ہی مناسب سمجھا، اس نے چاہا کہ
بات ختم ہو جائے وہ بولی:
"اچھا بھئی میں بہت بری سہی، لیکن مجھے میرے حال پر چھوڑ کیوں
نہیں دیتیں؟"

نسیم نے جواب دیا" ہم کیا چھوڑیں گے، خدا ہی نے چھوڑ

دکھا ہے تمہیں “

یہ الفاظ تیر بن کر اس کو لگے کیونکہ ان میں صداقت
نظر آ رہی تھی، لیکن زلیخا خون کے گھونٹ کی طرح پی گئی،
جواب نہیں دیا۔

## (۸)

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ کلثوم بھی آگئیں اور آتے ہی نسیم پر پھر برس پڑیں۔

"بیٹی تم تو یہاں بیٹھ رہیں آ کر اور مہمان آتے ہی ہوں گے، زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ ہو گا ٹرین کے آنے میں۔"

وہ روہانسی آواز میں بولی :-

"امّی میں اس لئے نہیں آ رہی تھی!"

دفعتہً کلثوم کا رنگ رخ بدل گیا، اس نے ایک مرتبہ کھا جانے والی نظروں سے زلیخا کو گھورا۔ پھر نسیم سے پوچھا :-

کیا ہوا میری بچی؟ ——— کیا اس (زلیخا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) نے کچھ کہا۔ راکھ لگا کے زبان نکال لوں گی

سمجھی کیا ہے ـــــــ بتا تو سہی بیٹی بات کیا ہوئی؟"

وہ اور زیادہ روہانسی ہو کر بولی :-

"مجھے کوسا، مجھے بد دعا دی۔ مجھے مارنے کو کہا:۔

یہ سنتے ہی کلثوم بیگم دہکتا ہوا انگارہ بن گئیں۔ بڑی تیزی سے اپنے بھاری بھر کم جسم کو سنبھالتی ہوئی اٹھیں اور زلیخا کے پاس پہنچ کر اس کے منہ پر ایک چانٹا زور سے رسید کیا۔ پھر بولیں

"تیری بھی یہ اوقات ـــــ کہیں بھنگ تو نہیں کھا گئی ہے لو اور سنو، پاؤں کی جوتی بول سر چڑھ کر بولنے لگی، خون چوس لوں گی، مجھے کچھ اور نہ سمجھنا:

زلیخا نے بے بسی اور مظلومیت کے ساتھ گال پر ہاتھ رکھ لیا۔ آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ پاؤں کانپنے لگے۔ جی چاہا، پھوٹ پھوٹ کر روئے، لیکن ضبط کر گئی، اس نے سوچا۔ آنسو بڑے قیمتی ہوتے ہیں۔ انہیں دشمن کے سامنے رائگاں نہیں کرنا چاہیئے۔

نادرہ بھی کلثوم کے ساتھ ساتھ آئی تھی۔ یہ کیفیت دیکھ کر اس کا دل چیخ اٹھا لیکن اس کی بساط ہی کیا تھی۔ کچھ نہ کہہ سکی، زلیخا کو بچا تک نہ سکی۔ نہ اتنی سکت تھی کہ اسے کلیجہ سے لگا لیتی

اس کے آنسو پونچھ دیتی!

کلثوم ایسے زاویہ سے کھڑی تھی کہ اندیشہ تھا، یہ طمانچہ صرف پہلا ہے۔ اس کے بعد بارش شروع ہو جائے گی طمانچوں کی، اس مصیبت سے زلیخا کو بچانے کے لئے وہ بولی:۔

"آج صفدر بھیا آرہے ہیں۔ ان کے رہنے کا انتظام اس کمرے میں کیا گیا ہے، جہاں اعجاز میاں رہا کرتے تھے۔ اس کمرہ کی ناپ کا قالین بیگم صاحبہ کے پاس نہیں ہے اور نسیم بیٹا چاہتی ہیں کہ وہی قالین بچھے جو بالکل وہاں فٹ آتا ہے۔ دے دوگی تو کیا ہو جائے گا۔ آخر صفدر بھی کوئی غیر نہیں، اپنا ہی ہے اور مہمان کی خاطر تو کرنی ہی چاہیئے"

اتنی دیر میں زلیخا نے خود اعتمادی اور قوت ارادی سے کام لے کر اپنے آنسو خشک کر لئے تھے، اپنی کیفیت اور دل پر بھی قابو پالیا تھا، کہنے لگی:۔

"مجھ سے تو انہوں نے قالین کے لئے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ ورنہ میرا کیا بگڑتا تھا، ایک دفعہ نہیں سو دفعہ لے جاؤ":——

نسیم کو اپنی پوزیشن کچھ کمزور سی محسوس ہوئی۔ اس نے گویا صفائی دیتے ہوئے کہا:۔

"مجھے کچھ بات کرنے کا موقعہ بھی دیا ہوتا۔ میں نے قدم رکھا
اور طنز و تعریض کا سلسلہ شروع کر دیا۔ میں نے بات کی او
تم برابر کی چوٹ مرنے مارنے کو تیار ہوگئیں۔ ——
یہ کہتے کہتے نسیم کی آواز بھرّا گئی۔ کلثوم نے لپک کر اسے
گلے سے لگا لیا اور اس کے سر پر محبت اور شفقت سے ہاتھ پھیرتی
ہوئی بولی:

برابر کی چوٹ تجھ سے اس گھر میں کون لڑ سکتا ہے۔ کہاں راجہ
بھوج، کہاں گنگوا تیلی، یہ پاؤں کی جوتی اور اس قابل کہ تیرے
لگے؟ لوکا لگا دوں گی منہ میں بہت بڑھ بڑھ کے باتیں بنانے
لوں۔

نسیمہ غدر کا نام سن کر ویسے ہی وہ دہل گئی تھی۔ اندیشہ پیدا ہو
لیا تھا۔ کہیں منور بھی اس کے ساتھ نہ ہو۔ یا بعد میں نہ آ جائے
نہ بولنے کا فیصلہ کر چکنے کے باوجود بول پڑی" کہنے لگی

چچی اماں ——

چچی اماں نے بات کاٹ دی۔

"اے چل لعین —— خبردار جو مجھے چچی اماں کہا ہوگا
نہ تو میری کچھ ہے، نہ میں تیری کوئی ہوں ——

پھر نسیم سے کہا لعنت بھیجو قالین پر ———

لیکن نسیم مچل گئی - بچوں کی طرح ٹھنکتی اور زمین پر پاؤں پٹختی ہوئی کہنے لگی :-

"نہیں اماں ——— وہی قالین اس کمرے کے لئے خوب سجا ہے۔"

نادرہ کو پھر موقع مل گیا، کہنے لگی :-

"بیٹی دے دو - بٹیا ضد پا گئی ہے - اس کی ضد پوری کر دو۔"

زلیخا نے کمرہ کے ایک گوشہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا :-

"وہ رکھا تو ہے، بھونڈے سے کھولے جائے آ کر - نہ میں نے منع کیا تھا، نہ منع کرتی ہوں۔"

کلثوم بھی اسے دہراتی ہوئی بولیں :-

"نہ میں نے منع کیا تھا - نہ میں منع کرتی ہوں، کیا کہنا ہے سرکار کا ——— ذرا منع کر کے دیکھو تو سہی، جیسے اس کے منع کرنے سے ہم مان بھی جائیں گے - میں کہتی ہوں تو اپنی اوقات کیوں بھول جایا کرتی ہے - بار بار اور جلد جلد ——— سن لے کان کھول کر - یہ گھر ہمارا ہے، یہاں کی ہر چیز ہماری ہے - ہم تیرے

ساتھ بھی جو چاہیں کریں، کوئی ہمارا ہاتھ پکڑنے والا نہیں۔"

نسیم ہنس پڑی کہنے لگی :-

امّی یہ نہ کہیئے، ممکن ہے آپ کی یہ بات منور کو بُری لگے!

انتہائی برہم ہونے کے باوجود کلثوم بھی اپنی مسکراہٹ نہ چھپا نہ کر سکی، محبت اور پیار کے ساتھ نسیم کا ہاتھ پکڑا اور باہر نکلتے ہوئے کہنے لگی :-

"اچھا چل" ————

نسیم مسکراتی ہوئی اور زلیخا کی طرف مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھتی ہوئی ماں کے ساتھ چلی گئی، اس کا یہ تبسم بجلی کی طرح اس کے خرمن ہوش و حواس پر گرا۔ ادھر نسیم گئی، ادھر زلیخا نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا :-

نادرہ مجھے سنبھالو۔ میں گری۔ سر گھوم رہا ہے میرا —

————

لیکن وہ گرنے نہیں پائی۔ نادرہ نے اسے سنبھال لیا۔ سہارا دے کر جلدی سے بستر پر لٹا دیا اور پنکھا جھلنے لگی تھوڑی دیر تک وہ آنکھ بند کئے لیٹی رہی۔ پھر اس نے آنکھیں کھولیں اور بڑی حسرت کے ساتھ بولی :

نادرہ ——————

اور پھر کچھ نہ کہہ سکی، اس کے ہونٹ لرزنے لگے اور آنکھیں بہنے لگیں۔

نادرہ نے اسے گلے سے لگا لیا اور تسلی دیتے ہوئے کہا

"پھر وہی —— میں کہتی ہوں، رو رو کر اپنے تئیں ہلکان اور پریشان نہ کرو ۔ میاں کو دورے سے آ لینے دو۔ خدا کی

قسم پہلا کام یہی کروں گی کہ ان لوگوں کا پول کھول دوں گی
دیکھ لینا، کیا ہونا ہے۔"

زلیخا نے خشک ہونٹوں پر خشک زبان پھیرتے ہوئے ک

"پانی" ——

نادرہ نے صراحی سے لے کر ٹھنڈا پانی پلایا تو ذرا تازگی سی
آگئی، کہنے لگی :-

"اچھا اب میں جاتی ہوں - ورنہ میری شامت آجائے گی!"

زلیخا اسی طرح لیٹی رہی - گردن کے اشارے سے اسے جانے
کی اجازت دے دی - اتنے میں بھوندو قالین بینے آگیا - کہنے لگا

"کیا کر رہی ہو یہاں اتنی دیر سے؟"

بے چاری نادرہ سٹ پٹا سی گئی، کہنے لگی :-

"تیرا سر —— اب تو لے بھی پر پرزے نکالے!"

وہ ہنسنے لگا - پھر زلیخا کی طرف دیکھ کر یکسر سنجیدہ ہو گیا،
کہنے لگا :-

"ارے بیٹا، کیسی طبیعت ہے؟"

بھوندو بھی گھر کے ان چند لوگوں میں تھا جن کا سر مریم کی عظ
کے آگے جھکا ہوا تھا - اس لئے قدرۃً انہیں اعجاز اور زلیخا سے

بے انتہا ہمدردی تھی۔ اگرچہ عملاً وہ کوئی مدد ان کی نہیں کر سکتے تھے۔

زلیخا نے اسی طرح لیٹے لیٹے کہا:-

"اچھی ہوں، ——— ذرا چکّر آ گیا تھا"

بھونڈو نے قالین اٹھا کر سر پہ رکھا اور نادرہ سے کہا:-

"میرا منہ کیا تک رہی ہو ——— سر کیوں نہیں دباتیں ویسے بڑا اچادر رکھتی ہو بٹیا کا"

نادرہ نے پیچھے سے ایک دوہتّڑ جمایا اس کی پیٹھ پر۔ وہ "ہائے دیّارے، ڈوب دیہوشی، آئے گئی!" کہتا ہوا چلا گیا

زلیخا بھی مسکرادی، کہنے لگی:-

"بہت چھیڑتا رہتا ہے تمہیں؟"

وہ بولی "ہاں، لیکن دل آئینہ کی طرح صاف ہے"

پھر نادرہ بھی چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد زلیخا بڑی دیر تک بستر پہ لیٹی کروٹیں بدلتی رہی۔ یہیں لیٹے لیٹے گھر کی گہماگہمی شوروغل اور ہنگامہ آرائی سے اس نے اندازہ کر لیا کہ صفدر آ گیا۔ اور اس کے خیر مقدم میں کتنے زیادہ جوش و خروش کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ بار بار اس کے کانوں میں کلثوم اور نسیم کی

سر سے ٹکرائے گی؟

رابعہ نے ہنستے ہوئے کہا "ہاں اور کیا ان کا مزاج جانتی ہی ہے!"

---

(۶)

گو نادرہ جلدی آنے کا وعدہ کر گئی تھی لیکن اسے واپس آنے
ں کافی دیر لگی - اس عرصہ میں کئی مرتبہ نسیم نے اسے چائے کے لئے پکارا.
ر وہ تھی کہاں جو کسی طرح کا جواب دیتی - شام کی چائے، وہی روز،
راز، کلثوم اور نسیم کی خدمت میں پیش کیا کرتی تھی - جتنی جتنی دیر
وتی جا رہی تھی، ان لوگوں کا پارہ چڑھا جا رہا تھا -

آخر نسیم ضبط نہ کر سکی، وہ اپنے کمرہ سے نکل کر سیدھی رابعہ
ے کمرے میں پہنچی، اور اس کے پیچھے پیچھے حسب ضرورت مدد کے لے
ثوم!

نسیم نے پوچھا:-

"کیا وہ حرامزادی" نادرہ مر گئی"؟

رابعہ نے چونک کر اسے دیکھا اور جواب دیا، "اے خدا نہ کرے،

مرتی کیوں ؟ کام سے گئی ہے آتی ہو گی

کلثوم نے آگے بڑھ کر مداخلت کی "آخر وہ کون سا کام ہے جس کے لئے وہ زہین کا گز بنی ہوئی ہے ؟"

رابعہ نے سادگی کے ساتھ سارا واقعہ بتا دیا۔ نسیم نے کہا :-

" ہسپتال میں پڑے ہیں ، لیکن زبان کی چاٹ نے وہاں بھی ساتھ نہیں چھوڑا !"

رابعہ کو غصہ تو بہت آیا لیکن ضبط کر گئی ، لیکن اتنا کہے بغیر نہ رہ سکی :-

" بیٹی ، یہ تم اپنے تایا کو کہہ رہی ہو ——— وہ تمہارے باپ کے بڑے بھائی ہیں ، اس لئے ان سے زیادہ احترام کے مستحق ہیں "

نسیم کچھ جھینپ سی گئی لیکن کلثوم نے اس کی پشت پناہی کرتے ہوئے کہا :-

" سچی بات جو ہو گی ضرور کہی جائے گی ، چاہے کسی کے خلاف پڑے نہ جانے وہ موا ڈاکٹر کیسا ہے جس نے اس حالت میں کہ دم لبوں پر ہے کھیر چاٹنے کی اجازت دے دی !"

اب رابعہ ضبط نہ کر سکی ، اس نے کہا ، "شرم کرو کلثوم خدا سے ڈرو ، ہر کوئی بیمار ہو سکتا ہے ، ہر شخص پر یہ دن آ سکتے ہیں ۔ آج وہ کل

ری باری ہے - ایسی باتیں منہ سے نہ نکالو جو خدا کو بری لگیں، کوئی
ین جانتا کہ کل کیا ہونے والا ہے، اتنی فرعونیت بھی اچھی نہیں ہوتی -
یہ الفاظ بارود میں آگ ثابت ہوئے - کلثوم بھڑک اٹھی - کمر پر
ز رکھ کر کہنے لگی :-

"میں کہتی ہوں زبان سنبھال کے بات کر!"

رابعہ نے حقارت کی نظر سے اسے دیکھا اور بولی :-

اب خیر سے تو تڑاق پر اتر آئیں ——— زباں بگڑی تو بگڑی
ی خبر لیجئے، دہن بگڑا!"

کلثوم نے اور زیادہ درشت لہجہ میں جواب دیا :-

آخر تو اپنی کھال میں کیوں نہیں رہتی - آخر تجھے حق کیا تھا ایسی
تیں کرنے کا؟ - کوسنے کا؟ گالیاں دینے کا؟ تو اپنے آپ کو سمجھتی کیا
ہے؟ بات اگر مردوں (احمرار) تک پہنچی تو ابھی آٹے دال کا بھاؤ معلوم
ہو جائے گا - ان کا غصہ بہت برا ہے - پھر وہ نہ میر کے نہ پیر کے!"

رابعہ نے پوچھا "کیا کر لیں گے وہ؟"

کلثوم کے بجائے نسیم نے جواب دیا - دن میں تارے نظر آجائیں گے
ن کا ہاتھ بڑی جلدی اٹھتا ہے - اس دن نادرہ کو ایسی چار چوٹ کی
ماری تھی کہ ہفتوں یاد کی ہو گی!"

"تو کیا مجھے بھی ماریں گے؟ مجھ پر بھی ہاتھ اٹھائیں گے!"

"نہیں ہر میجسٹی، ملکہ معظمہ کے ساتھ ایسی گستاخی کیسے سرزد ہو

سکتی ہے ان سے؟

یہ کہنے کے بعد وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی، لیکن اس ہنسی میں کتنی حقارت تھی۔ کتنی برہمی تھی، اسے رابعہ نے اچھی طرح محسوس کر لیا۔ اتنے میں کلثوم بولی:۔

"چاہے کوئی بھی ہو، ہم کسی سے نہیں ڈرتے"

رابعہ نے بڑے ٹھنڈے لہجہ میں جواب دیا۔

"لیکن میں ڈرتی ہوں!"

نسیم نے بناتے ہوئے پوچھا، ارے آپ بھی ڈرتی ہیں؟

وہ بولی: "ہاں ہر ننگ آدمی سے!"

---

(۷)

رابعہ کے یہ الفاظ سن کر کلثوم اور نسیم دونوں سناٹے میں آگئیں
را دیر تک گم سم کھڑی رہیں۔ پھر جب حواس بجا ہوئے تو کلثوم نے
ہا:۔

"ہم ننگ ہیں، ہم کمینے ہیں؛ ہم رذیل ہیں؟ ہم چھچھے
یں؟"۔

جواب میں رابعہ نے کہا "تم خود بہتر جانتی ہو کہ کیا ہو، ——
—— لیکن، بی بی اب مجھے معاف کرو، جاؤ اپنے کمرے میں بیٹھو،
برابر خواہ مخواہ کیوں کھا رہی ہو؟"
نسیم اچھل کر بولی:۔
کیوں جائیں اپنے کمرے میں؟ کیا یہ گھر ہمارا نہیں ہے،؟

ہمارے سوا اس کا مالک کون ہے ؟"

" مالک تو ہے ———— میں نہیں ہوں، اور میں نے اس کا دعوٰی بھی نہیں کیا !"

کلثوم نے لقمہ دیا، " دعوے کروگی کس منہ سے ؟ تمہاری حیثیت کیا ہے ؟ بھائی صاحب (اتیانہ) کو دعا دو کہ انہوں نے ٹکڑوں سے لگا دیا لیکن بھائی ایسی روٹی پر جو لاج گنوا کر حاصل کی جائے تف ہے شریف عورت تو مر رہنا گوارا کر لے گی لیکن اپنی لاج کا سودا نہیں کرے گی۔

نسیم ہنسنے لگی، پھر گویا ہوئی " وہ بھی اس عمر میں ———— آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے۔"

اور یہ کہہ کر وہ پھر ہنس پڑی۔ ان باتوں نے رابعہ کو حد درجہ برہم کر دیا۔ اس کا جی چاہا نسیم کا اور کلثوم کا منہ نوچ لے، لیکن اتیانہ بیمار تھا۔ ارشاد باہر تھا۔ زلیخا سپتال میں تھی۔ نادرہ موجود نہیں تھی۔ وہ تنہا تھی اور محسوس کر رہی تھی کہ اگر بات نے زیادہ طول کھینچا تو نوبت مار پیٹ تک پہنچ جائے گی، لہٰذا خون کا گھونٹ پی کر رہ گئی۔ کہنے لگی :-

" آج تو ایسا معلوم ہوتا ہے تم دونوں ماں بیٹی مار پیٹ کرنے کے لئے آئی ہو، لیکن سوچو تو سہی، شریف خاندانوں میں ایسا ہوتا ہے ؟"

"شریف ؛ شریف کون ہے شریف ؟ —————
تم ؟"
"میں نہیں تو نہ سہی تم تو ہو، تم تو شرافت کا پاس کرو۔"

ایک زہر خندہ کے ساتھ نسیم بولی، اسی لئے تو اب تک سر اور ہاتھ پاؤں سلامت ہیں۔ ورنہ کب کی خود بھی ہسپتال پہنچ چکی ہوتیں پھر وہاں مزے آتے جب دونوں ایک ساتھ جمع ہو جاتے —————
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل!

رابعہ نے بہت زیادہ نرم لہجہ میں کہا، بی بی واقعی میں بہت بُری ہوں۔ معاف کر دو مجھے!

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ہانپتی کانپتی نادرہ دودھ لئے ہوئے موجود ہوئی۔ نادرہ کو دیکھتے ہی نسیم اور کلثوم کا پارہ اور چڑھ گیا۔ پہلے کلثوم نے سوال کیا:—

"کیوں ری مردار کہاں تھی اب تک؟"

وہ بولی، بڑے صاحب کے لئے دودھ لینے گئی تھی۔ بڑی دور جانا پڑا سواری بھی کوئی نہیں ملی۔ پیدل گئی اور پیدل آگئی نہ جانے تانگے کہاں مر گئے سارے۔

نسیم نے قہر کی نگاہوں سے اسے گھورا، اور پھر اس سے

پوچھا :-

"اور ہماری چائے ؟"

وہ معذرت کرتی ہوئی کہنے لگی :-

"ہاں بیٹا آج بہت دیر ہو گئی - لیکن کچھ اپنے کام سے تو گئی نہیں تھی، ...... اللہ سلامت رکھے تمہارے تایا کے کام سے گئی تھی - کتنے دنوں سے وہ بیمار ہیں - نہ کچھ کھاتے ہیں - نہ پیتے ہیں - آج انہوں نے خود اپنے منہ سے کھیر کی فرمائش کی تھی - زلیخا نے اصرار کیا تھا - ٹھیک وقت پر لے آنا - چکنائی نکلا ہوا دودھ یہاں کہیں تھا نہیں، اس لئے قاضی ٹولے جانا پڑا، ورنہ کب کی چائے دے چکی ہوتی،

"اب اب چٹکی بجاتے ہیں بنائے دیتی ہوں"

---

پھر وہ رابعہ سے مخاطب ہوئی :-

"بی بی چاول تیار کر لئے ہوں تو کام شروع کر دو، میں بیٹا کے لئے چائے بنا دوں ذرا - پھر اس سے فارغ ہو کر آتی ہوں، جو کسر رہ جائے گی ساری پوری ________ کر دوں گی -

نسیم آگے بڑھی - اس نے دودھ کا برتن نادرہ کے ہاتھ سے چھین لیا اور اسے تڑ سے صحن میں پھینک دیا اور کہا "دیکھا اباجی کیسی

لیتے ہیں آج تمہاری ؟"

اور پھر سیدھی تیر کی طرح اپنے کمرے میں چلی گئی !

---

## (۸)

نادرہ کو جلال آگیا !

وہ اس گھر کی پرانی خادمہ تھی - اس نے یہاں کا نمک کھایا تھا اور چھوٹے بڑے ہر ایک کی دل و جان سے خدمت کی تھی - اس گھر میں اس نے بہت سے منظر دیکھے تھے ، اچھے بھی اور بُرے بھی - اس نے مریم کو دلہن بن کر آتے بھی دیکھا تھا اور کلثوم کو بھی ، وہ نسیم کی ادا شناس بھی تھی اور زلیخا کی بھی - اس نے رابعہ کا روپ بھی دیکھا تھا اور صفدر ، ارشاد اور اعجاز کا بھی - اس نے احراز کی چاکری بھی کی تھی اور امتیاز کی بھی - ان سب کے اوضاع و اطوار ، عادات و خصائص اور حرکات و سکنات شب و روز اس کی نظر میں تھے - ایک زمانہ تھا کہ اس کا دل امتیاز سے نفرت کرتا تھا اور مریم کے لئے خون

ے آنسو رُلاتا تھا - زلیخا کے لئے پھٹا جاتا تھا - اور اعجاز کے لئے
تڑپا کرتا تھا - پھر جب مریم مرگئی تو وہ اور زیادہ زلیخا اور اعجاز کی
رف مائل ہو گئی اور جب امتیاز نے اپنی روش بدلی تو وہ اس کی
چاکری بھی دل وجان سے کرنے لگی - اس سے ہمدردی پیدا ہو گئی - اس
کی تکلیف پر کڑھنے لگی، جب سے وہ بیمار ہوا تھا - اس کا صرف ایک
کام رہ گیا تھا - وہ دل وجان سے اپنے آقا کی خدمت میں لگی ہوئی تھی
نہ اسے اپنا ہوش تھا نہ کسی دوسرے کا - پھر بھی جہاں تک ہوتا،
وہ اپنی ذمہ داریاں انجام دینے کی کوشش کرتی رہتی، لیکن آج کے
واقعہ نے اسے حواس باختہ کر دیا، اس کے لئے ضبط کرنا دشوار
ہو گیا - اس نے بغیر کسی جھجک کے کلثوم سے کہا :-

"بی بی سلام ہے ایسی نوکری کو - میں باز آئی!

کلثوم کا پارہ چڑھ گیا اور ساتھ ہی ساتھ پاؤں کے نیچے سے
زمین بھی نکل گئی - اتنی کارگزار، فرض شناس اور محنتی، ساتھ ہی
ساتھ سستی ملازمہ کہاں مل سکتی تھی - یہ چلی گئی تو کیا ہوگا؟ گھر
کا کام کس طرح چلے گا؟ کچھ استمالت اور کچھ برہمی کے لہجہ میں کہا :-

"کچھ دیوانی ہوئی ہے؟"

وہ بولی، "ہاں میں دیوانی ہو گئی ہوں، اب مجھے نہ یہاں رہنا
نہ کام کرنا ہے - میں نے آج تک کی تنخواہ معاف کی، میرا کہنا سننا معاف
کرنا -

پھر وہ رابعہ سے مخاطب ہوئی اور کہنے لگی :-

لیکن جب تک بڑے صاحب (اتبیانہ) اچھے ہو کر نہیں آجاتے یہاں کا کام برابر کرتی رہوں گی

کلثوم نے کہا : "اگر تو نے نوکری چھوڑ دی ہے تو اس گھر میں قدم بھی نہیں رہ سکتی"

وہ بولی : "آپ کی طرف قدم نہیں رکھوں گی، لیکن بڑے صاحب کی طرف آنے سے اور وہاں کا کام کرنے سے مجھے کون روک سکتا ہے؟"

کلثوم نے سینہ ٹھونک کر کہا، "ہم روکیں گے"

رابعہ نے ان دونوں کی جنگ میں کوئی حصہ اب تک نہیں لیا تھا، اب وہ بولی :-

"خدا کے لئے رحم کرو۔ ان باتوں سے کیا فائدہ ہوگا؟ ——— وہ ہسپتال میں بیمار پڑے ہیں کتنے شرم کی بات ہے کہ ان کے لئے یہاں سے کھانا بھی نہیں جا سکتا۔ ذرا سی چائے کے لئے"

نادرہ بولی "وہ تو جائے گا۔ ابھی الٹے پاؤں بھاگتی ہوئی جاتی ہوں اور دودھ لے کر آتی ہوں۔ دیکھ لینا پلک جھپکنے میں کھیر تیار ہوگی، اور خدا نے چاہا تو ٹھیک وقت پر انہیں پہنچا آؤں گی تم ذرا بھی فکر نہ کرو"

رابعہ کو حوصلہ مل گیا، کہنے لگی "ہاں میری بہن، جلدی سے دودھ

لے آ، کافی دیر ہو گئی ہے۔

"ابھی لائی"۔ یہ کہہ کر نادرہ نے زمین پر گرا ہوا برتن اٹھایا، اسے جلدی جلدی دھویا، اور چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد کلثوم نے کہا:۔

بھئی تم تو بڑی سبز قدم بن کر آئی ہو۔ اس گھر میں جب سے قدم رکھا ہے، آفتیں ہی آفتیں نازل ہو رہی ہیں۔ آخر اپنے گھر کب جاؤ گی"!

وہ بولی، "یہ بھی تو میرا گھر ہے، کیا کسی غیر کا ہے"؟

کلثوم نے جواب دیا، "نہیں کسی غیر کا کیوں ہوتا۔ ماشاءاللہ جب بھائی صاحب تمہارے ہیں تو یہ گھر کیسے تمہارا نہیں ہے"؟

وہ جل کر بولی:۔ اچھا یہی سہی۔ یہ نہ بھولو کہ آسمان کا تھوکا منہ پر آتا ہے کہیں میرے منہ سے بھی کوئی ایسا ویسا لفظ نکل گیا تو روتی روتی پھرو گی۔

---

(۹)

نہ جانے نسیم نے باپ سے جاکر کیا لگایا کہ احراز جواب تک کمرہ میں بیٹھا تھا باہر آیا، اس نے نفرت اور حقارت سے بھری ہوئی ایک نظر رابعہ پر ڈالی پھر کلثوم سے کہا:-

"کیا ہو رہا ہے یہاں اتنی دیر سے؟"

وہ بولی، "شامت آئی تھی جو اس طرف نکل آئی —— نادرہ بھی ہاتھ سے گئی۔"

(چونک کر) "نادرہ کو کیا ہوا؟"

"اس نے نوکری چھوڑ دی۔"

"یہ کیوں؟ اس کی یہ جرأت؟"

"جرأت دلائی گئی تو پڑی، اس کا کیا قصور؟"

کس نے جرأت دلائی ـــــــ

"(رابعہ کی طرف اشارہ کر کے) کھڑی تو ہیں تمہارے سامنے ـــــــ

وہاں کام نہیں کرے گی۔ صرف یہاں کا کام کیا کرے گی؟

"مارے ہنٹر کے کھال ادھیڑ دوں گا حرامزادی کی ـــــــ

وہ ہے کہاں؟"

"دودھ خریدنے کے لئے بھیجی گئی ہے!"

اب تک کلثوم اور احراز میں باتیں ہو رہی تھیں۔ اب احراز نے رابعہ سے تخاطب کرتے ہوئے کہا:۔

آپ کو اس طرح کی باتیں کرتے ہوئے شرم آنی چاہیئے، آپ تو اس گھر میں ایک زندہ ـــ ہنگامہ، ایک طوفان بن کر آئی ہیں۔

رابعہ نے کہا" تمہاری بیٹی مجھے گالیاں دے کر گئی ہے۔ تمہاری بیوی جتنی صلواتیں سنا سکتی تھیں۔ جی بھر کے سنالیں۔ جو رہی سہی کسر ہو وہ تم پوری کر لو۔ وہ بھی سن لوں گی۔ لیکن بات کیا ہے، یہ بھی تو سن لو!"

اور پھر رابعہ نے ساری کہانی از اوّل تا آخر سنادی۔ اس کے بعد گویا ہوئی:۔

ذرا کلیجہ پر ہاتھ رکھ کر جواب دو کیا میری یا نادرہ کی کوئی خطا ہے؟ کوئی غلطی ہے؟

لیکن رابعہ کی باتوں سے احمراز مطمئن نہیں ہؤا، اس نے کہا:-

" نادرہ کی خطا تو یہ ہے کہ اس نے بد زبانی کیوں کی؟ اور آپ کی خطا یہ ہے کہ اسے شہ کیوں دی؟ اور یہ دونوں خطائیں ناقابل معافی ہیں۔ لیکن بیچ میں بھائی صاحب ہیں۔ وہ جب تک ہسپتال سے نہیں آ جاتے ہیں خاموش رہوں گا، اس کے بعد انہی سے بات ہو گی۔ خواہ اس کا نتیجہ کچھ کیوں نہ نکلے۔

پھر اس نے کلثوم سے کہا:-

بھائی صاحب کے ہسپتال سے آنے کے بعد نادرہ کو سزا بھی ملے گی اور وہ یہاں رہنے بھی نہیں پائے گی، اور اگر اسے رکھنے پر اصرار کیا گیا، تو اس وقت فیصلہ بھی ہو جائے گا، تم کسی اور ملازمہ کا انتظام کر لو"۔

وہ بولی!

" ہاں بس آج کی تکلیف ہے۔ کل کوئی ملازمہ ضرور آ جائے گی"۔

احمراز چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی زلیخا آ گئی۔ رابعہ نے بیقرار ہو کر پوچھا:

خیر تو ہے میری بچی، تو کیسے آ گئی اس وقت؟ بھائی صاحب تو اچھے ہیں؟"۔

وہ سنجیدگی اور افسردگی کے ساتھ بولی :-

جیسے تھے ویسے ہی ہیں۔ اس وقت سو رہے ہیں۔ ڈاکٹر نے
ب آور دوا دی ہے۔ میرے کپڑے بڑے چکٹ ہو گئے ہیں۔ سوچا
ں لوں جا کر۔"

وہ مستعدی اور آمادگی کے ساتھ گویا ہوئیں

"ابھی پانی گرم کئے دیتی ہوں

وہ بولی "آپ کیوں یہ تکلیف کریں، میں خود کر لوں گی ——
ں خالہ اماں، اباجی کی کھیر؟
"نادرہ دودھ لینے گئی ہے ؟ ——————————
ب"!

بس آتی ہی ہو گی، وہ تو کپ کی دودھ لے کر آئی تھی، لیکن دیکھ
——

رابعہ نے جدھر اشارہ کیا تو زلیخا نے اس طرف دیکھا، لیکن
سمجھ نہ سکی، کہنے لگی :-

کیا بات ہے خالہ جان؟ —— یہاں تو کچھ پانی سا بہا
نظر آتا ہے!"

وہ بولیں :-

نہیں بیٹی، یہ پانی نہیں دودھ ہے۔

زلیخا کے استفسار پر آخر انہیں ساری داستان سنانا پڑی ۔ وہ رابعہ سے زیادہ بے بس تھی ۔ صبر کر کے خاموش ہو رہی اور باورچی خانے میں نہانے کے لئے پانی گرم کرنے چلی گئی ۔

(۱۰)

نہا دھو کر، کپڑے بدل کر جب زلیخا غسل خانے سے باہر آئی تو،
رہ کھیر تیار کر چکی تھی۔ اس کی اس مستعدی اور کارگزاری سے
لیخا بہت خوش ہوئی، کہنے لگی :۔
تمہارا نام تو نادرہ کے بجائے بجلی ہونا چاہیئے تھا۔ کتنی جلدی
ارا کام کر ڈالا۔
کوئی اور وقت ہوتا تو اس خراج تحسین پر نادرہ کی باچھیں کھل
تیں۔ لیکن نسیم اور کلثوم کی باتوں نے اس کے دل میں زخم ڈال
یا تھا۔ چپ رہی کچھ نہیں کہا :۔
زلیخا نے کہا،
"میں ابھی ہسپتال جا رہی ہوں اگر کوئی اور کام نہ ہو تو چلو ساتھ ساتھ

چلے چلیں گے!

زلیخا کا مقصد یہ تھا کہ راستہ میں اور ہسپتال میں اس کی کچھ دلجوئی کرے گی۔ نادرہ راضی ہو گئی کہنے لگی :۔

" ہاں ٹھیک ہے۔ میں بھی چلتی ہوں۔ یہاں تو اب کوئی کام ہے نہیں "

زلیخا اور نادرہ ہسپتال جانے کے لئے تیار ہو گئیں، زلیخا آگے آگے اور نادرہ پیچھے پیچھے زلیخا کے ہاتھ میں کچھ کتابیں، نادرہ کے سر پر سینی!

یہ دونوں کمرہ سے نکل کر صحن میں آئیں اور باہر کے دروازہ کی طرف بڑھی ہی تھیں کہ نسیم تیز تیز چلتی ہوئی آئی اور راستہ روک کر کھڑی ہو گئی، زلیخا نے پوچھا :۔

" کیا بات ہے نسیم؟"

وہ بولی " بات کیا ہوتی۔ یہ حرامزادی نادرہ نہ اس گھر میں رہ سکتی ہے۔ نہ یہاں کسی کا کام کر سکتی ہے۔ اس نے ہماری نوکری چھوڑ دی۔ ہم نے اسے گھر سے نکال دیا۔

زلیخا نے جواب دیا " بہت اچھا کیا نکال دیا، اب وہ صرف ہمارے ہاں کام کرے گی!

نسیم بولی " یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ہمارا باغی اس گھر کے کسی گوشہ میں پناہ نہیں پا سکتا "

"تو تمہارا مطلب ہے میں نکال دوں اسے"؟

"ہاں یہی مطلب ہے"؛

"لیکن اس کی خطا؟ اس کا قصور؟ اس کا جرم؟"

"اس نے ہمارے لئے چائے نہیں بنائی اور دودھ کے لئے بازار کے پھیرے پر پھیرے کرتی رہی"۔

"لیکن وہ تو اباجی کے لئے کھیر ______"

"نہ ہمیں تم سے مطلب ہے، نہ تمہارے اباجی سے، نہ کھیر سے، نہ پلاؤ زردے سے نہ تمجن مزعفر سے!"

"کیا میرے اباجی تمہارے کوئی نہیں ہیں؟"

"یہی سمجھ لو"۔

"پھر تمہارا مطلب کیا ہے؟ چاہتی کیا ہو؟"

"نادرہ کی صورت میں دیکھنا نہیں چاہتی، وہ یہاں اس گھر میں نہیں رہے گی!"

"اچھا اس وقت تو جانے دو اسے، یہ فیصلہ واپسی پر کر لینا"۔

"جب تک یہ فیصلہ نہ ہو جائے کہ یہ اب واپس نہیں آئے گی، میں نہیں جانے دوں گی۔ اس کے سر پہ جو کچھ ہے پھینک دوں گی بتائے دیتی ہوں!"

"اس کے سر پہ تو اباجی کا کھانا ہے، کیا اسے بھی پھینک

دو گی ؟"

"ہاں اسے بھی پھینک دیں گے ؟"

"مجرم میں ہوں، خالہ اماں ہیں، نادرہ ہے، ان بیچارے نے کیا کیا ہے۔ وہ تو ہسپتال میں بیمار پڑے ہیں ؟"

"ہاں اور کیا بیچارے ہسپتال میں بیمار پڑے ہیں، لیکن کھیر کے شوق میں مرے جا رہے ہیں۔ بے چارے بیمار پڑے ہیں، لیکن صاحبزادی صاحبہ سولہ سنگار کر کے گشت کو نکلی ہیں۔ بے چارے مرے جا رہے ہیں لیکن صاحبزادی کی ساسں صاحبہ، اور اس بے چارے کی محبوبہ تر مال پکا رہی ہیں، کھا رہی ہیں، کھلا رہی ہیں !" ———

کیا خوب ہیں وہ بیچارے، اور کیا خوب ہے ان بیچارے کی بیماری !

اپیل کے انداز میں زلیخا نے کہا، "نسیم یہ تم کہہ رہی ہو ؟ — ——— یہ الفاظ تو ایسے موقعہ پر کسی دشمن کے منہ سے بھی نہیں نکل سکتے !"

"یہاں دوستی کا دعویٰ کسے ہے، دشمن ہی سمجھ لو !"

"اپنے چچا کی بیٹی کو دشمن سمجھ لوں ؟ ——— کیا واقعی قیامت قریب آگئی ہے ؟"

"ہاں بہت قریب آگئی ہے اور بہت جلد نمودار ہونے والی ہے اگر نادرہ نے بوریا بستر نہ اٹھایا۔"

زلیخا کچھ دیر خاموش رہی، پھر اس نے نادرہ سے کہا:۔
"اپنا بستر ساتھ لے لو، تم ہسپتال میں رہنا۔ میں یہاں رہوں گی
خدا ابا جی کو تندرست کر دے، اگر وہ اپنے ساتھ لائیں تو چلی آنا، نہ
لائیں تو جہاں جی چاہے سدھار جانا۔

---

# خدا کی چکّی

دیر میں پیستی ہے لیکن بہت
باریک پیستی ہے

(۱)

نادرہ اپنا بستر اور کپڑے لینے سینی وہیں رکھ کر چلی گئی۔ نسیم اب تک پیکرِ قہر و جلال اور مجسمۂ خشم و عتاب بنی کھڑی تھی، جیسے بس چلے تو نادرہ کو ابھی قتل کر دے اور زلیخا کو کچّا چبا جائے اور رابعہ کے تکّے بوٹی کر دے، لیکن زلیخا نے اس کی بات مان لی تھی۔ فیصلہ کر لیا تھا کہ نادرہ ہسپتال میں رہے گی اور وہ گھر میں، اب کس بات پہ لڑتی ؟

اسی اثنا میں یکایک دروازہ کھلا اور اعجاز نمودار ہو گیا

اعجاز کو دیکھتے ہی زلیخا بیتابی کے ساتھ اس کی طرف لپکی،

بھیّا آپ آ گئے ؟

اعجاز نے اس کا سر اپنے سینہ سے لگا کر اور محبت سے پیٹھ پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا :-

ہاں میں آگیا ——— میں کافی دیر کا آیا ہوا ہوں، دروازہ میں قدم رکھا تو دنگے اور فساد کی آوازیں کانوں میں آئیں۔ وہیں ٹھٹک کر کھڑا ہوگیا اور دروازے کی اوٹ سے مہابھارت کا تماشہ دیکھنے لگا ——— یہ کیسی لڑائی تھی زلیخا؟

زلیخا نے بات کو ٹالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:۔

"کچھ بھی نہیں، گھروں میں یہ ہوتا ہی رہتا ہے"

لیکن اعجاز کی تسلی نہیں ہوئی، اس نے کہا:۔

گمر اباجی کا نام بھی بیچ میں کئی بار آیا، وہ کہاں ہیں؟، کیسے ہیں؟

زلیخا کو بات کے پلٹنے کا موقعہ مل گیا۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر بھرائی ہوئی آواز میں بولی:

"وہ ہسپتال میں موت سے لڑ رہے ہیں بھیا"

اور پھر وہ اس کے سینہ سے لگی لگی سسکیاں لے لے کر رونے لگی، اعجاز کی حالت بھی متغیر ہوگئی، اسنے کہا:۔

"خدا کے لئے بتاؤ، کیا بات ہے؟"

زلیخا نے مختصر طور پر ساری داستاں سنادی اور کہا:۔

بھیا وہ ہوش و حواس کھو بیٹھے ہیں۔ انہیں کوئی بات یاد نہیں رہتی وہ سب کو بھول چکے ہیں۔ لیکن اعجاز کی یاد میں ماہئ بے آب کی طرح تڑپ رہے ہیں

"وہ مجھے یاد کرتے ہیں؟"

"ہاں ——— بہت زیادہ ہر وقت"

"وہ مجھ سے خفا نہیں ہیں؟"

"بالکل نہیں ——— بھیّا انہوں نے آپ کو معاف کر
یا"

"انہوں نے مجھے معاف کر دیا؟"

"ہاں بھیا ——— بالکل معاف کر دیا۔ وہ کہتے ہیں اعجاز
کوئی خطا ہی نہیں تھی، وہ کہتے ہیں میرا لڑکا بڑا خود دار ہے
با غیرت ہے، مجھے اس پر فخر ہے، ناز ہے، وہ مجھ سے اس
نہیں روٹھا کہ مجھ سے نفرت کرتا تھا، اس لئے خفا ہوا کہ اپنی ماں
محبت رکھتا تھا۔ وہ اپنی ماں کی محبت میں مجھ سے خفا ہوا، مجھے
جرم کا اقرار ہے، اس جرم پر میں شرمسار ہوں۔ خود مجھے اپنے آپ
نفرت ہونے لگتی ہے ———"

گلوگیر آواز میں "زلیخا ———" ہاں بھیا میں غلط نہیں کہتی
پ ہی کے غم میں بیمار پڑے ہیں۔ آپ کی فرقت نے انہیں زندہ درگور
دیا ہے۔ وہ بھی تو آخر آپ کے باپ ہیں۔ ان کی خودداری نے اس
اجازت نہ دی کہ آپ کا تعاقب کریں، آپ کو بلائیں، لیکن وہ برابر
پ کو یاد کرتے رہے، اور یاد کر کر کے روتے رہے ———

"زلیخا، زلیخا)، یہ میں کیا سن رہا ہوں؟"

"بھیّا میں غلط نہیں کہتی"

"لیکن سچ بھی کس طرح مان لوں؟"

ماننا ہی پڑے گا، وہ اب بالکل بدل گئے ہیں، سچ مچ بدل گ
ہیں ——

"بدل گئے ہیں؟"

ہاں —— بہت زیادہ، اب وہ ہر وقت امی کو یاد کیا کرتے
ہیں - ان کی یاد میں آہیں بھرا کرتے ہیں، ان سے ملنے کے لئے مر
کی دعائیں کرتے رہتے ہیں ——

"کیا واقعی زلیخا؟"

جی بھیّا، اب وہ مجھے بھی بہت چاہنے لگے ہیں - بہت —— میری جتنی
انہوں نے کی ہے جس محبت، پیار اور شفقت کا برتاؤ کرتے رہے ہیں
اگر امی زندہ ہوتیں تو وہ بھی اس سے زیادہ نہیں کر سکتی تھیں

"وہ تجھے چاہتے ہیں اب؟ —— واقعی؟"

"چاہنے کی کوئی حد نہیں بھیّا - وہ اب میرے باپ نہیں ماں
ہیں —— صرف میرے ہی نہیں، آپ کے بھی"

"میرا نام نہ لو، میں بہت نالائق ہوں ——"

"یہی اکثر میں بھی سوچا کرتی تھی - جیسے جیسے ابا جی کی محبت
بڑھتی گئی - میں آپ سے خفا ہوتی گئی، لیکن ان کے دل کو
دیکھئے، وہ آپ سے —— ایک لمحہ کے لئے بھی خفا نہیں

ے"

"زلیخا یہ میں کیا سن رہا ہوں؟

"کئی دن سے انہیں رٹ لگی ہوئی ہے کہ اعجاز آگیا ہے،
ں نے خود اسے دیکھا ہے لیکن وہ چلا کیوں گیا؟ کہیں وہ مجھ سے
ر تو خفا نہیں ہو گیا؟ کہیں تو نے اس سے لڑائی تو نہیں کر لی
ں جھوٹ بول بول کر میں انہیں سمجھاتی ہوں، بہلاتی ہوں، دھوکا
ہوں، کبھی کہتی ہوں دوا لینے گئے ہیں، کبھی بتاتی ہوں۔ آ
ں ہیں۔ کبھی کہتی ہوں ڈاکٹر سے حال کہنے گئے ہیں۔ وہ دروازے کی
ں تکتے رہے ہیں کہ میرا بیٹا آ کر پھر کہاں چلا گیا؟"

"زلیخا چلو، مجھے ان کے پاس لے چلو؟"

چلیئے ——— آپ کو وہ دیکھ کر کتنے خوش ہوں گے،
پ اندازہ بھی نہیں کر سکتے، آپ کو دیکھ کر ان کی آدھی بیماری
جائے گی۔ آپ کو دیکھ کر وہ اچھے ہو جائیں گے بھیّا؟"

تم تو تقریر کئے جا رہی ہو، چلتیں کیوں نہیں ———

"نادرہ کو تو آ لینے دیجئے!"

اتنے ہی نادرہ آ گئی۔ اعجاز کو دیکھ کر پھول کی طرح کھل
ر رابعہ بیگم اپنے کمرہ میں رو رہی تھیں ۔ نسیم اور زلیخا کی
ں سن کر ہول رہی تھیں ۔ نادرہ نے انہیں آواز دی،
بڑا کر اٹھیں کہ خدا جانے کیا حادثہ رونما ہو گیا۔ اب تو وہ

ہر وقت کسی خوفناک حادثہ کے انتظار میں رہتی تھیں ۔ لیکن صحن میں آکر ان کی نظریں اعجاز پر پڑیں، اسے دیکھتے ہی وہ مادرانہ شفقت کے ساتھ آگے بڑھیں اور اسے کلیجہ سے لگا لیا ۔ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں ، کہنے لگیں :-

"میرے لال تو کہاں چلا گیا تھا ؟ تو نے روپوش ہو کر اپنے باپ کو نیم جان کر دیا ۔ تو آپا کے لئے ان سے خفا ہوا، لیکن یاد رکھ ! اگر تو نہ آتا ، اور خدانخواستہ بھائی صاحب کی آنکھیں بند ہو جاتیں ، تو ہرگز آپا تجھے معاف نہ کرتیں ، کیا تو بھول گیا ، وہ ان کی عزت و احترام کی کتنی تاکید کرتی رہتی تھیں تم بھائی بہن کو ——

اعجاز نے آشفتہ خیالی کے ساتھ یہ جواب دیا :-

سب یاد ہے خالہ اماں —— واقعی میں بڑا نالائق ہوں ۔ میں نے جو کچھ کیا اس پر حد درجہ نادم ہوں ۔ میں ابھی جاتا ہوں ، اور ان سے معافی مانگوں گا ۔ ان کے قدموں پر سر رکھ دوں گا ۔ جب تک وہ معاف نہیں کریں گے ، میرا جھکا ہوا سر نہیں اٹھے گا ؟

نادرہ نے ٹوکا ، " اچھا یہ باتیں پھر ہوتی رہیں گی ، دیر ہوتی جا رہی ہے ، چلتے ہو تو چلو ورنہ میں چلی ؟

تینوں ہسپتال روانہ ہو گئے، نسیم ابھی تک اسی جگہ کھڑی
لیکن گم سم، حیران اور ششدر،

---

(۶)

گو نادرہ جلدی آنے کا وعدہ کر گئی تھی لیکن اسے واپس آنے
میں کافی دیر لگی - اس عرصہ میں کئی مرتبہ نسیم نے اسے چائے کے لئے پکارا۔
گر وہ تھی کہاں جو کسی طرح کا جواب دیتی - شام کی چائے، وہی روز،
طراز، کلثوم اور نسیم کی خدمت میں پیش کیا کرتی تھی - جتنی جتنی دیر
ہوتی جا رہی تھی، ان لوگوں کا پارہ چڑھتا جا رہا تھا -
آخر نسیم ضبط نہ کر سکی، وہ اپنے کمرہ سے نکل کر سیدھی رابعہ
کے کمرے میں پہنچی، اور اس کے پیچھے پیچھے حسب ضرورت مدد کے لے
کلثوم!

نسیم نے پوچھا:-
"کیا وہ حرامزادی "نادرہ مر گئی"؟
رابعہ نے چونک کر اسے دیکھا اور جواب دیا، "اے خدا نہ کرے،

سر سے ٹکرائے گی؟

رابعہ نے ہنستے ہوئے کہا "ہاں اور کیا ان کا مزاج جانتی ہی ہے!"

مرتی کیوں ؛ کام سے گئی ہے آتی ہوگی

کلثوم نے آگے بڑھ کر مداخلت کی" آخر وہ کون سا کام ہے جس کے لئے وہ زمین کا گز بنی ہوئی ہے ؟"

رابعہ نے سادگی کے ساتھ سارا واقعہ بتا دیا۔ نسیم نے کہا :-

"ہسپتال میں پڑے ہیں، لیکن زبان کی چاٹ نے وہاں بھی ساتھ نہیں چھوڑا!"

رابعہ کو غصہ تو بہت آیا لیکن ضبط کر گئی، لیکن اتنا کہے بغیر نہ رہ سکی :-

"بیٹی، یہ تم اپنے تایا کو کہہ رہی ہو ———— وہ تمہارے باپ کے بڑے بھائی ہیں، اس لئے ان سے زیادہ احترام کے مستحق ہیں"

نسیم کچھ جھینپ سی گئی لیکن کلثوم نے اس کی پشت پناہی کرتے ہوئے کہا :-

"سچی بات جو ہوگی ضرور کہی جائے گی، چاہے کسی کے خلاف پڑے نہ جانے وہ موا ڈاکٹر کیسا ہے جس نے اس حالت میں کہ دم لبوں پر ہے کبیر چاٹنے کی اجازت دے دی!"

اب رابعہ ضبط نہ کر سکی، اس نے کہا، "شرم کرو کلثوم خدا سے ڈرو، ہر کوئی بیمار ہو سکتا ہے، ہر شخص پر یہ دن آ سکتے ہیں۔ آج وہ کل

ری باری ہے۔ ایسی باتیں منہ سے نہ نکالو جو خدا کو بری لگیں، کوئی
ں جانتا کہ کل کیا ہونے والا ہے، اتنی فرعونیت بھی اچھی نہیں ہوتی۔
یہ الفاظ بارود میں آگ ثابت ہوئے۔ کلثوم بھڑک اٹھی۔ کمر پر
رکھ کر کہنے لگی :-

"میں کہتی ہوں زبان سنبھال کے بات کر!"

رابعہ نے حقارت کی نظر سے اسے دیکھا اور بولی :-

"اب خیر سے تو نزاق پر اتر آئیں ——— زباں بگڑی تو بگڑی
تھی خبر لیجئے، دہن بگڑا۔"

کلثوم نے اور زیادہ درشت لہجہ میں جواب دیا :-

"آخر تو اپنی کھال میں کیوں نہیں رہتی۔ آخر تجھے حق کیا تھا ایسی
باتیں کرنے کا؟ کہنے سننے کا؟ گالیاں دینے کا؟ تو اپنے آپ کو سمجھتی کیا
ہے؟ بات اگر مردوں (احمد، راز) تک پہنچی تو ابھی آٹے دال کا بھاؤ معلوم
ہو جائے گا۔ ان کا غصہ بہت بُرا ہے۔ پھر وہ نہ میر کے نہ پیر کے۔"

رابعہ نے پوچھا "کیا کر لیں گے وہ؟"

کلثوم کے بجائے نسیم نے جواب دیا۔ "دن میں تارے نظر آجائیں گے
ان کا ہاتھ بڑی جلدی اُٹھتا ہے۔ اس دن نادرہ کو ایسی چار چوٹ کی
مار ماری تھی کہ ہفتوں یاد کی ہو گی۔"

"تو کیا مجھے بھی ماریں گے؟ مجھ پر بھی ہاتھ اٹھائیں گے!"

"نہیں ہر میجسٹی، ملکہ معظمہ کے ساتھ ایسی گستاخی کیسے سرزد ہو

سکتی ہے ان سے؟

یہ کہنے کے بعد وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی، لیکن اس ہنسی میں کتنی حقارت تھی۔ کتنی برہمی تھی، اسے رابعہ نے اچھی طرح محسوس کر لیا، اتنے میں کلثوم بولی:۔

"چاہے کوئی بھی ہو، ہم کسی سے نہیں ڈرتے"

رابعہ نے بڑے ٹھنڈے لہجہ میں جواب دیا۔

"لیکن میں ڈرتی ہوں!"

نسیم نے بناتے ہوئے پوچھا، ارے آپ بھی ڈرتی ہیں؟

وہ بولی: "ہاں ہر ننگ آدمی سے!"

(۷)

رابعہ کے یہ الفاظ سن کر کلثوم اور نسیم دونوں سناٹے میں آگئیں
ادیر تک گم سم کھڑی رہیں۔ پھر جب حواس بجا ہوئے تو کلثوم نے
ہا :-

" ہم ننگ ہیں ؟ ہم کمینے ہیں ؟ ہم رذیل ہیں ؟ ہم پچھے
یں ؟ "۔

جواب میں رابعہ نے کہا " تم خود بہتر جانتی ہو کہ کیا ہو ، ——
—— لیکن ، بی بی اب مجھے معاف کرو ، جاؤ اپنے کمرے میں بیٹھو ،
بر اسر خواہ مخواہ کیوں کھا رہی ہو ؟"
نسیم اچھل کر بولی :-
کیوں جائیں اپنے کمرے میں ؟ کیا یہ گھر ہمارا نہیں ہے ، ؟

ہمارے سوا اس کا مالک کون ہے ؟"

" مالک تو ہے ـــــــــــــــــــ میں نہیں ہوں، اور میں نے اس کا دعویٰ بھی نہیں کیا ؟"

کلثوم نے لقمہ دیا، " دعوے کروگی کس منہ سے؟ تمہاری حیثیت کیا ہے؟ بھائی صاحب (اتیانہ) کو دعا دو کہ انہوں نے ٹکڑوں سے لگا دیا لیکن بھائی ایسی روٹی پر جو لاج گنوا کر حاصل کی جائے تف ہے شریف عورت تو مر رہنا گوارا کرے گی لیکن اپنی لاج کا سودا نہیں کرے گی۔

نسیم ہنسنے لگی، پھر گویا ہوئی " وہ بھی اس عمر میں ـــــــ آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے "

اور یہ کہہ کر وہ پھر ہنس پڑی - ان باتوں نے رالعبہ کو حد درجہ برہم کر دیا - اس کا جی چاہا نسیم کا اور کلثوم کا منہ نوچ لے، لیکن اتیانہ بیمار تھا - ارشاد باہر تھا - زلیخا سپتال میں تھی - نادرہ موجود نہیں تھی - وہ تنہا تھی اور محسوس کر رہی تھی کہ اگر بات نے زیادہ طول کھینچا تو نوبت مار پیٹ تک پہنچ جائے گی، لہٰذا خون کا گھونٹ پی کر رہ گئی - کہنے لگی :-

" آج تو ایسا معلوم ہوتا ہے تم دونوں ماں بیٹی مار پیٹ کرنے کے لئے آئی ہو، لیکن سوچو تو سہی، شریف خاندانوں میں ایسا ہوتا ہے ؟"

"شریف؟ شریف کون ہے شریف؟ ——————
تم؟"

"میں نہیں تو نہ سہی تم تو ہو، تم تو شرافت کا پاس کرو۔"

ایک زہر خندہ کے ساتھ نسیم بولی، اسی لئے تو اب تک سر اور ہاتھ پاؤں سلامت ہیں۔ ورنہ کب کی خود بھی ہسپتال پہنچ چکی ہوتیں پھر وہاں مزے آتے جب دونوں ایک ساتھ جمع ہو جاتے ——————
زہائے گل پکارہ ہیں چلاؤں ہائے دل!

رابعہ نے بہت زیادہ نرم لہجہ میں کہا، بی بی واقعی میں بہت بری ہوں۔ معاف کر دو مجھے!

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ہانپتی کانپتی نادرہ دودھ لئے ہوئے آموجود ہوئی۔ نادرہ کو دیکھتے ہی نسیم اور کلثوم کا پارہ اور چڑھ گیا۔ پہلے کلثوم نے سوال کیا:—

"کیوں ری مردار کہاں تھی اب تک؟"

وہ بولی، بڑے صاحب کے لئے دودھ لینے گئی تھی۔ بڑی دور جانا پڑا سواری بھی کوئی نہیں ملی۔ پیدل گئی اور پیدل آگئی نہ جانے تانگے کہاں مر گئے سارے۔

نسیم نے قہر کی نگاہوں سے اسے گھورا، اور پھر اس سے

نظر آتا تھا یا اعزاز کا۔ لئیق نے اسے راہ پہ لانے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ مردم بیزاری اور خلوت نشینی کو چھوڑ نہ سکا۔ بہت جلد اسٹیشن ماسٹر صاحب مسٹر خلیق نے اس کی ذہنی کیفیت بھانپ لی کرید اور جستجو سے احتراز کیا۔ کبھی نہیں پوچھا تم اتنے مردم بیزار کیوں ہو؟ خلوت نشینی میں کیا لذت ملتی ہے؟ ہر شخص کو شک و شبہ کی نظر سے کیوں دیکھتے ہو؟ لیکن اپنے طور طریقوں سے اس کی اصلاح شروع کردی اور رفتہ رفتہ اسے اچھا آدمی بنا دیا۔ وہ یہ تو نہ کر سکے کہ اس کے دل سے باپ اور خاندان کی نفرت کھرچ سکتے اور شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اصل حالات سے لاعلم تھے لیکن اس کی وہ بھڑک نکال دی جس نے اسے مردم بیزار بنا دیا تھا۔

اور یہ خلیق صاحب ظاہر میں صرف اسٹیشن ماسٹر تھے انہیں دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ درحقیقت اتنے بلند پایہ انسان ہو سکتے ہیں ان کی آمدنی کا بڑا حصہ دوسرے لوگوں کی امداد و اعانت میں صرف ہو جاتا تھا۔ ہر روز لوگوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ یہ آیا وہ گیا اور اعجاز تو مستقل طور پہاں کا مہمان تھا، اس کا اور اس کی ضروریات کا وہ اتنا ہی خیال رکھتے تے جتنا لئیق کا اور اس کی ضروریات کا۔ اس نے بارہا چاہا کہ کہیں اٹھ جائے۔ یا کھانے پینے کا کسی اور جگہ بندوبست کر لے، یا بورڈنگ میں

منتقل ہو جائے کیونکہ اس کی غیبت گوارا نہیں کرتی تھی کہ مفت میں روٹیاں توڑتا رہے، لیکن خلیق صاحب کی باتوں میں جادو کا اثر تھا۔ انہوں نے اس طرح کی اس کی ہر تجویز ٹھکرا دی اور وہ نہ کوئی احتجاج کر سکا۔ نہ نافرمانی کی جرأت کر سکا۔ یہ ضرور تھا کہ اپنے طور پر اپنی خوشی سے بلکہ اور سے ان کے چھوٹے بچوں کو پڑھا دیا کرتا تھا۔ لیکن اس محنت کو اس احسان کا معاوضہ یا بدلہ سمجھنے پر وہ ہرگز تیار نہ تھا جس کی بارش متواتر اور مسلسل اس کے اوپر ہو رہی تھی!

خلیق صاحب نصیحت کا دفتر کھول کر نہیں بیٹھے تھے، کسی غلطی پر برا بھلا کہنا تو بڑی چیز ہے اس کو کچھ کہتے بھی نہیں تھے، لیکن اپنے عمل سے مثال ایسی پیش کرتے تھے کہ آدمی ایک طرف تو، ان کی بلندی کردار کا قائل ہو جاتا تھا۔ دوسری طرف خود اپنے دل کو ٹٹولنے پر مجبور ہو جایا کرتا تھا۔

زبان سے کچھ کہے بغیر ——— تلقین و نصیحت کے بغیر رفتہ رفتہ انہوں نے اس کی بہت سی خامیاں دور کر دیں اور سب سے بڑی یہ خامی دور کر دی کہ اب وہ اپنے دوستوں، ساتھیوں اور رفیقوں میں اجنبی اور نامانوس نہیں تھا، اب وہ ان سے بھڑکتا نہیں تھا۔ اب وہ انہیں شک و شبہ اور نفرت و بیزاری کی نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا،

اب اس میں خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی۔ عفو و درگزر کا جوہر آشکار ہونے لگا تھا۔ اب وہ لوگوں کی غلطیوں سے درگزر کرنا بھی سیکھتا جا رہا تھا۔ اور اس کیفیت نے اسے ایک نئی قسم کی مسرت عطا کی تھی۔ دل پہ ہر وقت جو ایک بوجھ سا رہتا تھا وہ اتر گیا تھا۔ ہر وقت جلن اور کڑھن کی جو کیفیت طاری رہتی، وہ جاتی رہی تو اب وہ دوسروں کے متعلق بہت کم سوچتا تھا۔ زیادہ تر اپنے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔

---

(۲)

اور یہ خلیق صاحب ؟

یہ خلیق صاحب واقعی عجیب وغریب شخص تھے، ان کے ظاہری
طریقے، وضع قطع، آداب وشمائل دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ شخص
بڑا پہنچا ہوا ہے - یہ ولی ہے اس کا شمار اہل اللہ میں ہونا چاہیئے - وہ
دنیا میں رہتے تھے - اور دنیاداروں کی سی زندگی بسر کرتے تھے، لیکن
ان کا دل واقعی ایک خدا رسیدہ شخص کا دل تھا - ایک پاک نہاد - پاک
سرشت اور پاک ضمیر شخص کا دل -

یہ خلیق صاحب، کسی کے بدخواہ نہیں تھے، کسی کی برائی میں شریک
نہیں تھے، کسی کا نقصان نہیں چاہتے تھے - یہ دشمنوں کے دوست
اور دوستوں کے فدائی - اعجاز ان کی زندگی میں یہ مناظر دیکھتا اور

خصوص طور پر متاثر ہُوا کرتا تھا، جب کبھی تنہائی میں اسے سوچنے کا موقع ملتا تو وہ خلیق صاحب کے بارے میں یہ سوچ سوچ کر محوِ حیرت ہو جاتا تھا کہ یہ شخص کس مٹی کا بنا ہے؟ اس کا دل ہمالیہ پہاڑ سے اونچا، سمندر سے زیادہ گہرا اور عالمِ کائنات سے زیادہ وسیع ہے اس کے مشرب میں کسی کو برا سمجھنا کفر ہے۔ اس کا مذہب یہ ہے سب کی بھلائی چاہو، ان کی بھلائی کے بھی جویا رہو، جو تمہیں اذیت دیں۔ دکھ پہنچائیں، درپے آزار ہوں۔

اور ایک روز تو ایسا واقعہ پیش آیا۔ جس نے اعجاز کی کائنات دل میں ایک تہلکہ اور زلزلہ برپا کر دیا۔ اس کا سر جو صرف اکڑنا جانتا تھا۔ جھکنا نہ جانتا تھا۔ ان کی بارگاہ میں جھک گیا۔ اس کا جی چاہا اس شخص کے قدموں پر سر رکھ دے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کا بندۂ بے دام بن جائے۔

جس طرح خلیق صاحب کا حلقۂ احباب وسیع تھا۔ اسی طرح ان کے خدا واسطے کے دشمنوں کی بھی کمی نہ تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جو ان سے ناجائز فائدے اٹھانا چاہتے تھے مگر انہیں مایوس ہونا پڑتا تھا۔ خلیق صاحب دوستوں اور واقف کاروں کے لئے کسی ذاتی ایثار سے دریغ نہیں کرتے تھے لیکن انصاف اور دیانت کے تقاضوں کے خلاف۔ وہ

اپنے لئے بھی، اپنی اولاد کے لئے بھی کچھ کرنے کو تیار نہیں تھے۔ ال
یہ خوبی جن لوگوں کو برائی نظر آتی تھی وہ دشمنی پر کمر باندھ لیتے
اور درپے آزار ہو جاتے تھے۔

انہی لوگوں میں ایک صاحب مسٹر اکرام بھی تھے۔ انہیں خلیق صا
کئی شکایتیں تھیں اور سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ انہوں نے ا
کے انتخاب میں اس امیدوار کو ووٹ نہیں دیا جس کے اکرام صاحب
مددگار بنے ہوئے تھے۔ یہ ایک سرمایہ دار شخص تھا اور ووٹ خ
ممبر بننے کا عادی تھا اس کی طرف سے اکرام نے خلیق صاحب ک
ووٹ بھی خریدنا چاہا۔ لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا۔

" میں ایسے شخص کو کس طرح ووٹ دے سکتا ہوں جسے قوم
زیادہ اپنی فکر ہے جو اپنی سربلندی کے لئے پارٹیاں بدلنے کا عادی
جو اپنے مفاد کی خاطر ملک اور قومی مفاد کو ہمیشہ ٹھکراتا رہا ہے۔ ج
مزدوروں کا خون چوستا ہے اور عوام کی جیب پر ڈاکہ ڈالتا ہے۔ ن
اکرام صاحب مجھے معاف کیجئے۔ میں ایسے شخص کو ووٹ دینا معصیت
سمجھتا ہوں۔ میں اسے ہرگز ووٹ نہیں دے سکتا!

اکرام نے ہر طرح خلیق صاحب کو راہِ راست پر لانے کی کوشش
کی، لالچ دیا ——— عہدے میں ترقی ہو جائے گی ———

اس کی مخالفت کروگے تو برخاست کروا دیئے جاؤ گے ——
تذبذب دفراز سمجھائے —— اپنا خیال نہیں کرتے تو اپنی اولاد کا خیال کرو —— لیکن زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد، خلیق کی نہیں چٹان کی طرح اپنی جگہ قائم رہی۔

وہ سرمایہ دار منتخب ہو گیا اور خلیق صاحب کی واقعی شامت آگئی۔ حکام بالا کو ان کے خلاف درخواستیں پہنچنے لگیں۔ ہینڈبل اور پوسٹر شائع کئے گئے۔ گمنام خطوط، وہ بھی نہایت گندے قسم کے ڈاک میں ڈالنے لگے۔ سب جانتے تھے یہ حرکت اکرام کی ہے، سب کا مشورہ تھا کہ اس کے خلاف ضروری کارروائی کی جائے، لیکن وہ ہنس کر ٹال جاتے تھے،

لیکن زمانہ بدلتے دیر نہیں لگتی۔ اکرام صاحب سے ان کے آقائے ولی نعمت کسی بات پر خفا ہو گئے۔ بات بہت معمولی تھی وہی "گاہے بہ سلامے برنجند دگاہے بہ دشنامے خلعت دہند" والی بات، لیکن اکرام صاحب کا روزگار چھن گیا۔ جو آمدنی ہوتی تھی وہ بند ہوگئی۔ جمع جتھا کچھ نہیں فاقے اٹھانے تک نوبت پہنچ گئی۔ دوستوں نے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ عزیزوں نے بات نہ پوچھی۔ جن مجلسوں میں وہ ہروقت جلوہ فرما رہتے تھے۔ اب وہاں کوئی ایک منٹ بٹھانے

کاروادار نہ تھا۔ مصیبت جب آتی ہے تو تنہا نہیں آتی۔ ایک
بے روزگاری کیا کم سوہان روح تھی ۔ دوسری طرف بیمار پڑے
ایسے کہ اب مرے اور اب مرے ۔ دوا علاج تک کے لئے ایک
پیسہ کے محتاج ہو گئے ۔

یہ اطلاع خلیق صاحب کو بھی مل گئی وہ فوراً عیادت کے
گئے اور اس طرح باتیں کرتے رہے، گویا کسی قسم کی کوئی تلخی تھی
نہیں ۔ گویا آپس میں کوئی اختلاف پیدا ہوا ہی نہیں تھا

خلیق صاحب بیٹھے تھے کہ اکرام صاحب کا لڑکا آیا اور اس نے
کہا :۔

" پاپولر میڈیکل ہال نے دوا دینے سے انکار کر دیا ہے ۔ وہ کہتے
ہیں پچھلے سوا دو سو روپے پہلے لے آؤ ۔ پھر نیا حساب چلے گا "

یہ سن کر اکرام کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ بے بسی کے ساتھ انہوں نے
آسمان کی طرف دیکھا، پھر آہستہ سے کہا :۔

" تو بیٹا نسخہ پھاڑ کر پھینک دو ——————

اور یہ کہتے کہتے آنسو کے دو بڑے بڑے قطرے آنکھوں سے ڈھلک کر
گال پر آ گرے ۔

خلیق صاحب اس منظر کی تاب نہ لا سکے ۔ انہوں نے لڑکے

ھ پکڑا اور کہا:-

"میرے پاپولر والوں سے تعلقات ہیں، چلو میں دلوائے دیتا ہوں۔"

خلیق صاحب کے پاپولر والوں سے کوئی تعلقات نہیں تھے، وہ اکرام کے لڑکے کو لے کر اپنے گھر آئے اور پانچسو روپے اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولے:-

"بیٹے یہ روپے لے جاؤ پاپولر والوں کا بل ادا کر دو، باقی رقم گھر کے کام میں لاؤ۔ اکرام سے کہہ دینا میں ان کا صرف دوست ہی نہیں بھائی بھی ہوں۔"

لڑکے نے ممنون نظروں سے خلیق کو دیکھا اور چلا گیا۔

جب تک اکرام صاحب زندہ رہے خلیق صاحب ہر مہینہ معقول رقم سے ان کی خدمت کرتے رہے اور جب مر گئے تو پچاس روپے مہینہ مستقل طور پر ان کی بیوی کو ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو ادا کرنے لگے۔

اس واقعہ کا علم کسی کو نہیں تھا۔ گھر والوں کو بھی نہیں۔ اتفاق کی بات اکرام کے لڑکے سے ایک مرتبہ کہیں اعجاز کی ملاقات کسی تقریب میں ہو گئی۔ باتوں باتوں میں اس نے اعجاز سے پوچھا:-

"آپ کا قیام کہاں ہے؟ —— کیا بورڈنگ میں؟"

اعجاز نے بتایا "میں خلیق صاحب کے ہاں رہتا ہوں۔"
وہ کہنے لگا "خلیق صاحب؟ — یعنی اسٹیشن ماسٹر صاحب"
اعجاز نے اثبات میں جواب دیا۔ پھر جو اس نے خلیق صاحب کی تعریفوں کے پل باندھے ہیں تو لطف آگیا اعجاز کو، اس نے کہا۔
"آپ تو ان کی شان میں شاعری کر رہے ہیں!"
وہ جذباتی لہجہ میں گویا ہوا:—
"اعجاز صاحب میں کہتا ہوں خلیق صاحب انسان نہیں فرشتہ ہیں —— ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو ہماری مصیبت پر خوش ہوتا۔ ہنستا، لیکن انہوں نے ہمارے ساتھ وہ سلوک کیا جو ہمارے عزیزوں نے بھی نہیں کیا۔"
اور پھر اس نے ساری کہانی سنادی۔

---

(۴)

اعجاز کو کرکٹ سے بہت دلچسپی تھی۔ بس یہی ایک ایسی چیز تھی جس میں وہ پوری دلچسپی سے حصہ لیتا تھا۔ یہ اس کی تفریح بھی تھی، اور ورزش بھی!

ایک مرتبہ گورنمنٹ کالج کی ٹیم کا ایک دوسرے کالج کی ٹیم سے مقابلہ تھا۔ اعجاز نے بھی اس میچ میں حصہ لیا اور خوب خوب رن بنائے۔

لیکن کھیل ختم ہونے سے ذرا پہلے حریف مقابل کا پھینکا ہوا گیند پوری قوت اور شدت کے ساتھ اس کے ماتھے پر آ کر لگا۔ خون جاری ہوگیا۔ آدمی جی دار اور باہمت تھا۔ ضبط کرتا رہا اور پٹی باندھ کر . . . . . . . . . . . . ۔ ساتھیوں اور کپتان کے منع

کرنے کے باوجود پھر کھیل میں شریک ہو گیا

گورنمنٹ کالج کی ٹیم نے مخالف ٹیم کو شکست فاش دی۔ اس کارنامے میں اعجاز کا حصہ سب سے زیادہ تھا۔ مبارکباد اور تحسین و تعریف کا غلغلہ برپا ہو گیا۔

گھر پہنچا تو ماتھے پر پٹی بندھی دیکھ کر خلیق صاحب نے پوچھا:۔

"بیٹے یہ کیا ——— ؟"

خلیق نے ٹالتے ہوئے کہا "جی کچھ نہیں، آج میچ میں کھیلتے وقت ذرا چوٹ آگئی تھی۔"

خلیق صاحب نے پٹی کھول کر دیکھی تو اچھا خاصا زخم تھا اور اس سے اب تک خون رس رہا تھا۔ نبض پر ہاتھ رکھا تو تیز اور بخار موجود،

اسی وقت ڈاکٹر بلایا گیا۔ اس نے مرہم پٹی کی، انجکشن لگایا۔ نسخہ لکھا اور چلا گیا، خلیق صاحب نے پوچھا:۔

"تشویش کی تو کوئی بات نہیں ہے؟"

ڈاکٹر نے اطمینان دلایا "نہیں تشویش کی کیا بات ہوتی۔ صبح تک ٹھیک ہو جائیں گے۔"

لیکن جب صبح ہوئی تو معلوم ہوا بخار ۱۰۵ سے زیادہ ہے اور

اعجاز پر ہذیانی کیفیت طاری ہے۔
خلیق صاحب نے فوراً اسے ہسپتال پہنچایا۔ یہاں کئی ڈاکٹر ایسے تھے جو ان سے واقف تھے اور ان کی عزت کرتے تھے۔ سب نے بڑی توجہ سے اس کا معائنہ کیا۔ ڈاکٹر ظفر الحسن نے کہا :-
خون کافی نکل گیا ہے، اور کچھ سمیّت بھی پیدا ہو گئی ہے۔ آپ نے یہاں لانے میں دیر کی۔ جیسے ہی مریض زخمی ہوا تھا فوراً لانا چاہیئے تھا۔ مریض کو نئے خون کی ضرورت ہے ——
دیکھئے ہم ٹسٹ کرتے ہیں ؟
ٹسٹ کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو خون درکار تھا وہ موجود نہیں تھا باپ کا ارشاد پا کر لئیق نے اپنے آپ کو پیش کیا۔ لیکن اس کا خون مریض کے لئے بیکار تھا۔ اور مریض کی حالت دم بدم نازک ہوتی جا رہی تھی۔ آخر خلیق صاحب نے اپنا بازو آگے کر دیا۔
"ذرا دیکھئے تو سہی!"
خلیق صاحب کا خون لیا گیا اور وہ وہی تھا جس کی ضرورت تھی۔ لیکن ڈاکٹر ظفر الحسن نے کہا :-
"آپ ویسے ہی بوڑھے اور کمزور ہیں، آپ کا خون لینا مناسب

نہیں ؟

خلیق صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا :-

"ڈاکٹر صاحب آپ بھی کیا باتیں کرتے ہیں ، بوڑھے زندہ رہیں اور جوان مر جائیں - کوئی تک ہے یہ ؟ ——— اور آپ مجھے بڈھا کیوں سمجھتے ہیں ؟ میں تو اپنے آپ کو جوانوں سے زیادہ ہٹا کٹا اور توانا محسوس کرتا ہوں ——— دیر نہ کیجیے - جتنا خون درکار ہو فوراً لے لیجئے"

خلیق صاحب کا خون لیا گیا اور انجیکشن کے ذریعہ مریض کے جسم میں داخل کر دیا گیا - اس کا حیرت انگیز اثر ہوا - اس کی توانائی فوراً عود کر آئی اور ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا :-

"اب کوئی خطرہ نہیں مریض تندرست ہو جائے گا" ———

---

اعجاز تو واقعی چند روز ہسپتال میں لوٹ پوٹ کر خیریت کے ساتھ واپس آگیا ، لیکن خلیق صاحب کافی خون نکلوا دینے کے باعث امراض گوناگوں میں مبتلا ہو گئے اور کئی ہفتے تک صاحب فراش رہے

اعجاز کو جب یہ واقعہ معلوم ہوا تو اس نے زبان سے تو کچھ نہ کہا۔ لیکن ایک مرتبہ پھر وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا، یہ شخص آدمی ہے یا فرشتہ۔

## (۵)

اب وہ صحت یاب ہوگیا تھا، لیکن کمزوری ابھی باقی تھی
ایک روز خلیق نے اس سے اصرار کیا۔

جاؤ ڈاکٹر ظفر الحسن سے ایک مرتبہ پھر معائنہ کرالو، کافی کمزوری معلوم ہوتی ہے وہ کوئی ٹانک لکھ دیں گے،

حکومت اور کالج کی طرف سے جو وظیفہ ملتا تھا وہ سب کا سب بچ جاتا تھا۔ یہ خلیق صاحب اسے اپنے پاس سے کچھ بھی تو خرچ نہیں کرنے دیتے تھے۔ حد یہ ہے کہ دوا علاج اور ملبوسات تک کے تمام مصارف وہی برداشت کرتے تھے۔ اعجاز غیور اور خوددار قسم کا نوجوان تھا۔ اس کی طبع حساس ان عنایتوں پر کڑھتی تھی لیکن خلیق صاحب کے اصرار میں اور ارشاد میں کچھ ایسی قوت پنہاں ہوتی تھی کہ اسے خاموش

ہو جانا پڑتا تھا۔ یہی کیفیت اس وقت بھی ہوئی، اس کا جی چاہتا تھا کہ کم از کم دوا علاج کے مصارف خود برداشت کرے، لیکن خلیق صاحب کے سامنے اس کی کیا چل سکتی تھی؟ ایک بے بس معمول کی طرح ڈاکٹر صاحب کے مطب میں پہنچ گیا۔

اتفاق سے اس وقت ڈاکٹر صاحب کچھ فارغ تھے۔ مریضوں کا ہجوم چھٹ چکا تھا۔ اعجاز کو دیکھتے ہی بڑے اخلاق اور تپاک سے گویا ہوئے:-

"آؤ میاں اعجاز ——— کہو کیا حال ہے؟"

وہ ڈاکٹر صاحب کے قریب بیٹھ گیا اور کہنے لگا

"میں تو اچھا ہوں، لیکن بابا ——— گھر کے سب لوگ خلیق کو بابا کہتے تھے ——— کا خیال ہے، کمزور ہوں، انہوں نے کہا ہے کہ آپ سے کوئی ٹانک لکھا لاؤں۔

ڈاکٹر صاحب زور سے ہنس پڑے، پھر فرمایا:-

خیر ٹانک لکھے دیتا ہوں، ویسے اب تم اچھے ہو، لیکن میاں شکر کرو کہ بچ گئے۔ غضب خدا کا اتنا بڑا زخم، اتنی زیادہ مقدار میں جریان خون، اور آپ اس کے بعد بھی پٹی باندھ کر کھیلنے لگے، اور ساری رات یوں ہی گزار دی، اگر خون نہ بند ہو جاتا، تو گئے تھے تم،

ڈاکٹر صاحب کی صداقت کا اعجاز کو یقین تھا، کہنے لگا:-

"بجا ارشاد ہوا ——— اور یہ خون بھی بابا ہی نے دیا"

ڈاکٹر صاحب اس وقت موج میں تھے، فرمایا:-

"بھئی یہ پیر مرد جسے تم بابا کہتے ہو عجیب شخص ہے، دوسروں کے لئے اپنی جان قربان کرنے کو ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔ اس عمر میں اتنا کافی خون ہنستے ہنستے اور مسکراتے مسکراتے نکلوا دینا اسی کا کام تھا!"

جی بیشک ——— ان کا بہ اتنا بڑا احسان ہے کہ میں ساری زندگی ———

"ہاں تم ساری زندگی نہیں بھولو گے، لیکن میاں صاحبزادے خلیق کے ممنون احسان صرف تم ہی نہیں ہو، نہ جانے کس کس پر اس نے احسان کیا ہے، خاموشی سے چپ چپاتے، اس طرح کہ شاید خود اپنے کو بھی خبر نہیں ہونے دی ——— اور یہ سلوک صرف دوستوں اور عزیزوں ہی کے ساتھ نہیں ہے، سب کے ساتھ ہے، اس میں نہ دوست کا سوال ہے، نہ دشمن کا، نہ

کا، نہ غیر کا۔

اور پھر جیسے کچھ یاد آگیا، کہنے لگے:۔

تمہیں ایک واقعہ سناؤں؟ ———— سنو گے؟ یقین

وگے؟"

————

حنیف اسٹیشنری اینڈ جنرل اسٹور
دوکان نمبر ۷۹/۸ رحمانیہ مسجد لیاقت آباد کراچی

(۶)

اعجاز اپنے جذبۂ اشتیاق کو دبا نہ سکا، کہنے لگا :-

"ضرور فرمائیے، اور یقین کیوں نہ کروں گا، بھلا آپ غلط بیانی کر سکتے ہیں ؟"

ڈاکٹر صاحب پان کے بہت شوقین تھے، ایک خوبصورت سی ڈبیہ میں لکھنوی قسم کے بیڑے ہر وقت کافی تعداد میں موجود رہتے۔ ایک بیڑا اٹھا کر منہ میں رکھا، پھر فرمایا :-

"بہت دنوں کی بات ہے، آج سے ۳۰، ۳۵ برس پہلے کی بات

——— یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا ———

جی چاہا بمبئی کی سیر کریں ۔ جسے بجا طور پر عروس البلاد کہا جا سکتا ہے گئے اور ایک اوسط درجے کے ہوٹل میں ٹھہر گئے ۔ صبح ناشتہ کر کے نکلے اور رات کو گھوم گھام کر کبھی گیارہ بجے آئے، کبھی بارہ بجے، کبھی اس

اس کے بعد بھی ۔
خوب اچھی طرح سارے شہر کی سیر کر ڈالی ۔ کوئی گوشہ اور کونہ ایسا نہیں تھا جو ہماری نظر سے رہ گیا ہو گا ۔ تاج محل ہوٹل دیکھا بینڈ اسٹینڈ دیکھا ۔ چوپاٹی کی سیر کی ۔ اپالو بندر کا نظارہ کیا ۔ جامع مسجد دیکھی ، یونیورسٹی اور کالج دیکھے ۔ ہائی کورٹ کی شاندار عمارت دیکھی " کالا گھوڑا " دیکھا ۔ عجائب خانہ کے نوادرات دیکھے ۔ مالا بار ہل کا دیدار کیا ۔ ماہم میں حضرت مخدوم صاحب کی درگاہ کی زیارت کی ، لوگوں سے ملے ، ان کے طور طریقے دیکھے ۔ میمن اپنے رنگ میں فرد ، خوجے اپنا جواب آپ ۔ بوہروں کی انفرادیت ہر چیز سے عیاں ۔ مرہٹوں کا کیا کہنا ۔ سب سے الگ اور سب سے ممتاز ۔ گجراتیوں کا سبھاؤ اور انداز ایک مخصوص شان دلفریبی کا حامل ، اور پارسی ؛ ——— ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں ———

ڈاکٹر صاحب اس وقت ترنگ میں تھے ، جیسے ان کی روٹھی ہوئی جوانی واپس آگئی تھی ۔ جیسے ماضی حال بن گیا تھا اور وہ آج سے ۳۵ برس پہلے کی دنیا میں پہنچ گئے ، کچھ دیر خاموش رہے ، پھر کہنے لگے :۔

اب بمبئی سے واپسی کا پروگرام بنا ، جس روز ہم جانے والے تھے ، اس سے ایک دن پہلے ایک دوست نے کہا :۔

ویسے سب کچھ دیکھ لیا تم لوگوں نے مگر ——— جوہو نہیں دیکھا ۔

ہم دونوں بالکل نہیں جانتے تھے جوہو کیا بلا ہے ۔ خلیق نے کہا

بہت کچھ دیکھ لیا، اب کچھ نہیں دیکھنا ہے"!

ان دوست کا اصرار قائم رہا۔ کہنے لگے،

"اگر جو ہو نہ دیکھا، تو کیا دیکھا؟ —— تف ہے تمہارے شوقِ سیاحت پر!"

مجھے لہر آئی۔ میں نے کہا:۔

"خلیق —— جو ہو دیکھیں گے اور ضرور دیکھیں گے"!

بے چارہ دوست آدمی ٹھہرا، مان گیا، کہنے لگا:۔

اچھا صاحب دیکھیں گے اور ضرور دیکھیں گے —— لیکن کل یہاں سے بہرحال روانہ ہو جانا ہے"!

—— پھر تو ہم لوگوں نے ایک ٹیکسی پکڑی اور جو ہو روانہ ہو گئے۔

اعجاز میاں تمہیں کیا بتاؤں، جو ہو کیا چیز ہے؟

حدِ نگاہ تک پھیلتا۔ سر ٹکراتا اور شور مچاتا سمندر لہریں لیتا نظر آتا ہے۔ سمندر کے کنارے ایک بہت بڑا ریت کا میدان ہے، جہاں لوگ سیر و تفریح کرتے رہتے ہیں۔ میدان کے پاس بہت بڑے بڑے کھجور اور ناریل کے درخت اور جھنڈ ہیں۔ یہاں الگ الگ لیکن تمام ضروریات سے بھرپور "کاٹیج" بنی ہوئی ہیں۔ اگر کوئی شخص یا پارٹی رات گزارنا چاہے۔ چاندنی رات میں سمندر کا نظارہ کرنا چاہے تو اس دلکش خاموش کے چھوٹے بڑے حسب ضرورت جیسے چاہے کاٹیج کرایہ پر لے لے

اور اطمینان سے جتنی دیر یا جتنے دن چاہے رہے۔

اس مقام کی سحر طرازی نے ہم لوگوں پر جادو کر دیا۔ جب پہنچے تھے تو سورج چمک رہا تھا لیکن سورج غروب بھی ہو گیا، لیکن ہمیں پتہ تک نہیں چلا۔

ہم لوگ ریت کے فرش پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور سمندر کا نظارہ کر رہے تھے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر دوسری ٹکڑیاں بھی بیٹھی تھیں، اور گپ شپ میں مصروف تھیں بعض من چلے مرد اور عورت ایسے تھے کہ سمندر میں تیرنے کی مشق کر رہے تھے،

ہم لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ دفعتہً ایک دلدوز چیخ کانوں میں آئی۔

"ہائے میرا بچہ"

اور پھر وہ چیخ گریہ و زاری میں تبدیل ہو گئی

آس پاس کے لوگ دوڑ دوڑ کر موقعۂ واردات پر پہنچے۔ ہم بھی لپکتے ہوئے اسی طرف گئے اور یہ دیکھ کر دل ہل گیا۔ کہ ایک ۹ - ۱۰ برس کا بچہ ڈبکیاں کھا رہا ہے اور سمندر کی تند و سرکش موجیں اسے اپنے ساتھ کھینچے لئے جا رہی ہیں:

حاضرین میں ہندو مسلم عیسائی پارسی جوان، بوڑھے، مرد عورت سب ہی موجود تھے لیکن کسی کو ہمت نہیں پڑی کہ سمندر میں چھلانگ لگا دے۔

خلیق سوٹ بوٹ سے آراستہ ایک فیشن ایبل نوجوان تھا، وہ بھی اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔

اور دفعتہً وہ بجلی کی طرح ہمارے غول سے نکلا، اور ایک مرتبہ جھپاک سے سمندر میں۔ حاضرین نے جوشِ تحسین سے بے قابو ہو کر تالیاں پیٹیں۔ کچھ لوگوں نے نعرے لگائے، بعض نے افسوس کیا کہ یہ نوجوان بھی ڈوبا۔ بچہ کو لہریں کافی دور تک بہا لے گئی تھیں۔ اس کے پہنچتے پہنچتے وہ تو سمندر میں ہو گا اور پھر کوٹ، پتلون اور جوتا پہن کر جو شخص سمندر میں کودے گا، خود اس کی جان کے لالے پڑ جائیں گے، کسی اور کو کیا بچا سکے گا۔؟

امید و بیم، اضطراب، اضطرار، حسرت و افسوس اور حیرت و استعجاب کی ملی جلی کیفیات کے ساتھ ہم لوگ انجام دیکھنے کے منتظر کھڑے تھے، لیکن وہ خدا کا بندہ مچھلی کی طرح تیرتا ہوا چشم زدن میں ڈوبتے ہوئے بچہ کے پاس پہنچ گیا اور اسے ایک ہاتھ پر اونچا اٹھا لیا اور پھر تیرتا ہوا واپس ساحل پر آ گیا۔ اگر اسے ایک منٹ اور تیرنا پڑتا تو ضرور غرقِ آب ہو جاتا۔ اس کا سانس اکھڑ چکا تھا۔ پانی میں بھیگ کر سوٹ اتنا وزنی ہو گیا تھا کہ اس کا سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ جب وہ ساحل پر ہانپتا کانپتا، لڑکھڑاتا پہنچا تو ماں دوڑی اور اس نے اپنے بچہ کو لے لیا اور دوسرے لوگوں نے لپک کر خلیق کو ہاتھوں ہاتھ خشکی پر پہنچایا۔ ہر طرف سے تحسین و آفرین کے ڈونگرے برس رہے تھے، اور

اور لڑکے کی ماں کا تو یہ حال تھا کہ صدقے قربان ہوئی جارہی تھی - مگر آپ یعنی ہمارے خلیق صاحب اس طرح شرما رہے تھے، جیسے انہوں نے کوئی کارنامہ نہیں انجام دیا ہے کوئی جرم سرزد ہو گیا ہے ان ذات شریف سے!

خیر جوں توں کر کے ہم لوگ جو ہو سے اپنے ہوٹل واپس پہنچے - ٹیکسی جب اپنے ہوٹل کے دروازے پر پہنچی تو خلیق صاحب خود نہیں اُترے، اتارے گئے - کیونکہ بیہوش ہو چکے تھے اور وہ بھیگا ہوا سوٹ اب تک زیب جسم تھا -

اسی حالت میں ہم لوگ انہیں لے کر جے جے ہسپتال پہنچے - وہاں علاج معالجہ شروع ہوا - ہسپتال جب پہنچے ہیں تو ڈبل نمونیہ ہو چکا تھا لیکن وہ تو کہیئے، ڈاکٹر انچارج شریف اور ہمدرد شخص تھا، اس نے پوری توجہ اور یکسوئی کے ساتھ علاج کیا اور کوئی دو ہفتہ کے بعد حضرت اس قابل ہوئے کہ سفر کر سکیں -

اچھے ہو کر جب ہوٹل واپس آئے تو میں نے پوچھا :-

" یہ کیا حماقت تھی ؟"

مسکرانے لگے اور فرمایا " حماقت تو تھی لیکن اس حماقت نے مجھے مرنے سے بچا لیا !"

میں نے سراپا حیرت بن کر دریافت کیا۔

" تم مرتے مرتے بچے، یا مرنے سے بچ گئے ؟

کہنے لگے، "اگر وہ لڑکا میری آنکھوں کے سامنے ڈوب جاتا تو
زندگی بھر میں اپنے خدا اور اپنے ضمیر سے شرمندہ رہتا، اور یہ شرمندگی
موت سے بدتر ہوتی۔

"میں نے جل کر پوچھا۔ "اگر تم اسے بچاتے ہوئے خود ڈوب جاتے
تو کیا ہوتا؟ ——— تمہاری بیوی کیا کرتی؟ تمہارے بچے
کیا کرتے؟ پھر تم اپنے ضمیر اور اپنے خدا کو کیا جواب دیتے؟
——— یہ تو خودکشی تھی جو تم کر رہے تھے"

کمزور سی ہنسی ہنستے ہوئے فرمایا:۔

"تم غلط کہتے ہو، کسی کی جان بچاتے ہوئے مرجانا خودکشی
نہیں، حیات جاوید ہے۔ میں ڈوب کر حیات جاوید پالیتا۔ رہی
میری بیوی، رہے میرے بچے ———"

میں نے جوش و خروش کے ساتھ پوچھا:۔

"ہاں بتاؤ، ان کا کیا حشر ہوتا؟"

نہایت اطمینان اور سادگی کے ساتھ جواب دیا۔

"اگر اس وقت مرجاؤں تو یہ لوگ کیا کریں گے؟"

میں نے کہا "کچھ پاگل ہوئے ہو؟ اس وقت کیوں مرنے
لگے ہو؟"

بڑے عارفانہ انداز میں فرمایا:۔ "موت ہی تو ایسی چیز ہے جو ہر وقت
آسکتی ہے۔ کیا تم سے باتیں کرتے کرتے میرا ہارٹ نہیں فیل ہوسکتا؟

یا اس کمرہ کی چھت نہیں گر سکتی ؟ جس ٹیکسی میں ہم جائیں گے ، وہ کسی چیز سے ٹکرا نہیں سکتی ؟ جس ریل میں ہم سفر کریں گے ، وہ کسی حادثہ کا شکار نہیں ہو سکتی ؟ ——— موت سے کہیں چھٹکارہ ہو سکتا ہے ؟ وہ تو ہر وقت ہمارے ساتھ ہے ، اس سے کون بھاگ سکتا ہے ؟ کون پناہ پا سکتا ہے ؟"

یہ باتیں سن کر میں تو دنگ رہ گیا ۔ میں نے کہا :۔

"لائیے پیر و مرشد ہاتھ بڑھائیے تاکہ یہ ذرہ بے مقدار بیعت کر لے!"

میں نے یہ بات بظاہر مذاق میں کی تھی ، لیکن درحقیقت یہ میرے دل کی آواز تھی ۔

خلیق کی ان باتوں نے میری آنکھیں کھول دیں ۔ ہمارے دوستی کی عمر بچپن سے شروع ہوتی ہے لیکن اس واقعہ کے بعد میں اس کا صرف دوست ہی نہیں رہ گیا ۔ اس کا پرستار اور عقیدت مند بن گیا اور ایک بات کہوں ——— ؟"

اعجاز جو محویت سے ڈاکٹر صاحب کی باتیں سن رہا تھا ، کہنے لگا ،

"ضرور فرمائیے ——— یہ باتیں تو مجلسِ وعظ سے زیادہ سبق آموز ہیں ۔"

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا " اس دن سے خود میری زندگی کا رُخ بدل گیا!"

اعجاز نے سوال کیا " آپ کی زندگی کا رُخ کیا بدلا ؟"

وہ کہنے لگے " میں بڑا شقی انسان تھا ، کسی مریض کے ساتھ خواہ وہ

کتنا ہی مستحق ہمدردی کیوں نہ ہو، ذرا رعایت نہیں کرتا تھا۔

لیکن اس واقعہ کے بعد میں نے سمجھ لیا کہ انسان کی زندگی کتنی قیمتی ہوتی ہے۔ اور اس قیمتی اور گراں مایہ چیز کی حفاظت کے لئے اپنی جان کو بھی خطرہ میں ڈال دینا، کتنی بڑی سعادت ہے ــــــــ

اور پھر دفعتہً ڈاکٹر صاحب نے قلم اٹھایا اور ایک مختصر سا نسخہ لکھ کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:۔

"اللہ شفا دے گا، جاؤ!"

---

(۷)

ڈاکٹر صاحب نے جو نسخہ لکھا تھا - یہ صرف کمزوری بدن کا مداوا تھا - دل کے روگ کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن اعجاز جب یہاں سے اٹھا تو اس کی بیماری دل کافور ہو چکی تھی - کمزوری بدن کے دور ہونے میں کئی دن لگے ، ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا رُخ خلیق کے ایک کارنامہ نے بدلا تھا اور اعجاز کی زندگی کا رُخ ڈاکٹر صاحب کی باتوں نے بدل کر رکھ دیا .

وہ گھر پہنچا تو خلیق صاحب اس کے منتظر تھے ،

" کیوں بیٹا نسخہ لکھا لائے ؟"

اعجاز نے نسخہ سامنے رکھ دیا - انہوں نے اپنی جیب میں رکھ لیا کہ شام کو ڈیوٹی سے فارغ ہو کر جب تشریف لائیں گے ، تو لیتے آئیں گے ،

پھر پوچھا :-

"لیکن بہت دیر لگ گئی تمہیں ؟"

وہ گویا ہوا "کچھ انہوں نے پرانے قصے چھیڑ دیئے تھے ۔"

"پرانے قصے ؟"

"جی ہاں ، بمبئی کی سیر، جو ہو کی تفریح، وہاں ایک لڑکے کو سمندر کی لہروں کا بہا لے جانا، اس کی ماں کی صدائے دل فگار، اور آپ کا سوٹ اور جوتوں سمیت سمندر میں چھلانگ لگا دینا ، خود ڈوبتے ڈوبتے بچنا ، لیکن بچہ کو بچا لینا - پھر نمونیہ میں مبتلا ہو جانا - پھر ہسپتال میں داخلہ دو ہفتہ کے بعد، ———"

خلیق صاحب نے ایک قہقہہ لگایا ، پھر کہنے لگے :

"بھئی یہ ڈاکٹر بڑا باتونی ہے ؟"

اعجاز نے ڈرتے ڈرتے کہا :-

"لیکن ان کی باتیں کتنی سچی اور کتنی اچھی ہوتی ہیں - ان باتوں سے میں نے بڑا سبق لیا ہے ———"

خلیق صاحب نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا :-

"لیکن سبق تو ڈاکٹر صاحب سے لینا چاہیئے !"

اعجاز چونک پڑا "میں نہیں سمجھا آپ کا مطلب ؟"

خلیق صاحب نے فرمایا "میری بیماری کے زمانہ میں جس طرح تیمارداری کا حق ادا کیا ، جس طرح رات بھر جاگا اور اپنی ملازمت کو

خطرے میں ڈال کر میری پٹی سے چمٹا رہا ۔ کیا یہ ایثار اور خدمت کی انتہا نہیں ہے ؟

اعجاز سمجھ گیا، خلیق صاحب اپنے کارنامے کو ماند کرنے کے لئے ڈاکٹر صاحب کا کارنامہ اچھال رہے ہیں۔ اس نے کہا

"بجا ارشاد فرمایا، لیکن ——"

خلیق صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور جاتے جاتے فرمایا :-

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ تم نہیں جانتے۔ ڈاکٹر بہت بڑا آدمی ہے - سراپا ایثار، سراپا خلوص۔ میں نے تو جو کچھ کیا، جذبے کی حالت میں کیا۔ ماں کی چیخ اور بچہ کی حالت دیکھ کر ضبط نہ کر سکا۔ میری جگہ دشمن ہوتا، یہی کرتا۔ ——"

"لیکن ڈاکٹر صاحب تو آپ کے ساتھ ہی تھے؟"

خلیق صاحب نے پھر ایک قہقہہ لگایا اور فرمایا :-

"اب تم مجھ سے بحث کرنے لگے —— بیٹے تم نہیں جانتے اس کی بڑائی۔ مجھ سے پوچھو، میرے دل سے پوچھو۔"

یہ کہتے ہوئے خلیق صاحب باہر نکلے، اور چلے گئے، اور ان کے جانے کے بعد اعجاز بڑی دیر تک گم سم بیٹھا رہا۔ پھر اس نے سوچا، اچھے اور بڑے آدمی کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ خود پیچھے رہتا ہے اور دوسروں کو آگے بڑھاتا ہے، اور اپنے کام کا اجر

تعریف و توصیف کی صورت میں بندوں سے نہیں لینا چاہتا، خدا سے لینا چاہتا ہے۔

اتنے میں لئیق آگیا، اس نے کہا :-

مراقبہ میں کیوں بیٹھے ہو ؟ کیا کالج نہیں جانا ہے آج ؟

---

حصہ نہم

# دردِ لادوا

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

## (۱۰

ھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آنے والے حادثہ کا مبہم سا احساس ہو
ے ۔ زلیخا نے صفدر کے اہل خاندان کے آنے کی خبر سن کر محسوس
تھا کہ اب اس کی شامت اور زیادہ آئے گی، اب اسے اور
ولتوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا ۔ نادرہ نے لاکھ لاکھ
لایا کہ ایسا نہیں ہوگا لیکن اس کے دل پہ جو دہشت چھا گئی
وہ بدستور قائم رہی اور یہ دہشت اس دن اور بڑھ گئی جب
کا تبادلہ دفعتہً بیگم کوٹ کا ہو گیا ۔ اس نے افسران بالا سے
راصرار میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا ۔ اپنی خانگی مصیبتیں اور دشواریاں
لیں ۔ مگر سب کا جواب ایک ہی تھا

حکم کی تعمیل کرو، مہینہ دو مہینہ کے بعد تمہیں پھر یہاں واپس
یا جائے گا ۔

جاتے وقت امتیاز نے زلیخا کو بلایا اور کہا :-

بیٹی- میرا تبادلہ بیگم کوٹ کا ہو گیا ہے اور میں آج ہی جانے پر مجبور ہوں، افسرانِ بالا نے وعدہ کیا ہے کہ مہینہ دو مہینہ میں مجھے پھر یہاں بھیج دیں گے اور اگر انہوں نے وعدہ پورا نہ کیا، تو میں اس نوکری سے استعفیٰ دے کر چلا آؤں گا :- ——————

زلیخا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہاں اس کی آنکھیں ضرور ڈبڈبا آئیں۔

امتیاز نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا :-

"شاید تو کلثوم اور نسیم وغیرہ سے خائف ہے —————— میرے بچے یہ لوگ تجھے پریشان نہیں کریں گے۔ میں کلثوم کو بھی سمجھائے دیتا ہوں اور اگر کوئی بات تیری طبیعت پر گراں گزرے تو ایک خط ڈال دینا۔ میں دو مہینے کا انتظار نہیں کروں گا اور واپس چلا آؤں گا"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ کلثوم خود کسی کام سے ادھر آگئی۔ امتیاز نے اس موقعہ سے اٹھاتے ہوئے کہا :-

"کلثوم میں آج بیگم کوٹ جا رہا ہوں"

وہ بولی "ہاں بھائی صاحب یہی سن کر تو میں آئی تھی۔ آخر آپ کا تبادلہ وہاں کیوں کر دیا گیا؟ —————— نہ جانیے اتنی تو رونق ہے آپ کی وجہ سے گھر میں!"

دونوں باتیں جھوٹ، نہ وہ یہ چاہتی ہے کہ امتیاز نہ جائے، نہ اس

کے وجود سے وہ کوئی رونق محسوس کرتی ہے ـــــــ زلیخا نے دل ہی دل میں کہا!۔

امتیاز کو اس وقت بہت جلدی تھی۔ پہلی ٹرین سے روانہ ہونا تھا۔ لہٰذا وہ رسمی باتوں کے لئے تیار نہ تھا۔ اس نے کہا:۔

"بہر حال میں جا رہا ہوں۔ ـــــــ زلیخا یہیں رہے گی۔"

کلثوم نے کہا ۔" وہ یہاں نہیں رہے گی تو کہاں جائے گی۔"

"یوں تو میں نے بھی اس کا کبھی خیال نہیں رکھا۔ لیکن میری موجودگی سے بہر حال اسے ڈھارس تو تھی۔ مجھے امید ہے تم اس کا خیال رکھو گی۔"

"بھائی صاحب آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ یہی باتیں دل میں گھاؤ ڈال دیتی ہیں۔"

"ارے یہ کیوں؟"

آپ کہیں گے تو ہی اس کا خیال رکھوں گی؟ کم از کم میری نظر میں تو زلیخا اور نسیم میں کوئی فرق نہیں!ـــــــ البتہ آپ کی نظر میں ہو گی دوسری اور اسے میں اپنی بد قسمتی ہی کہہ سکتی ہوں۔

یہ کہتے کہتے کلثوم کا گلا رندھ گیا۔ آنسو نکلے یا نہیں، بہر حال اس نے دوپٹہ کے دامن سے آنکھیں ضرور پونچھیں۔

کلثوم کی یہ باتیں سن کر اور یہ انداز دیکھ کر امتیاز چکرا گیا۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا۔ کہیں نادرہ اور زلیخا کو غلط فہمی تو نہیں ہوئی ہے؟ کہیں یہ زلیخا کی حد سے زیادہ نزاکت احساس کا کرشمہ تو

نہیں ہے کہ اس نے کلثوم اور نسیم کو اپنا دشمن سمجھ لیا ہے
جب لوگ رہتے ہیں تو سب طرح کی باتیں ہوتی ہیں، خوش
ناخوشگوار بھی۔ لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ کسی
بات کی آڑ لے کر بات کا بتنگڑ اور رائی کا پہاڑ بنا لیا جا

کلثوم کے خلاف امتیاز کے دل میں جو غبار تھا وہ بڑی
کے مصنوعی آنسوؤں سے دھل گیا۔

اس نے کہا:۔

"میرا یہ مطلب کب تھا؟" ——————

وہ اس طرح روہانسے انداز میں بولی:۔

"بھائی صاحب —————— اور کیا
آپ کا؟ —————— میں ہمیشہ سے زلیخا کو چاہتی ہوں اور
بھابی (مریم) کا انتقال ہوا ہے اس وقت سے تو وہ مجھے
زیادہ عزیز ہے!"

ایک تاثر کے عالم میں امتیاز نے کہا:۔

ضرور ہو گی، ضرور ہو گی —————— بس تو اب میں مطمئن
—————— "سپردم بہ تو مایۂ خویش را۔"

پھر جب کلثوم چلی گئی تو امتیاز نے زلیخا سے کہا:۔

"بیٹی بہر حال۔ انہی لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنا ہے،
کسی وقت ناگوار گزرے تو طرح دے جایا کرو!"

لیکن نظر اٹھا کر دیکھا تو زلیخا کی آنکھیں پرنم تھیں اور وہ سارے
سے کانپ رہی تھی۔ امتیاز نے کچھ پوچھنا چاہا۔ لیکن زبان نے
ی نہ دی۔ زلیخا نے پہلی مرتبہ باپ سے کہا:۔

ابا جی۔ یہ ساری باتیں مکر و فریب، اور جھوٹ کا پلندا ہیں، وہ
سے ڈرتی ہیں۔ اس لئے یہ باتیں کر گیئں، ورنہ دل بھر
ے دل پر جو آرے چلتے رہتے ہیں۔ میں ہی جانتی ہوں ۔"

اس کے بعد وہ کچھ نہ کہہ سکی اور رونے لگی۔ امتیاز کو ایک مرتبہ
اپنے فیصلہ اور رائے پر نظرِ ثانی کرنا پڑی۔ اس نے سوچا۔ بے
کی بات پر زلیخا جیسی خاموش، بے زبان اور صابر لڑکی اس
ح پھوٹ پھوٹ کر نہیں رو سکتی۔ نہ ایسے الفاظ استعمال کر سکتی
۔ یقیناً کلثوم کا ظاہر کچھ ہے باطن کچھ۔ میرے سامنے جو روپ
دوسرا ہے اور زلیخا کو جس روپ سے سابقہ پڑتا ہے، وہ دوسرا ہے
ں نے کہا:۔

"بیٹی میں نے تو یونہی ایک بات کہہ دی تھی اور اس کا تم نے اتنا
لیا؟"

وہ روتی ہوئی بولی، "ابا جی وہ چاہتی ہیں کہ آپ مجھے ان کے
پرد کر جائیں تاکہ جو ظلم باقی رہ گئے ہیں وہ بھی توڑ لیں۔"

امتیاز نے بڑھ کر اس کا سر اپنے سینہ سے لگا لیا اور کہا:۔
"اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تو کلثوم کی دستِ نگر ہو جائے

اپنا گھر تو اس طرح چلائے گی جس طرح اب تک چلاتی رہی ہے، اطمینان رکھ میں انشا اللہ بہت جلد واپس آجاؤں گا اور اس مرتبہ جب واپس آؤں گا تو تیرے دکھ کا مداوا ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے کر دوں گا۔"

زلیخا نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ کسی نے آواز دی، امتیاز صاحب ———

زلیخا اندر واپس آگئی ؛

———

(۲)

امتیاز بیگم کورٹ روانہ ہو گیا
زلیخا کے دل میں رہ رہ کر جو بات کھٹک پیدا کر رہی تھی، وہ یہ تھی کہ اس مرتبہ جب واپس لوٹوں گا تو تیرے دکھ کا مداوا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کر دوں گا! ——— آخر اس کا کیا مطلب ہے۔ کیا شادی؟ کیا ابا جی نے میری شادی کا فیصلہ کر لیا ہے؟

یہ سوچتے سوچتے خود بخود اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ یہ شرم کی سرخی تھی اور پھر دفعتہً اس کی آنکھوں کے سامنے ایک شوخ۔ طرار لیکن سنجیدہ اور جذبات سے بھرپور چہرہ ابھرا۔ ——— یہ ارشاد تھا۔

کچھ خبر نہیں، وہ سعادت گنج میں کیا کر رہا ہے؟ میں اسے یاد آتی ہوں، یا فراموش کر چکا ہے مجھے؟

وہ مجھے بھول چکا!

خالہ نے بھی مجھے فراموش کر دیا!

یہ ساری چاہت، یہ سارا پیار، اماں کے دم تک تھا۔ وہ اس دنیا سے کیا رخصت ہوئیں۔ یہ باتیں بھی افسانۂ پارینہ بن گئیں۔

وہ سہانے سپنے جو ہم نے دیکھے تھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خواب بے تعبیر رہ گئے۔ اب ان کی یاد سے کیا حاصل؟

بیگم کوٹ سے واپس آنے کے بعد جس کے ہاتھ میں جی چاہے گا، وہ میرا ہاتھ پکڑا دیں گے اور میں خاموشی سے سر جھکائے چلی جاؤں گی، ——— !

لڑکی بیچاری اس سماج میں حیثیت ہی کیا رکھتی ہے؟ نہ اس کی کوئی آواز، نہ اس کی کوئی حیثیت!

بار بار جی چاہتا تھا اس گتھی کو نادرہ کی مدد سے سلجھانے کی کوشش کرے لیکن نادرہ گو ایک ہمدرد اور مخلص تھی، اس کے غم کو اپنا غم اور اس کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتی تھی، لیکن، کچھ عمر کا تفاوت، کچھ مرتبہ کا فرق، کچھ پاس حیا۔ یہ رکاوٹیں ایسی تھیں کہ اس سے نہ وہ گفتگو کر سکتی تھی، نہ صلاح لے سکتی تھی۔ اور پھر وہ خود ہی عالم خیال میں بیٹھی یہ باتیں سوچا کرتی۔ ایک ایک لفظ کو کئی کئی معنی پہناتی، لیکن کسی لفظ کے معنی بھی وہ نہ نکلتے جو وہ چاہتی تھی ——— ارشاد، جسے اس نے ہمیشہ یاد رکھا، جسے وہ کبھی نہیں بھول سکے گی، اس طرح دامن جھٹک کر کھڑا ہو گیا کہ اب اس کے بارے میں سوچنا اور سر پھوڑنا

ک ہے۔

ایک روز وہ انہی خیالات میں غرق بیٹھی تھی کہ نادرہ دبے پاؤں آئی اور سرگوشی کے لہجہ میں کہنے لگی :-

"آج آرہے ہیں وہ لوگ ۔"

زلیخا سمجھ تو گئی ، کون لوگ آرہے ہیں لیکن تجاہل عارفانہ کے طور پر سوال کیا :-

"کون لوگ آرہے ہیں - میں کیا جانوں" ؟

وہ بولی ۔ وہی صفدر کے گھر والے اور کون ؟ ـــــــــــ سب لوگ اسٹیشن گئے ہیں اور مجھے حیرت اس پر ہے کہ نسیم بھی گئی ہے ، کیا زمانہ آگیا ہے ـــــــــــ میں کہتی ہوں ، احراز کی غیرت کیا ہوئی۔ ہے ؟

زلیخا نے کہا :- "اس میں حیرت کی کیا بات ہے ؟ آنے والے نسیم کے لئے غیر تو نہیں ، اس کے ماموں ہیں ، ممانی ہیں - ماموں اور ممانی کے استقبال کو اسٹیشن پر جانا بڑی بات ہے ؟"

"ہاں بہت بری بات ہے" ؟

"کیوں بھئی بُری بات کیوں ہے ؟

"ایک طرف یہ لوگ منگنی کرنے آرہے ہیں ، دوسری طرف دلہن خود ہونے والے ساس سسر کی پیشوائی کے لئے اسٹیشن پہنچ رہی ہے میں کہتی ہوں ، شرم بھی کوئی چیز ہے" ؟

زلیخا نے کوئی جواب نہیں دیا - وہ سوچنے لگی، اگر خالہ رابو میری منگنی کر کے سعادت گنج سے آئیں - تو کیا میں اسٹیشن جاتی ؟

## (۳)

اور "جس وقت کا دھڑکا تھا وہ وقت آگیا آخر ———

کلثوم اور نسیم اور احراز اسٹیشن گئے اور بڑے جاہ و جلال کے ساتھ رقیہ بیگم، شاہینہ اور امجد علی کو لے کر گھر واپس آئے۔ رقیہ صفدر کی ماں تھی شاہینہ بہن، امجد باپ

یہ لوگ اس گھر میں اس طرح آئے جیسے کوئی بادشاہ اور شہریار آتا ہے؟

زلیخا نے بہت ضبط کیا لیکن ضبط نہ کر سکی، جب نادرہ نے اطلاع دی کہ وہ لوگ آگئے، سواری سے اتر چکے اور اب گھر میں داخل ہو رہے ہیں تو بے ارادہ دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو کر آنے والوں کا نظارہ کرنے لگی۔

رقیہ بیگم کا سن پچاس سے تجاوز کر چکا تھا۔ رنگ گورا تھا، بال سفید

ہو چکے تھے۔ قامت گو از امجد علی ساٹھ کے پیٹے میں تھے۔ بالکل دبلے پتلے۔ گال دھنسے ہوئے، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، رنگ سیاہ جیسے توے کی سیاہی۔ منہ میں پان کا بیڑا۔ ہاتھ میں سلگتا ہوا سگار۔ شاہینہ کی عمر ۱۸ - ۱۹ سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ خوبصورت لڑکی تھی، تیکھے نقش و نگار۔ رنگ ماں کی طرح گورا۔ بڑی بڑی نرگسی آنکھیں، پتلے پتلے ہونٹ، موتی کے سے سفید دانت۔ ہونٹوں پر تبسم، چال میں غضب کا سحر، ہرے رنگ کا غرارہ پہنے سب سے آگے آگے آرہی تھی۔

یہ لوگ اس کے کمرہ کے پاس سے گزرتے ہوئے چلے گئے۔ ان کے گزرنے کے بعد وہ پھر آکر اپنی جگہ بیٹھ گئی، اور سوچنے لگی، دیکھئے اب کس طرح گزرتی ہے؟

سارا دن خیریت کے ساتھ گزر گیا، کوئی خاص واقعہ نہیں پیش آیا۔ زلیخا نے دل ہی دل میں سجدۂ شکر ادا کیا کہ آج کا دن تو خیریت کے ساتھ گزرا۔

لیکن آج کا دن خیریت کے ساتھ کہاں گزرا؟ ابھی ساری رات باقی تھی ——

اور رات نے جب دن کو اپنے سیاہ لبادے میں ڈھانپا تو خیریت شامت سے بدل گئی۔

کمرے سے نکل کر وہ باورچی خانے کی طرف جا رہی تھی۔ صحن میں کرسیاں پڑی تھیں۔ کلثوم، نسیم، شاہینہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ باہر مردانے

میں اطراز اور راجد سرگرم گفتگو تھے ۔

زلیخا کو دیکھ کر رقیہ نے کلثوم سے پوچھا

"اے بہن یہ کون لڑکی ہے ؟"

کلثوم نے بے پروائی کے ساتھ جواب دیا - بھائی صاحب کی مریم اسی کی ماں تو تھی جس کا پچھلے سال انتقال ہوا ہے ۔

رقیہ بیگم خاموش ہو گئیں لیکن شاہینہ نے کہا :-

"کتنی اچھی ہے ممی" ؟

پھر کلثوم سے مخاطب ہو کر بچوں کی طرح ضد کرتی ہوئی کہنے لگی :-

"اچھی پھپھی اس کو بلائیے ذرا باتیں کریں گے اس سے !"

یہ فرمائش کلثوم کو ذرا پسند نہیں آئی ، لیکن ہونے والے داماد کی بہن اور بھائی کی لڑکی نے کی تھی ، لہٰذا رد بھی نہیں کی جا سکتی ، انہوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے آواز دی ۔

"زلیخا ذرا ادھر تو آنا !"

زلیخا جاتے جاتے ٹھٹک کر پہلے تو کھڑی ہو گئی - پھر سامنے آ کر کھڑی ہو گئی ۔

"کیا آپ نے مجھے بلایا ہے ؟"

کلثوم کو جھاڑ ڈالنے کا اس سے اچھا موقع اور کون مل سکتا تھا ، کہنے لگی :-

واہ بیٹی واہ، واقعی بڑی شہزادی ہو، جس گھر میں جاؤ گی،
ہاتھ لی جاؤ گی۔ اور اپنے کنبے کا نام بھی خوب روشن کرو گی، نہ
نہ دعا۔ نہ مہمانوں کی مزاج پرسی، بجلی کے کھمبے کی طرح سامنے
کھڑی ہو گئیں، "کیا آپ نے مجھے بلایا ہے؟ اے نہیں نہیں بلایا
تمہارے فرشتوں کو بلایا ہے؟ —— لیکن بھر پایا معاف
سدھارو، تشریف لے جاؤ۔"

زلیخا کے لئے نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن کا معاملہ ہو گیا
جا سکتی تھی نہ کھڑی رہ سکتی تھی۔ اس ڈانٹ نے اسے اور زیادہ
باختہ کر دیا تھا۔ پھر بھی حواس بجا کر کے کہنے لگی،

"چچی اماں میں نے تو آتے ہی سلام کیا تھا۔"

چچی اماں بولی "ہاں ضرور کیا تھا، میری تو عادت ہے تہمت
کی۔ میں نے تمہارا سلام سنا اور کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ تمہیں
سلام کرتے دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں" رقیہ سے مخاطب ہو کر
بھابھی۔ خدا لگتی کہنا، اس نے سلام کیا تھا؟

رقیہ بیگم جہنم میں پڑ گئیں سچ کہیں تو کلثوم کے خفا ہو جانے کا ڈر،
اگر کہتی ہیں نہیں کیا تھا تو بالکل جھوٹ، بات بناتے ہوئے کہنے
"جب کہہ رہی ہے تو کیا ہو گا؟"

نسیم نے لقمہ دیا، "نہیں ممانی بالکل نہیں کیا تھا۔ میں بھی تو
بیٹھی ہوں۔ اگر کیا ہوتا تو کیا میں نہ دیکھتی؟

اب رقیہ نے خاموش ہی ہو جانے میں عافیت سمجھی، لیکن شاہینہ چپ نہ رہ سکی، اس نے کہا:۔

"دیکھا تھا! میں نے خود دیکھا اپنی آنکھوں سے!"

اور پھر دفعتاً کلثوم سے پوچھا:۔

"ممانی کیا آپ ان (زلیخا) سے خفا ہیں کچھ؟"

زلیخا ویسے ہی مجرم کی طرح کھڑی تھی!

کلثوم نے جواب دیا۔ "کیوں میرے جوتی کو کیا پڑی ہے کسی سے خفا ہونے کی؟ ہاں یہ ضرور کہوں گی۔ بے ادب بے نصیب، با ادب بانصیب۔"

شاہینہ ہنسنے لگی، اس نے کہا:۔

"لیکن یہ بے ادب کہاں ہے، اس نے تو آتے ہی ممی کو سلام کیا تھا؟ ——— کیوں ممی کیا تھا نا؟"

لاڈلی اور چہیتی لڑکی سے برملا اختلاف رائے کی ہمت رقیہ میں نہ تھی! جواب دیا:۔

"کیا ہوگا بیٹے"

شاہینہ مچل گئی، کہنے لگی،

"ہوگا کیوں؟ ——— آپ ہی کو تو کیا تھا، کیا آپ نے نہیں دیکھا؟"

وہ بے بسی کے ساتھ کلثوم کی طرف دیکھتی ہوئی بولیں۔

"ہاتھ ہلتے تو میں نے بھی دیکھا تھا!"

وہ کہنے لگی "تو سلام ہاتھ ہی سے تو کرتے ہیں"؟

کلثوم کو پھر موقعہ مل گیا، فرمایا :-

یہ تو آج کل فیشن ہے۔ منہ سے سلام کہتے کیا شرم آتی ہ

شاہینہ نے گویا زلیخا کی طرف سے جواب دیتے ہوئے کہا :۔

"میں نے بھی آپ کو ہاتھ اٹھا کر سلام کیا تھا؟"

کلثوم کو الجھن ہونے لگی ان باتوں سے،

"ہو گا بیٹی، میرا سر نہ کھاؤ۔ ویسے درد ہو رہا ہے بڑی د

سر میں!"

پھر زلیخا سے مخاطب ہوئیں۔

"بیٹھنا ہے تو بیٹھو، جانا ہے تو جاؤ۔ تم تو اس طرح سر پر کھ

جیسے موقع پاتے ہی حملہ کر دو گی!"

نسیم کو ہنسی آ گئی۔ وہ زور سے ہنس پڑی۔ رقیہ بیگم بھی مسکر

زلیخا کو رکنے کا یارا بھی نہیں تھا جس طرح آئی تھی، اسی طرح ا

پاؤں اپنے کمرے کی طرف واپس جانے کے لئے مڑی، لیکن شاہینہ ن

روک لیا اور ہاتھ پکڑ کر کرسی پر بٹھا دیا کہنے لگی :-

"نہیں تم بڑی اچھی لگی تھیں۔ ہمارے ہی کہنے سے تو ممانی نے

تھا تمہیں ——— بیٹھو ذرا دیر پھر چلی جانا۔"

وہ انکار نہ کر سکی، سوچا اگر انکار کرتی ہوں تو پھر صد

کا سلسلہ شروع ہو جائے گا، چپ چاپ ایک خالی کرسی پر جو شاہینہ کے قریب تھی بیٹھ گئی۔

اتنے میں اپنے تمام لوازمات کے ساتھ چائے آگئی اور سب اس پر ٹوٹ پڑے، شاہینہ نے اپنے ہاتھ سے ایک پیالی اٹھا کر زلیخا کو پیش کی، پھر کچھ کھانے کی چیزیں سامنے رکھ دیں اور اصرار کر کر کے اسے کھلانے لگی۔

---

(۱۴)

شاہینہ نے دیکھا زلیخا تکلف کر رہی ہے، وہ بار بار کوئی نہ کوئی چیز اٹھا کر اسکی پلیٹ میں رکھ دیتی اور اصرار کرتی، "یہ تو کھاؤ!"

لیکن اس نے صرف چائے پر اکتفا کیا، کوئی چیز نہیں کھائی۔ کئی چیزیں ایسی تھیں جو اسے مرغوب تھیں اور اس کا جی چاہا کہ ان سے لذت کام و دہن حاصل کرے، لیکن کلثوم بیگم کے طنز و تعریض سے ڈر گئی۔ چائے پی کر جب اس نے پیالی رکھی تو شاہینہ نے شکایت آمیز لہجہ میں اس سے کہا:-

"تم نے تو کچھ بھی نہیں کھایا!"-

پھر کلثوم سے مخاطب ہوئی "ممانی جان، زلیخا کو دیکھا آپ نے! کتنا تکلف کر رہی ہیں؟"

کلثوم نے جواب دیا، "بیٹی یہی زلیخا بیگم کا بڑا کرم اور احسان ہے ہم پر

کی چائے پی لی، وہ ٹھہریں ایک نازک طبع اور نازک دماغ بھلا۔ یہ خراب سی چیزیں کیا کھاتیں۔ ان کے لئے تو موہن بھوگ تیار ہوتا ہے۔ ہر روز اب یہاں سے جا کر وہی نوش جان کریں گی۔"

شاہینہ نے پوچھا "موہن بھوگ کیا چیز ہے ممانی جان؟

ممانی جان نے جواب دیا، یہ شاہزادیوں کی غذا ہے،——

شاہینہ نے دریافت کیا

"تو کیا زلیخا شہزادی ہیں کہیں کی؟"

نسیم ہنستی ہوئی بول پڑی

"ہاں کنگال نگر کی شہزادی ہیں"

اور پھر وہ اس طرح ہنس پڑی جیسے اس گفتگو میں اس نے کوئی حصہ ہی نہیں لیا تھا۔

شاہینہ بھی ہنسنے لگی اور پوچھا:-

"کیا کنگال نگر میں بھی شہزادیاں ہوتی ہیں؟

"وہ بولی، یہ بیٹھی ہیں تمہارے سامنے،

اثنائے گفتگو میں رقیہ، نسیم اور کلثوم مجلس سے رخصت ہو چکی تھیں صرف زلیخا اور شاہینہ بیٹھی تھیں۔ یکایک صفدر آ گیا، شاہینہ سے مخاطب ہو کر گویا ہُوا۔

"بڑے زور کی مجلس جمی ہوئی ہے؟"

شاہینہ نے چٹکی لی "بس ایک ہی کی کسر تھی!"

اس نے دزدیدہ نظر سے ادھر ادھر دیکھا، پھر ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اسے بیٹھتا دیکھ کر زلیخا اٹھی۔ شاہینہ نے پھر ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا، وہ کہنے لگی:۔

"اب جاؤں گی، کچھ کام ہے مجھے!"

شاہینہ نے بے تکلفانہ لہجہ میں کہا:۔

"کام تو زندگی بھر کا ہے، کر لینا، مہمانوں کی خاطر داری بھی تو کرنی چاہیئے کچھ!"

وہ بے بسی کے ساتھ بیٹھ گئی، لیکن بالکل خاموش صورت تصویر!

صفدر نے شاہینہ سے زلیخا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا،

"کیا انہیں بولنا آتا ہے؟"

وہ مسکراتی ہوئی بولی "میں بھی اتنی دیر سے یہی سوچ رہی ہوں کہ یہ اتنی کم گو کیوں ہیں؟"

زلیخا کسمسا کر اور پہلو بدل کر رہ گئی، وہ جواب میں کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن زبان نے ساتھ نہ دیا۔

اب صفدر براہ راست زلیخا سے مخاطب ہوا۔

"شاید میرے بارے میں آپ کو غلط فہمی ہے کچھ؟"

آخر اسے بولنا پڑا، کہنے لگی۔

جی نہیں کوئی غلط فہمی نہیں ہے ——— لیکن حسن ظن بھی نہیں ہے

اور ہونا بھی نہیں چاہئیے۔"

صفدر کو یہ ادائیں اور یہ باتیں بہت اچھی لگیں، ان میں بے پناہ قسم کی کشش اور جاذبیت نظر آئی کہنے لگا:-

"آپ کے اس اکھڑے اکھڑے انداز گفتگو سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آپ بیحد ناراض ہیں مجھ سے ——— لیکن میری خطا؟ میرا قصور؟

وہ گویا ہوئی " اگر آپ ایک بات فرض کر لیں اور اسی بنیاد پر نتائج نکالنے لگیں تو اس کی ذمہ داری میرے اوپر تو کسی طرح عائد نہیں ہوتی ——— سوال یہ ہے کہ مجھے آپ سے ناراض ہونے کا حق بھی ہے؟"

"کیوں نہیں ہے؟ میں تو اسی چیز کو بھی اپنے لئے باعث فخر سمجھوں گا کہ خوش نہ سہی، ناراض تو ہیں آپ مجھ سے، اس کے معنی یہ ہیں کہ میں بھی کچھ ہوں، میری بھی کچھ حیثیت ہے ——— میں خوش ہوا کہ ہوں تو کسی نگاہ میں!"

یہ باتیں زلیخا کے لئے قطعاً ناقابل برداشت تھیں۔ شاہینہ نے انہیں صرف صفدر کی زندہ دلی، شوخ گفتاری اور شوق مجلس آرائی پر محمول کیا۔ وہ صرف مسکراتی رہی اور زلیخا کا یہ حال تھا کہ ایک رنگ آرہا تھا، ایک جا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، ان باتوں کا جواب کیا دے؟ ان باتوں کا مقصد کیا ہے؟ اتنے

میں نسیم کی جھلک نظر آئی جو اپنے کمرے کی کھڑکی سے اس طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھی۔ لیکن نظر ملتے ہی کھڑکی بند کر کے سامنے سے ہٹ گئی۔ اسے دیکھ کر زلیخا کا خون خشک ہو گیا۔ جی چاہا، سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگے مگر ——

---

حنیف اسٹیشنری اینڈ جنرل اسٹور
دوکان نمبر ۷۸۰ رحمانیہ مسجد لیاقت آباد کراچی

## (۵)

مگر وہ اٹھنے کے لیئے پر تول ہی رہی تھی کہ ایک طوفان پوری دہشت آفرینی کے ساتھ نمودار ہوا۔

دفعتہً آنکھوں کے سامنے بجلی سی کوندی، نظر کی خیرگی دور ہوئی تو معلوم ہوا کلثوم بیگم شعلہ جوالہ بنی، کمر پہ ہاتھ رکھے سامنے کھڑی ہیں!

یہ کیوں آئیں؟ اور ان کا رنگ رخ بدلا ہوا کیوں ہے؟ یہ بات تو اس نے اسی وقت سمجھ لی تھی جب نسیم کو کھڑکی بند کر کے سامنے سے ہٹتے دیکھا تھا۔ زلیخا۔ پر جو کچھ گزری وہ تو گزر ہی گئی، خود صفدر ہکا بکا ہو کر رہ گیا۔ زندگی میں شاید ہی وہ کبھی اتنا سٹ پٹایا ہو۔ جتنا اس وقت نظر آ رہا تھا۔

چند سیکنڈ تک مجلس پر سناٹا چھایا رہا!

کسی میں بھی یارائے گفتگو نہ تھا!

شاہینہ نے کچھ نہ جانتے ہوئے بھی اتنا جان لیا تھا کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے ——— شاید بہت برا۔

سب سے پہلے تو کلثوم بیگم نے صفدر کو رخصت کیا۔

"بیٹے تم یہاں لڑکیوں میں بیٹھے کیا کر رہے ہو ——— میری جان! جا کر اپنے کمرے میں بیٹھو!

صفدر ایک مجرم کی طرح سر جھکائے اور چور کی طرح دبے پاؤں یہاں سے ہٹ گیا۔ اسے اپنے لئے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ نہ یہ اندیشہ تھا کہ کلثوم بیگم اس سے بدگمان ہو جائیں گی۔ البتہ اسے بات پہ افسوس ضرور تھا کہ بات کا بتنگڑ اس کی وجہ سے بن رہا ہے

صفدر چلا گیا

جب بالکل نظروں سے اوجھل ہو گیا تو کلثوم نے زلیخا سے سوال کیا:۔

"تو یہاں کیا کر رہی تھی؟"

وہ بولی، کچھ بھی نہیں ——— شاہینہ نے آپ کے سامنے ہی تو بلایا تھا!"

وہ بولیں "ہاں بلایا تھا چائے پینے کے لیے۔ نہ کہ ہڑونگ مچانے کے لئے ——— میں پوچھتی ہوں۔ تو یہاں چائے پینے اور شاہینہ سے باتیں کرنے آئی تھی یا آنکھیں لڑانے؟"

شاہینہ سے ضبط نہ ہو سکا، مداخلت کرتی ہوئی بولی:۔

"ایسا نہ کہیئے ممانی جان ——— زلیخا ایسی لڑکی نہیں ہے، نہ بھیا ایسے ہیں!"

کلثوم نے جواب دیا "بیٹی بڑوں کے بیچ میں نہیں بولتے ——— اور ہاں تم نے یہ جو کہا کہ زلیخا ایسی لڑکی نہیں ہے تو تم کیا جانتی ہو جمعہ جمعہ ابھی آٹھ دن بھی تو نہیں ہوئے تمہیں آئے، تم کیا جانو اسے اور اس کے چھنوں کو۔ یہ حرفوں کی بنی ہوئی ہے اس کا کاٹا پانی بھی نہ مانگے۔ بس کی پڑیا ہے یہ۔ باقی صفدر کے متعلق ٹھیک کہا تم نے۔ وہ بیشک بھولا بھالا لڑکا ہے"

دفعتہً زلیخا کی حمیت بیدار ہوئی، وہ جواب تک ہر طرح کے ظلم سہتی اور زیادتیاں برداشت کرتی چلی آئی تھی، کہنے لگی،

"چچی جان" ———

اتنی بڑی گالی چچی جان برداشت نہ کر سکیں، کہنے لگیں

"میں کیوں ہوتی تیری چچی جان ———"

وہ بھی اس وقت ویسے ہی عالم میں تھی کہنے لگی

واقعی میں نے غلطی کی، آپ کو چچی کہنا اس مقدس لفظ کی توہین کرنا ہے۔ آپ میری کوئی نہیں ہیں۔ میں آپ کی کوئی نہیں ہوں بہرحال آپ جو کچھ بھی ہیں کان کھول کر سن لیجئے، یہ باتیں میرے لئے قطعاً ناقابل برداشت ہیں۔

چچی جان پر سکتہ سا طاری ہو گیا - اس لیے زبان سے اس تیز گفتاری کی انہیں ذرا بھی امید نہ تھی۔

زلیخا نے اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا :-

صفدر صاحب کو میں نے نہیں بلایا تھا - وہ خود آئے تھے۔ خود بیٹھے تھے، خود باتیں شروع کر دیں انہوں نے — —

"اچھا مان لیا ، وہ خود آیا تھا مگر وہ ٹھہرا مرد ذات تو ٹھہری لڑکی تو کیوں نہ اٹھ گئی ؟"

"کیوں اٹھ جاتی ؟ کیا میں کسی غیر کے گھر میں ہوں ؟ یہ گھر میرا ہے، میرے باپ کا ہے - میرا جہاں جی چاہے گا بیٹھوں گی - اگر آپ کی طرف کا کوئی آدمی آتا ہے تو اس کے سر پہ جوتیاں برسایئے، مجھ سے کچھ کہنے سننے کا آپ کو ذرا بھی حق نہیں۔"

"میں کہتی ہوں ، کچھ ہوش میں ہے ، جانتی ہے ، کس سے باتیں کر رہی ہے ؟

(۶)

کلثوم کا خیال تھا، یہ الفاظ سن کر زلیخا گھبرا جائے گی۔ اسے اپنی بے حقیقتی کا احساس ہو جائے گا۔ ان کی بڑائی اور عظمت کے سامنے سرنگوں ہو جائے گی۔

لیکن ایسا نہیں ہوا، ان الفاظ سے وہ ذرا بھی متاثر نہیں ہوئی، اسی تیور، اسی انداز اور اسی لب و لہجہ میں کہا:-

"میں بالکل اپنے ہوش میں ہوں۔ مجھے معلوم ہے میرے سامنے کون کھڑا ہے۔ وہ کوئی بھی ہو۔ میری زبان نہیں بند کر سکتا۔ میری توہین نہیں کر سکتا۔ مجھے ذلیل نہیں کر سکتا!

کلثوم جواب میں کچھ نہ کہہ سکی اور زلیخا کہے چلی جا رہی تھی، بہت دن میں نے ظلم سہے، زیادتیاں برداشت کیں۔ طعنے سنے، ذلتوں کا سلوک سہا!۔ لیکن اب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے، اب

جام چھلک چکا ہے۔ میں ابھی نادرہ کو لے کر بیگم کورٹ جاتی ہوں اور ان سے کہتی ہوں کہ جس طرح ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں اسی طرح اس گھر میں میرا اور نسیم کی والدہ کا گزر نہیں ہو سکتا۔ انہیں میرے ساتھ چھٹی لے کر یا استعفیٰ دے کر آنا پڑے گا اور جھگڑے کا فیصلہ کرنا پڑے گا۔"

اعجاز کے پاس زلیخا تن تنہا جائے گی - ان سے ساری داستان بیان کرے گی - ایک کی دس دس لگائے گی، اور ان سے کہے گی کہ اب اس گھر میں ایک میان کی طرح دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔"

یہ سوچ کر کلثوم تن بدن سے کانپ گئی، وہ سمجھ گئی اگر ایسا ہوا تو قیامت آجائے گی - امتیاز کا غصہ خدا کی پناہ، وہ اس گھر میں آگ لگا دے گا - وہ اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا، دونوں بھائی اب تک چاؤ پیار سے رہتے چلے آرہے ہیں، اب دونوں میں لڑائی ہو گی اور کون جانے اس لڑائی کا نتیجہ کیا ہو گا، ؟ وہ (حماز) بے شک میرے ہم خیال ہیں - مجھے چھوٹ دے رکھی ہے انہوں نے، لیکن اگر بھائی کی طرف پلٹ گئے تو چٹیا پکڑ کر نکال بھی دیں گے مجھے۔"

پھر خیال آیا کیا بھائی صاحب (اعجاز) اس زلیخا کی باتوں کا یقین کر لیں گے ؟ دل نے جواب دیا ضرور کر لیں گے، کیا تو ایک عرصہ سے دیکھ نہیں رہی ہے کہ ان کا رویہ ایک عرصہ سے بدلا ہوا

کچھ لاجواب سی ہو کر کہنے لگیں۔
"کیا تو بھائیوں بھائیوں میں فساد ڈلوائے گی؟"
وہ بے پروائی سے بولی "مجھے کوئی بھی پروا نہیں ہے فساد کی۔ اب میں صبر نہیں کر سکتی۔ اب میرے لئے یہ باتیں سہنا کسی طرح بھی ممکن نہیں!
دفعتہً کلثوم بیگم کا لب و لہجہ بدل گیا،
کہنے لگیں:۔
کیا چھوٹوں کا برتاؤ بڑوں کے ساتھ یہی ہوتا ہے کہ ایک کی دس سنائیں۔ اور اگر یہ ہوتا ہے تو سنا لیں تم نے۔ آخر میں تمہارے چچا کی بیوی ہوں۔ تمہاری بڑی ہوں، کیا مجھے یہ حق نہیں کہ اگر تم سے کوئی غلط کام سرزد ہوتے دیکھوں تو ٹوک سکوں؟"
وہ بولی "بزرگ گالیاں نہیں دیتے۔ طعنوں سے سینہ نہیں چھلا کرتے دوسروں کے سامنے چھوٹوں کو ذلیل نہیں کرتے، گفتنی اور ناگفتنی باتیں نہیں کہتے۔ غلط، رکیک اور شرمناک الزام نہیں لگاتے، آپ نے یہ سب کچھ کیا ہے، کس طرح آپ کو بزرگ مان لوں۔
بڑی حسرت کے ساتھ کلثوم نے پوچھا
"اچھا تو اب میں تیری بزرگ بھی نہیں رہی؟ کیا تو خدا کے

فیصلہ کو بھی بدل دے گی ؛ کیا میں تیری ماں کے درجہ میں نہیں
ایسی باتیں بھابی (مریم) سے بھی کہہ سکتی تھی ؟ کیا ان کے سامنے
سے یہ طرزِ گفتگو اختیار کر سکتی تھی ؟

---

(۷)

اس دردناک اپیل پر زلیخا کا دل پسیجا!
لیکن اسی اثنا میں ایک اور واقعہ رونما ہو گیا۔ نسیم جو شاید آڑ سے باتیں سن رہی تھی کھل کر سامنے آ گئی۔ اس نے آتے ہی ماں کے پہلو میں کھڑے ہو کر زلیخا سے کہا:۔

"بہت زبان چل گئی ہے تمہاری؟"

وہ حقارت کی ایک نظر اس پر ڈالتی ہوئی بولی:۔

"میں تم سے بات کرنا نہیں چاہتی!"

نسیم نے اسے بھڑکاتے ہوئے کہا۔

"آہا تو یہاں کون مرا جا رہا ہے تم سے بات کرنے کو؟ — بے غیرت، بے شرم، غیر مردوں سے باتیں کرتے لجاتی بھی نہیں — آخر وہ تیرے کون ہوتے تھے جو ان سے یوں گھل مل کر

باتیں ہو رہی تھیں ؟

وہ بپھر کر بولی "ایک اوباش اور بدمعاش شخص سے میرا کیا ... ہو سکتا ہے ؟ میری بیزار بات کرتی ہے اس سے ؟"

نسیم کو بات بڑھانے کا موقعہ مل گیا :-

"تو نے بدمعاش اور اوباش کسے کہا :-

وہ بے پروائی سے گویا ہوئی :-

"وہی جس کا نام لیتے شرماتی ہو ——— جو تمہیں بے وقو... بنا رہا ہے، اور اپنی افتادِ طبیعت سے باز نہیں آتا - جو بدنظر بھی ہے بدچلن بھی اور جھوٹا بھی ———

کلثوم نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ سوال کیا :-

"یہ صفدر کو کہہ رہی ہو تم ؟"

وہ بولی " جی ہاں ان کا یہی نام ہے "

کلثوم کے آنے کے ذرا دیر بعد رقیہ بیگم بھی آ گئی تھیں اور موقع وار... پر موجود تھیں - اپنے فرزند دلبند کے متعلق یہ الفاظ سن کر ان کا خون کھول گیا، کہنے لگیں :-

"میری لڑکی اگر ایسی ہوتی تو اس کا گلا گھونٹ دیتی !"

وہ زہر خند کرتی ہوئی گویا ہوئی - لڑکے کی خبر تو لیجئے، ہو سکے تو اس کا گلا گھونٹ آئیے جا کر" !

اب وہ لڑنے بلکہ مارنے مرنے کے لئے بالکل تیار تھیں، کہنے لگیں

"تیرا نہ گھونٹ دوں گلا ابھی ؟"

وہ بولی اگر ہمت رہو تو یہ شوق بھی پورا کرنے کی کوشش کر لیجیے، آپ کو خود ہی معلوم ہو جائے گا ، کون کس کا گلا گھونٹ سکتا ہے ۔"

دفعتہً مرتبہ اور کلثوم سے مخاطب ہوئیں ۔

اے بہن سن رہی ہو تم اس لڑکی کی باتیں ؟ واقعی یہ تمہارا ہی دل گردہ ہے کہ اس گھر میں رہتی اور اس کے ساتھ گزارا کر لیتی ہو ۔ میں تو ————

شاہینہ نے قفل سکوت توڑا اور کہنے لگی :

لیکن امی جان ، ایمان کی بات یہ ہے کہ زلیخا کی کوئی خطا نہیں ہے ۔

بپھر کر پوچھا ، "پھر کس کی ہے ؟ ——— کیا صفدر کی ، تیرے بھائی کی ؟

یہ دردناک اپیل کارگر نہ ہوئی ، اس نے کہا :-

"یہ تو بڑی شرمیلی ، نیک اور شریف معلوم ہوتی ہیں ، بھیا خود سے یہاں آئے اور بیٹھ گئے اور ان سے باتیں شروع کر دیں ، لیکن انھوں نے نہ منہ لگایا ، نہ کسی بات کا سیدھے منہ جواب دیا ۔"

رقیہ نے خونخوار آنکھوں سے شاہینہ کو گھورا اور کہا :-

"واقعی قیامت قریب ہے ، بہن بھائی کے خلاف گواہی دے رہی ہے ، نہ زمین پھٹتی ہے ، نہ آسمان ٹوٹتا ہے ، نہ جانے کیا ہونے والا ہے میرے اللہ ——— جا دے دو زہر اسے ، کر دو اس کا کام تمام !"

شاہینہ کے پاس ان باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا ۔ وہ خاموش

ہوگئی۔ زلیخانے مزید گفتگو بیکار سمجھ کر اپنے کمرے کا رُخ کیا۔

کمرے میں پہنچی تو نادرہ موجود تھی۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، چٹ پٹ اس کی بلائیں لیں، پھر مسکراتی ہوئی کہنے لگی،

"خدا نظر بد سے محفوظ رکھے، آج تو بیٹا کمال کر دیا تم نے، میں تو اتنی خوش ہوں کہ بیان نہیں کر سکتی،

لیکن زلیخانے کوئی جواب نہیں دیا چپ چاپ بستر پر دراز ہوگئی وہ بظاہر خاموش تھی لیکن دل میں طوفان انگڑائیاں لے رہا تھا۔

---

(۸)

زلبنا چادر اوڑھے بستر پر دراز تھی اور حال و مستقبل کا جائزہ لے رہی تھی۔ اتنے میں کسی کی آہٹ محسوس ہوئی، اس نے منہ سے چادر ہٹا کر دیکھا تو شاہینہ تھی۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی، بڑے تپاک اور گرم جوشی کے ساتھ اسے بلایا اور بٹھایا۔ وہ نہیں نہیں کرتی رہ گئی لیکن یہ جلدی سے چائے بنا لائی پھر کہنے لگی۔

"تمہارے آنے سے میرا دل بہت خوش ہے، تم میں انسانیت اور شرافت کا جوہر ہے اور کون ہے جو اس کی قدر نہ کرے گا، آج تم نے سچی بات کہہ کر' وہ بھی اپنے بھائی کے معاملہ میں اپنی پھپھی کے سامنے اور اپنی ماں کی موجودگی میں' اپنے آپ کو بہت اونچا کر لیا ہے۔"

وہ مسکرانے لگی۔ "خوب بنا لو جی بھر کے ——————"

کچھ اور کہنا ہو، وہ بھی کہہ ڈالو!"

زلیخا نے سنجیدگی کے ساتھ کہا :-

شاہینہ میں جھوٹ نہیں بولتی، کس طرح تمہیں اپنا دل چ
دکھا دوں؟"

وہ ہنستی ہوئی کہنے لگی :-

"میری نگاہیں دل کو اور جو کچھ دل کے اندر ہے، دیکھ لیتی ہی
آج واقعی تمہارے ساتھ بہت زیادتی ہوئی اور تم نے بھی کوئی کسر
اٹھا رکھی، اچھا کیا؟"

وہ بولی "کیا کروں شاہینہ اس گھر میں رہنا مجھے دوبھر ہو گ
حالانکہ جتنا یہ نسیم کا ہے، اتنا ہی میرا بھی ہے؟"

تائید کرتے ہوئے اس نے کہا :-

"کیوں نہیں؟ بے شک ہے؟"

بڑی دیر تک دونوں میں اس طرح خلوص اور تپاک کی با
ہوتی رہیں۔ پھر یک بیک شاہینہ نے سنجیدہ لب و لہجہ میں کہا :-

"آج جو کچھ ہوا اس کی سب سے زیادہ ذمہ داری میرے اوپر
نہ میں تمہیں بلاتی، نہ یہ فتنہ اٹھتا، بہت شرمندہ ہوں کہ میر
سے ——"

قطع کلام کرتے ہوئے اس نے کہا :-

"تمہاری کوئی خطا نہیں تھی۔ تمہارا کوئی منصوبہ مجھے ذلیل اور

کہاں نہیں تھا۔ وہ تو نسیم اور چچی جان موقع کی تاک میں تھیں، وہ
اور دل کی بھڑاس نکال لی اچھی طرح!"

"اچھا تو کیا واقعی تم مجھے قصور وار نہیں سمجھتیں؟"

"بالکل نہیں!"

"تمہیں میرے خلوص کا یقین ہے؟"

"ہاں ـــــ سچے دل سے!"

"تو ایک بات میری ماننی پڑے گی تمہیں!"

"ضرور مانوں گی۔ تم کوئی بات ایسی کہہ ہی نہیں سکتیں جو ماننے والی نہ ہو۔"

"آج جو کچھ ہوا اسے بس یہیں ختم کردو!"

"کیا چاہتی ہو تم؟ میں سمجھ نہیں سکی!"

"میں چاہتی ہوں کہ آج جو کچھ ہوا، اس کی خبر تمہارے والد کو نہیں ہونی چاہیے۔ کسی طرح بھی نہیں!"

"اس میں کیا مصلحت ہے؟"

"مصلحت تو کوئی بھی نہیں، میرا ضمیر مطمئن ہو جائے گا۔ میں سمجھوں گی میری حماقت سے جو فساد برپا ہوا تھا وہ آگ بن کر اس گھر کو جلا نہ سکا، اگر تم نے اپنے والد سے کہا یا خود ان کے پاس گئیں تو اس کا نتیجہ واقعی دونوں بھائیوں کے درمیان تلخی اور بدمزگی کی صورت میں برآمد ہوگا، میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے ایسا ہو!"

"تمہاری وجہ سے کیوں ؟ ——— کیا یہ کوئی نئی بات تھی، کیا [illegible]
کے فتنے نہیں اٹھتے ؟ فساد نہیں ہوتے ؟"

اٹھتے ہوں گے، ہوتے ہوں گے ——— آج کے بعد جب [illegible]
ایسا ہو تو بے شک تمھیں اختیار ہے جو چاہنا کرنا، لیکن آج کے واقعہ کو بھول
جاؤ، اس طرح میرے دل کا بوجھ اتر جائے گا ——— کیا تم میری [illegible]
سی بات نہیں مان سکتیں ؟ ——— یہ مجھ پر بہت بڑا احسان [illegible]
.... زندگی بھر ممنون رہوں گی تمہاری،"

"میری سمجھ میں نہیں آتا آخر تمہیں اس کا اتنا احساس کیوں
ہے ؟"

ویسے بھی تھا اور اب اس لئے زیادہ ہے کہ پھپھی کا خیال ہے کہ اگر
میں تمہیں چائے کے لئے نہ بلاتی تو نہ بھیا وہاں پہنچتے، نہ بات اتنی بڑھتی
نہ تمہارے والد اور چچا جان کے درمیان تلخی اور بدمزگی کا امکان پیدا ہوتا
ساری صورت حال زلیخا کی سمجھ میں آگئی، اس نے کہا :۔
"اگر یہ بات ہے تو خیر ———"

---

شاہینہ کے جانے کے بعد زلیخا سوچنے لگی، دونوں بہن بھائی میں کتنا زمین آسمان کا فرق ہے؛ ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے والی یہ دونوں ہستیاں ایک دوسرے سے طبیعت، مزاج، اخلاق اور سیرت میں کتنی مختلف ہیں؛ صفدر کے لچھن چند ہی دنوں میں الم نشرح ہو گئے اور شاہینہ کے گن بھی چند روز میں نظر کے سامنے آ گئے۔ دونوں میں وہی فرق تھا جو زمین اور آسمان میں ہے۔ وہ بدنفس ہے، بدنظر ہے، بدچلن ہے۔ یہ خوش اخلاق ہے، خوش مزاج ہے، خوش کردار ہے،

اور پھر نہ جانے کیوں یکایک خیال آیا۔ یہ شاہینہ اور صفدر کا فرق نہیں ہے۔ مرد اور عورت کا فرق ہے۔ اپنی فطرت کے اعتبار سے مرد کچھ ہوتا ہی خود پسند ہے اور بیچاری عورت، وہ تو صرف اس لئے ہے کہ دوسروں کے غم کو اپنا غم بنا لے،

اس نے وعدہ کر لیا تھا کہ امتیاز کے پاس نہیں جائے گی۔ اسے خط نہیں لکھے گی۔ لیکن بار بار حیرت کے ساتھ وہ سوچتی تھی آخر میں نے نسیم کا یا چچی جان کا کیا بگاڑا ہے؟ کیوں یہ لوگ میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہیں؟ میں کسی کے بھلے میں نہیں، کسی معاملہ میں دخل نہیں دیتی، کسی بات کی ٹوہ نہیں لیتی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے نہ جانے کتنی پشتوں سے دشمنی چلی آ رہی ہے میری اور ان ماں بیٹی کی،

پھر اس کا ذہن امتیاز کی طرف گیا۔

وہ سوچنے لگی، انہیں اب میری بے چارگی، بے بسی اور پریشانی کا احساس ہو چلا ہے۔ وہ اب مجھ سے وہی برتاؤ کرنے لگے ہیں جو ایک شفیق باپ کا، اپنی بیٹی سے ہونا چاہیئے لیکن وہ بھی میرے کیا کام آ سکتے ہیں! وہ یہاں ہوتے بھی ہیں تو کیا کام آتے ہیں؟ وہ باہر میں اندر، اور یہ میری عادت نہیں کہ ہر وقت اِدھر کی اُدھر لگاتی رہوں، ہر وقت شکایتوں کا دفتر کھول کر بیٹھ جایا کروں ——

اور پھر عالمِ تصور میں اعجاز سامنے آ کر کھڑا ہو گیا ——

چہرہ اترا ہوا، کپڑے پھٹے ہوئے!

اعجاز کی یہ حالت دیکھ کر اس کا دل مسل گیا، وہ سوچنے لگی، اس کی یہ حالت میری ہی وجہ سے ہوئی ہے۔ کاش میری نظر نسیم کی گھڑی پر نہ پڑی ہوتی۔ بلا سے کوئی چرا لیتا، اور اگر میری نظر پڑی تھی تو میں نے اس منحوس چیز کو اٹھایا نہ ہوتا اور اگر اٹھایا تھا تو بھیا کے پاس لے جا کر

...شریک سازش نہ کیا ہوتا
...ان پر یہ ساری مصیبتیں میری ہی وجہ سے نازل ہوئی ہیں !
—— انہوں نے ذلیل ہونا گوارا کر لیا ، اس گھر کو جہاں وہ
...پیدا ہوئے تھے جو ان کے باپ کا اور دادا کا گھر تھا چھوڑنا منظور
...لیا ، لیکن میرا نام زبان پر نہ لائے ، بہن پر کسی طرح کی آنچ نہ آنے
...دی ۔ —— ایسے بھی بھائی ہوتے ہیں

میرا قابلِ فخر بھائی !
وہ نہ جانے کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھا رہا ہے ، فقر و فاقہ کی زندگی
بسر کر رہا ہے ، نہ جانے تندرست ہے یا بیمار ، زندہ ہے یا ——
اس سے آگے وہ کچھ نہیں سوچ سکی ، دل امنڈ آیا ، آنکھیں
بھر آئیں ، اور گریۂ بے اختیار نے اسے سسکیوں اور ہچکیوں پہ مجبور کر
دیا ، اس اکیلے کمرے میں اس تنہائی کی محفل میں کوئی ایسا نہ تھا جو
اس کے آنسو پونچھتا ، اسے دلاسا دیتا ، اس کے قلبِ ناشکیب
پر ہاتھ رکھتا ،
بڑی دیر اسی طرح گذر گئی اور پھر نہ جانے کب وہ سو گئی ،

---

## (۱۰)

رودررو اور دوبدو معرکہ آرائی کے بعد کلثوم نے زلیخا سے بات چیت بند کر دی تھی، احراز کی بھی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں وہ پہلے بھی شاذونادر ہی اس سے بات کرتا تھا مگر اب تو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ صورت دیکھنے کا بھی روادار نہیں ہے، نسیم سے آنکھیں چار ہوتی تھیں تو شعلے برستے نظر آتے تھے۔ مگر اسے ذرا بھی پروا نہیں تھی اس نے طے کر لیا تھا، ان لوگوں سے نہ اب دبے گی، نہ ان کی دل خراش اور جانسوز باتوں پہ خاموش رہے گی۔ شاید اس کے ان تیوروں کو یہ لوگ بھی پہچان گئے تھے لہٰذا الگ الگ رہتے تھے، جیسے اچھوت سے برہمن۔

لیکن شاہینہ سب سے الگ تھی، اسے تو جیسے زلیخا سے محبت ہو گئی ہو، جب دیکھئے، جب موجود۔ اس کے زیادہ آنے جانے سے

زلیخا گھبراتی تھی، اسے ڈر لگتا تھا کہیں شاہینہ کا یہ التفات بھی پیام مصیبت نہ بن جائے کسی دن؛

اور ایک دن اس اندیشہ نے واقعہ کی صورت اختیار کر لی،

شاہینہ حسب معمول آئی اور پاس ہی بیٹھ گئی، پوچھا:-

"کیا ہو رہا ہے؟"

جواب ملا، "تمہاری یاد!" وہ ہنس پڑی "تو تمہاری یاد کھینچ کر لائی ہے۔مجھے"

"ہاں ——— کچے دھاگے ہیں؟"

"زلیخا یہاں سے جانے کے بعد تم بہت یاد آؤ گی!"

"تو نہ جاؤ"

"جی تو یہی چاہتا ہے لیکن جانا ہی پڑے گا؛"

"کیوں جانا پڑے گا؟"

"بھلا اپنا گھر چھوڑ کر کب تک دوسری جگہ رہا جا سکتا ہے؟"

"تو کیا یہ تمہارا گھر نہیں ہے؛"

"ہاں ہے تو ——— مگر!"

مگر کیا؛ ——— اپنا گھر چھوڑ کر سسرال بھی تو جاؤ گی؛"

(بے تکلفی سے لیکن ذرا شرماتے ہوئے) لڑکی کے لئے اپنا گھر سسرال ہی تو ہوتا ہے؛ ———

——— "کہاں بات ٹھہری ہے؟"

"وہیں اپنے شہر میں۔"
"کون لوگ ہیں وہ ؟"
"اپنے کنبہ کے ہیں۔"
"یہ دُلہا کیسا ہے ؟"
"(ہنس کر) اگر عورت ہوتا تو تم جیسا ہوتا۔"
"دل لگی چھوڑو ـــــــ پسند ہے تمہیں۔"
"کیوں نہیں پسند ہے ؟ ـــــــ کیا اچھی چیز بھی ناپسند کی جاتی ہے ؟"
"کیا محبت ہے تم دونوں میں ؟"
شاہینہ نے منہ سے جواب نہیں دیا، ایک ادا کے ساتھ سر ہلا کر اقرار کر لیا :
زلیخا نے سوال کیا "ہمیں بلاؤ گی، اپنی شادی میں۔"
"اگر آنے کا وعدہ کرو تو ضرور بلاؤں گی۔"
"کر لیا وعدہ !"
"تو ضرور بلائیں گے !"
"لیکن اگر نسیم روٹھ گئی ؟ صفدر خفا ہو گئے ؟ چچی جان بگڑ گئیں تو دعوت نامہ واپس لے لو گی ؟"
"ہرگز نہیں ـــــــ مجھے نہیں معلوم یہ لوگ تم سے کیوں خفا ہیں، لیکن مجھے تو تم بہت اچھی لگتی ہو ـــــــ کاش میری کوئی

بہن ہوتی اور وہ تم ہوتیں"!

اور پھر دفعتہً گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے اس نے کہا:۔

"اب تم بتاؤ"!

زلیخا سمجھ تو گئی اس سوال کا مقصد کیا ہے لیکن ان جان بن کر پوچھا:۔

"میں کیا بتاؤں"؟

"تمہاری شادی کہاں ٹھہری ہے"؟

زلیخا نے اس سوال کا جواب نہیں دیا، لیکن شاہینہ نے اپنی رو میں ایک سوال اور کر ڈالا

"دولہا کیسا ہے"؟

مگر جب دونوں سوالوں کا جواب نہیں ملا تو اس نے نظر اٹھا کر دیکھا اور محسوس کیا، ان سوالات کا کچھ اچھا اثر نہیں پڑا زلیخا پر' معصومیت اور سادگی کے ساتھ اس نے پوچھا ا۔

"کیا خفا ہو گئیں"؟

وہ بولی "بھلا تم سے بھی خفا ہو سکتی ہوں"!

شاہینہ نے اصرار کرتے ہوئے پوچھا: "پھر ہمارے سوال کا جواب کیوں نہیں دیتیں"؟

وہ کہنے لگی "جواب کس چیز کا دوں؟ ——— شاہینہ تم نہیں جانتیں۔ میری زندگی میں کبھی خوشی نہیں آئی، نہ آسکتی ہے! جب

سے آنکھیں کھولی ہیں، روتے جھینکتے بسر ہو رہی ہے اور زندگی کے جو چند دن باقی ہیں، خدا کرے وہ جلد ختم ہوں، اسی طرح گزر جائیں گے ———

ان الفاظ میں درد تھا، حسرت تھی، سوز تھا، شاہینہ متاثر ہوئی، ہمدردی کی نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی :-

ہاں میں سب کچھ جانتی ہوں، تمہاری والدہ کا انتقال ہو گیا، تمہارے والد کو نہ ان سے کوئی دلچسپی تھی، نہ تم سے، تمہارے بھائی کو صحیح تربیت نہ ملی، اس لئے چوری تک کرنے لگے، اس لئے نکال دیئے گئے گھر سے ———

زلیخا کے لئے اس سے زیادہ سننا ناممکن ہو گیا، اس نے کہا :-

"شاہینہ یہ غلط ہے، جھوٹ ہے، بکواس ہے، میرا بھائی چور نہیں ہے، وہ ایک لاکھ روپے کی چیز بھی نہیں چرا سکتا۔ وہ سیر چشم، عالی حوصلہ اور اولوالعزم ہے۔ ان لوگوں نے بات کا بتنگڑ بنا کر اسے چور بنا دیا، لیکن خدا کی نظر میں وہ بے گناہ ہے!

اور پھر اس نے سارا ماجرا شاہینہ کو سنا دیا، اور یہ کہنے لگی :-

تمہارا دل چونکہ صاف ہے، اس لئے تم یقین کر لوگی، ان لوگوں کے دل میں کپٹ ہے۔ یہ اپنی ہی کہے جائیں گے، لیکن دیکھ لینا، ایک

ت آئے گا کہ اس جھوٹ اور تہمت کا پول کھل کر رہے گا۔"

شاہینہ نے زلیخا کی باتوں کا یقین کر لیا، اور کہنے

گی:-

"تمہاری بات دل کو لگتی ہے، ضرور ایسا ہی ہوا ہوگا، لیکن تم

ے کل جیسی بہادری سے کام کیوں نہ لیا؟ سب کے سامنے حقیقت بیان

کیوں نہ کر دی؟"

وہ بولی "اس وقت تک میں بزدل تھی، بے حوصلہ تھی، اور مجھے

پتہ بھی اس وقت چلا جب بھیا یہاں سے نہ جانے کہاں اور کب تک کے

ئے جا چکے تھے۔ ورنہ میں انہیں نہ جانے دیتی، شاہینہ تم نہیں جانتیں،

و کتنے اچھے، کتنے نیک اور کتنے شریف آدمی ہیں ——— ٹھہرو

میں تمہیں دکھاتی ہوں؟"

یہ کہہ کر، وہ جھپٹ سے اٹھی اور بکس کھول کر کارڈ سائز کا ایک فوٹو

ے کر آئی اور شاہینہ کے سامنے رکھتی ہوئی بولی:-

"یہ ہیں میرے بھیا ——— کیوں شاہینہ، کیا چور اچکے

لفنگے، بدمعاش ایسے ہی ہوتے ہیں؟"

اعجاز کی تصویر دیکھ کر شاہینہ بہت متاثر ہوئی، کہنے

گی:-

"یہ تو واقعی بڑے اچھے آدمی معلوم ہوتے ہیں":

زلیخا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:-

”اور شاہینہ ان لوگوں نے میرے اس فرشتہ صفت بھائی پر بھی
تہمت لگائی۔ خدا سمجھے گا، ان سے !

(۱۱)

شاہینہ دراصل زلیخا کو سینما کی دعوت دینے آئی تھی ۔ آج نسیم
[کل]ثوم رقیہ سب سینما دیکھنے جا رہی تھیں ۔ وہ ایک ناممکن سی آرزو لے
[کر] یہاں آئی تھی ۔ جانتی تھی زلیخا اس گروہ کے ساتھ نہیں جائے گی ۔ پھر
[بھ]ی اس سے کچھ ایسا انس پیدا ہو گیا تھا کہ یہ جانتے ہوئے بھی دعوت
[دی]نے پہنچ گئی ۔ مگر دعوت دینے کی جراُت نہ کر سکی ، آتے ہی ایسی باتیں چھڑ گئیں
[کہ] سینما کا خیال ہی ذہن سے اتر گیا

جب کلثوم اور رقیہ تیار ہو چکیں تو شاہینہ کی تلاش شروع ہوئی ،
[ن]سیم نے کہا :۔

" وہ زلیخا کے کمرے میں ہے "

کلثوم نے برا سا منہ بنا کر کہا :۔ " جھاڑو پھرے اس زلیخا کی بچی پر
میں کہتی ہوں آخر شاہینہ اس کو اپنے ساتھ کیوں ہر وقت

لگائے رہتی ہے۔"

یہ تو جوابی تبصرہ تھا۔ پھر انہوں نے رقیہ سے مخاطب ہو کر کہا "بہن کہے دیتی ہوں صحبت کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ میں اسے بالکل پسند نہیں کرتی کہ میری بچی (شاہینہ) اس حرافہ (زلیخا) کے پاس آمد و رفت رکھے۔

رقیہؓ نے آواز دی مگر وہاں تک پہنچی نہیں۔ نادرہ سے بلانا چاہا۔ مگر وہ چھٹی لے کر اپنی بہن کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ نسیم سے کہا:۔

"بیٹی جا بلا لا۔

وہ کانوں پہ ہاتھ رکھ کر بولی

مجھے تو معاف ہی کیجئے اس دن آپ تماشہ دیکھ ہی چکی ہیں میں گئی تو میری شامت ہی آجائے گی۔"

آخر اس مہم کے سر کرنے کا فیصلہ خود رقیہ بیگم نے کیا، وہ خراماں خراماں زلیخا کی طرف بڑھیں لیکن ذرا جھجکتی ہوئی جیسے بکری شیر کی کچھار کی طرف جا رہی ہو۔

رقیہ کو وہاں جاتا دیکھ کر انتہائی نفرت اور بیزاری کے باوجود کلثوم بیگم بھی اپنا شوق تماشا ضبط نہ کر سکیں۔ سوچا ذرا دیکھیں تو سہی۔ یہ لڑکی وہاں کیا کر رہی ہے، اور رقیہ کس طرح پھٹکارتی ہے اسے؟ اور کلثوم کو جاتا دیکھ کر نسیم کے قدم بھی خود بخود اٹھ گئے، اس طرح یہ مختصر سا قافلہ ایک ساتھ زلیخا کے کمرے میں پہنچ گیا۔

[زلی]خا خاموش تھی اور شاہینہ بڑی توجہ کے ساتھ اعجاز کی تصویر دیکھ [رہی] تھی۔

رقیہ نے پہنچتے ہی کہا:۔ "ارے لڑکی تو یہاں کیا کر رہی ہے؟ [دیکھ]ن نکلا جا رہا ہے سینما کا، کچھ خبر بھی ہے؟"

شاہینہ نے چونک کر ماں کو دیکھا اور کہا "چلتی ہوں"۔

نسیم کی نظر تصویر پر اتفاقاً یا یوں کہیئے کہ قسمت سے پڑ گئی۔ اس [نے] باآواز بلند دریافت کیا۔

"شاہینہ یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟"

وہ بولی "تصویر ہے"۔

نسیم جان چکی تھی یہ اعجاز کی تصویر ہے، لیکن معاملہ کو سنگین بناتے [کے لئ]ے اور کلثوم اور رقیہ کو پورے طور پر اس حادثہ کی جانب متوجہ [کر]نے کے لئے اس نے پوچھا:۔

"کس کی تصویر ہے ہمیں بھی دکھاؤ؟"

شاہینہ نے تصویر اس کی طرف بڑھا دی۔ نسیم نے تصویر دیکھی [حیر]ت کی کیفیت اپنے اوپر طاری کر کے ماں کی طرف بڑھا دی۔ "دیکھنا امی" امی جان یہ تصویر دیکھتے ہی پھٹ پڑیں شعلہ جوالہ بن کر بھڑکتی ہوئی [ب]ولیں:۔

"یہ تصویر تیرے پاس کیسے آئی؟"

شاہینہ نے بے دھڑک جواب دیا۔

"زلیخا کے بھائی کی ہے، اس نے ——"

کلثوم نے وہ تصویر رقیہ کی طرف بڑھائی اور کہا:-

"دیکھا بہن؟ دیکھ لیا؟ —— اس لئے میں پسند نہیں کرتی کہ لڑکی کہیں آئے جائے؟ ——"

پھر رقیہ بدنصیب زلیخا کی طرف متوجہ ہوئیں اور فرمایا:-

"میں کہتی ہوں، اس چوٹٹے، دغاباز اور اوباش کی تصویر تو میری بچی کو دکھا رہی تھی"

اور پھر سر پہ ہاتھ رکھ کر فرمایا:-

"کیسا اندھیر ہے؟ —— میں کہتی ہوں، واقعی قیامت قریب آگئی ہے۔ ماشاءاللہ جوان جہان لڑکی (شاہینہ) کو ایک غیر مرد (اعجاز) کی تصویر اکیلے میں بیٹھ کر دکھائی جا رہی ہے —— کیوں! کس لئے؟ ——"

یہ الفاظ سن کر شاہینہ بھی اپنے آپ کو مجرم سمجھنے لگی اور رقیہ بیگم کا پارہ تو نقطۂ عروج پر پہنچ گیا، کہنے لگیں:-

"اس خدائی خوار کی تصویر میری بچی کو کیوں دکھائی جا رہی تھی زلیخا ——"

کلثوم نے لقمہ دیا —— ڈورے ڈالے جا رہے تھے میری معصوم بچی پر ——"

نسیم ہنسنے لگی —— اور اس ہنسی میں کس بلا کا زہر تھا!

ے صرف زلیخا اور کسی حد تک شاہینہ محسوس کر سکی ۔

دفعتہً کلثوم نے ایسی فضا پیدا کر دی تھی جس سے عہدہ بر آ ہونا شاہینہ
جیسی سادہ لوح لڑکی کے لئے آسان نہ تھا، وہ اپنے آپ کو بڑی پارسا
و نیک سمجھتی تھی لیکن اب ایسا محسوس کر رہی تھی جیسے کوئی بہت بڑا
جرم سرزد ہو گیا ہے اس سے!

جب اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو وہ رونے لگی —— ہمارا بھی
زور چلتا ہے گریبان پر ——

---

## (۱۲)

نشاہینہ کو روتا دیکھ کر کلثوم نے فوراً دو قدم آگے بڑھ کر اسے کلیج
لگایا۔ محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہوئی بولیں

"روتی کیوں ہے میری بچی؟ ——— میں جانتی ہوں تو کت
معصوم ہے۔ یہ سارا فساد تو اس چھوٹے کی بہن کا برپا کیا ہوا ہے جو خو
بھی حرفوں کی بنی ہوئی ہے ———

زلیخا نے کہا، "میرا بھائی چھوٹا ہے، نہ میں حرفوں کی بنی ہوئی
کلثوم کی ذلیل فطرت پھر ابھر آئی، اس نے نفلاتے ہوئے کہا
"اے چل بڑی آئی ہے پارسا بن کر ——— میں کہتی ہوں آخ
تجھے ضرورت کیا تھی، اس ڈاکو کی تصویر میری بچی کے ہاتھ میں پکڑا
دی"

زلیخا نے جواب دیا، "تو کون سا جرم ہو گیا؟ وہ بھی کوئی غیر تو نہیں

"ہاں ہاں وہ تو بڑے اپنے ہیں —— جب ہی تو چچا زاد بہن کی گھڑی لے اڑے، اور کسی غم نے نہیں سگے باپ نے جوتے مار کے گھر سے نکال دیا، اب ہوگا کسی جیل کی کال کوٹھڑی ہیں، ضرور یہاں سے جا کر بھی کہیں چوری کی ہوگی۔"

زلیخا نے چیخ کر بھرّائی ہوئی آواز میں کہا:۔

"یہ غلط ہے!"

وہ زہر خند کرتی ہوئی بولیں۔

"اچھا تو کسی محل میں عیش کر رہا ہوگا،"

زلیخا نے کہا، میرا بھائی چور نہیں تھا، ڈاکو نہیں تھا ——

اس نے زہر خند کے ساتھ جواب دیا:۔

"ہاں نصیب دشمناں وہ کیوں چور ہوتا، چور تو ہم ہیں، ہم نے اپنی چیز چرا کے اسکی جیب میں رکھ دی!"

زلیخا اور زیادہ برہم ہو کر گویا ہوئی،

میں اپنے بھائی کے لئے ایسے غلط اور ناشائستہ الزامات نہیں سن سکتی ——"

مصنوعی سنجیدگی کے ساتھ کہنے لگیں:۔

"وہ تو سننا ہی پڑیں گے؛ بنو —— جو جیسا ہوگا ویسا ہی کہا جائے گا، چور کو چور ہی کہتے ہیں۔ سا ہوکار نہیں کہتے؟ —— یا ممکن ہے آج کل کے زمانے میں کہتے بھی ہوں، ہمیں کیا معلوم ——"

نسیم ہنس پڑی، "امی چلئے دیر ہو رہی ہے؟

امیّ نے جواب دیا "بس اب جا چکے، وقت ہی ختم ہو گیا، کل دیکھ
نسیم نے تلخی کے ساتھ کہا۔

"یہ بھی اچھی رہی ——————

اب تو واقعی اس گھر میں رہنا مشکل ہو گیا ہے!"

کلثوم پھر اپنے اصلی موضوع پہ آگئی، کہنے لگی:۔

"میں کہتی ہوں، بھائی تم چور ہو یا ساہوکار۔ لونڈی یارانی۔ ہمیں
مطلب نہیں۔ تم جانو اور تمہارا کام، لیکن یہ تو شرافت نہیں ہے کہ دوسروں
کی بھولی بھالی، سیدھی سادھی نیک اور سادہ لوح لڑکیوں کو اپنے ہاں بلاؤ
اور پھر انہیں پرچانے اور گمراہ کرنے کی کوشش کرو۔

رقیہ کے ہاتھ میں اب تک اعجاز کی تصویر موجود تھی، ایک مرتبہ اس پر
حقارت اور نفرت سے بھری ہوئی نظر ڈالی پھر گویا ہوئیں

"ہونہہ، صورت نہ شکل، بھاڑ میں سے نکل، کچھ صورت بھی ہے۔ معلوم
ہوتا ہے، کسی چانڈو خانے سے چرس پی کر چلا آ رہا ہے (کلثوم سے مخاطب ہو کر)
بہن چاہے تمہیں برا لگے یا بھلا، میں تو اس بات کا فیصلہ کر کے جاؤں گی:"

نسیم نے پوچھا "ممانی جان فیصلہ کیا؟"

وہ بولیں کہ ان (زلیخا) صاحبزادی کے ابا جان آئیں، ان سے پوچھوں گی
یہی تربیت دی ہے آپ نے لڑکی کو؟ یہی سکھایا ہے کہ وہ دوسروں کی لڑکیوں
کو پرچائے اور گمراہ کرے؟ آخر اس منحوس شخص کا میری بچی سے کیا واسطہ
تھا؟ کیوں یہ تصویر دی گئی اسے؟ کس لئے؟ کس مقصد سے؟

نسیم نے اکساتے ہوئے کہا " ہاں ان سے آپ ہی بات کر سکتی ہیں، ہم تو نہیں جھگڑ سکتے، وہ سمجھیں گے ہم دشمنی کی وجہ سے ایسا کر رہے ہیں؟

رقیہ بیگم نے سینہ ٹھونکتے ہوئے کہا :-

" ہاں میں چھوڑوں گی بات وہ کون سے ایسے رستم ہیں اور ہیں تو اپنے گھر کے ہوں گے، ہمیں کسی سے دبنے کی کیا ضرورت ہے ------ ---

کلثوم نے اعجاز کی تصویر رقیہ کے ہاتھ سے لے لی، اس کے ٹکڑے ٹکڑے کئے اور فرش پر پھینک دئے، پھر رقیہ سے کہا :-

" چلو بہن، یہاں وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ؟ بھائی صاحب آئیں تو ان سے بات کرنا۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد زلیخا نے پھٹی ہوئی تصویر کے بکھرے ہوئے ٹکڑے اٹھائے، انہیں ایک لفافہ میں ڈالا اور احتیاط سے بکس میں رکھ دیا ------ جیسے یہ کوئی بڑی قیمتی چیز تھی؟

---

حصّہ ششم

# انقلاب

○

یہ دو دِن میں کیا ماجرا ہو گیا ؟

(۱)

نسیم کی منگنی بڑی دھوم دھام سے صفدر کے ساتھ ہوگئی۔

اس رسم میں اتنی شان و شوکت کا مظاہرہ کیا گیا تھا، کہ کیا شادی میں ہوتا ہوگا، سارا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا، مرد بھی اور عورت بھی، دولت بھی اور شناسا بھی ۔ عزیز بھی اور دور کے رشتے دار بھی، اہل محلہ بھی اور اہل عملہ بھی،

احراز کی تنخواہ بھی معقول تھی اور بالائی آمدنی بھی اچھی خاصی تھی، یہ سب جانتے تھے لیکن یہ بات کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ وہ اتنا زیادہ مالدار ہے کہ صرف منگنی پر یوں بے دریغ روپیہ صرف کر سکتا ہے، جو لڑکی کی منگنی اس شان سے کر سکتا ہے، وہ شادی میں، کیا کچھ نہ کرے گا!

زلیخا ایک قیدی کی طرح اپنے کمرے میں دن بھر قید رہی، نہ اسے اس

تقریب سعید میں شرکت کے لئے بلایا گیا، نہ وہ خود ہی حوصلہ کر سکی، شاہینہ بھی اعجاز کی تصویر کے واقعہ کے بعد سے اتنی سہم گئی تھی کہ گو اس کا کئی بار جی چاہا کہ زلیخا کے کمرے میں جائے اور اسے لے آئے مگر ہمت نہ پڑی، نہ جانے پھر کوئی نیا فتنہ اٹھ کھڑا ہو اور لینے کے دینے پڑ جائیں، بس یہ سوچ کر وہ دل مسوس کر رہ گئی اور زلیخا کو شریک ہونے کی دعوت نہ دے سکی

آج نادرہ بھی بہت مصروف تھی، لیکن اس غیر معمولی مصروفیت کے باوجود تھوڑے تھوڑے وقفہ سے زلیخا کے کمرے میں آ کر تاک جھانک لیتی رہی تھی اور ایک مرتبہ تو خوان میں رکھ کر۔ دوسروں کی نظر بچا کے اور موقع دیکھ کر بہت سا نہایت عمدہ کھانا بھی لے آئی۔ آج کیا کچھ نہ پکا تھا اور جو کچھ پکا تھا سب کا نمونہ اس خوان میں موجود تھا۔

لیکن زلیخا اس پر خلوص پیش کش کو قبول نہ کر سکی، اس نے کہا:۔

"نادرہ یہ لے جاؤ، میں ایک لقمہ بھی نہیں کھاؤں گی، ہرگز نہیں"

یہ بات اس نے کچھ ایسے تیور سے کہی کہ نادرہ کچھ نہ کہہ سکی، الٹے پاؤں خوان واپس لے کر چلی گئی

زلیخا نے آج کچھ نہیں پکایا تھا، اسے یہ اچھا نہیں معلوم ہوا کہ اس ہجوم عام میں وہ اپنے کمرہ سے نکل کر باورچی خانے جائے اور اپنا چولھا سلگائے اعتراضات شروع ہو جائیں، ممکن ہے اس پر بھی انگلیاں اٹھنے لگیں—— ——، طنز و تعریض کے تیر پھینکے جانے لگیں۔ عافیت اس میں تھی کہ اپنے کمرے میں چپ چاپ بیٹھی رہے۔ بلا سے ایک دن فاقہ سہی، کون سی

ت آجائے گی ایک دن کے فاقہ میں

لیکن شام تک یہ کڑاکے کا فاقہ کھلنے لگا۔ بھوک نے بے تاب کر دیا، ج دن بھر اسنے چائے بھی نہیں پی تھی، اس لئے طبیعت اور زیادہ بے قابو ئی۔ آخر جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اٹھ کر ٹہلنے لگی اور جب بھوک کی شدت مد سے باہر ہو گئی تو اس نے تابڑ توڑ دو گلاس پانی کے پی لئے، جی ذرا ٹھہرا اور وہ چادر سے منہ ڈھانپ کر بستر پر دراز ہو گئی۔

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے،
دِل ہوا ہے چراغ مفلس کا!

ور واقعی اس کا دل مفلس کا چراغ ہی تھا۔

سارے گھر میں شہنائیاں بجتی رہیں، گانے ہوتے رہے، چہل پہل ور ہنگامہ خیزی کا سلسلہ جاری رہا۔ سہیلیوں کی چہلیں اور بڑی بوڑھیوں کی داستان طلسم ہوشربا سب کچھ ہوتا رہا مگر زینجا سب سے الگ، سب سے جدا پنے گوشۂ عافیت میں منہ لپیٹے پڑی رہی، نہ جانے کیا خیالات آ رہے تھے، اس کے دل میں؟

---

(۲)

اور نسیم کی منگنی کے ٹھیک تیسرے دن امتیاز واپس آ گیا، احراز نے اس تقریب میں شرکت کے لئے اس سے کئی بار کہا اور اس نے کوشش بھی کی، لیکن رخصت نہ ملی، اور جب رخصت ملی تو اس طرح کہ اس کی ڈیوٹی پھر اپنے شہر ہی میں مستقل طور پر لگ گئی!

امتیاز کے آنے سے زلیخا کا دل مغموم ہو ٹھہر گیا، اس نے آتے ہی اسے باہر مردانے میں بلایا اور پوچھا:۔

کیوں بیٹی میرے بعد کوئی ایسی بات تو نہیں ہوئی جو تمہارے لئے تکلیف دہ ہوئی ہو؟

——————

زلیخا نے دوپٹہ کے دامن سے گرہ باندھتے ہوئے کہا:۔

"ابا جی، اب تو میں عادی ہو گئی ہوں، اس طرح کی دل شکن اور تکلیف دہ باتوں کی، اگر کچھ باتیں ایسی ہوئیں بھی، تو اب ان کے

کرے کیا حاصل ؟ البتہ اس کی مجھے خوشی ہے کہ آپ آگئے ؟ —
پ کی موجودگی میرے لئے سب سے بڑا سہارا ہے ، سب سے بڑی خوشی ہے
ان الفاظ میں ایک پوری داستان درد موجود تھی جسے امتیاز نے سمجھ بھی لیا
اور محسوس بھی کر لیا۔ اس نے ایک آہ سرد کے ساتھ گویا خود اپنے آپ سے

کہا:-

واقعی اب پانی سر سے اونچا ہوتا جاتا ہے ——————
—کوئی نہ کوئی قدم اٹھانا ہی پڑے گا "
زلیخا کو ان الفاظ میں اندیشوں اور خطروں کی ایک دنیا نظر آئی، اس

نے کہا:-

"اباجی میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے آپکے اور چچا جان کے
تعلقات پر اثر پڑے اور شاید آپ کی موجودگی میں اب ان لوگوں کا رویہ
بھی وہ نہ رہے جو آپ کی عدم موجودگی میں رہا کرتا ہے "۔
امتیاز نے جیسے یہ الفاظ سنے ہی نہیں، اس نے کہا:-
میں جانتا ہوں بھائی بہت بڑی نعمت ہے، خواہ وہ کیسا ہی ہو
کلثوم کی ذہنیت بھی مجھ پر منکشف ہو چکی ہے لیکن اگر مجھے احراز کا خیال
ہے۔ تو اس کے ساتھ بھی سابقہ طرزِ عمل قائم رکھنا ہوگا رہی نسیم، تو
وہ لاکھ تم سے چھیڑ چھاڑ کرے، لیکن بہرحال بچہ ہے، میری نظر میں اس
کی بھی وہی حیثیت ہے جو تمہاری ——————
زلیخا نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی،

"یہ تو سچ ہے، لیکن سرکار، کیا رقیہ بیگم اور ان کے حواریوں کو بھی کھلی چھٹی ہے کہ جو چاہیں کریں؟ —— میاں یہ تو انصاف نہیں ہے اس بچی کے ساتھ!"

امتیاز نے نظر اٹھا کر دیکھا تو نادرہ سامنے کھڑی تھی، وہ اسے دیکھ کر مسکرایا اور کہنے لگا،

"آ گئی تو بھی بس کی پڑیا؟"

وہ اسی سنجیدہ لہجہ میں گویا ہوئی

"میاں یہ بات نہیں ہے، میرا خیال ہے کہ اب دونوں کا فیصلہ ہونا چاہیئے۔"

امتیاز نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور سوال کیا،

"کیا کہنا چاہتی ہے تو؟"

وہ بولی:-

"اس گھر کا بٹوارہ ہو جانا چاہیئے، دیوار کھنچ جانی چاہیئے بیچوں بیچ میں ——"

"اس سے کیا فائدہ ہو گا؟"

"اس سے بہت بڑا فائدہ ہو گا —— یہ ہر روز کی دانتا کلکل بند ہو جائے گی، یہ آئے دن کے فسادات ختم ہو جائیں گے، اور میری بچی کے سر پہ ہر وقت جو جوتی سوار رہتی ہے، اس سے نجات مل جائے گی۔

امتیاز خاموشی سے نادرہ کو تک رہا تھا اور وہ کہہ رہی تھی
"صبر اور ضبط کی کوئی حد ہوتی ہے، اس صبر و ضبط کے لئے بچی کی
بلی تو نہیں قربان کی جا سکتی ——— سچ کہتی ہوں میاں دق
ہو جائے گی اسے!

---

(۳۱)

امتیاز نے تمسخر کے انداز میں نادرہ سے کہا :۔
"اب تو باتیں بنانا بہت آگئی ہیں تجھے ؟ ـــــــ یہ سبق کہاں سے رٹ کر آتی ہے ؟"

وہ بولی "جب پڑتی ہے ، انسان سب کچھ سیکھ جاتا ہے !"

امتیاز نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا :۔
"جی چاہتا ہے زلیخا کو رابعہ کے پاس بھیج دوں ، آخر خالہ ہے اور خالہ ماں کی جگہ ہوتی ہے اور خود حج بیت اللہ کو چلا جاؤں اور پھر کبھی واپس نہ آؤں !"

ان الفاظ نے زلیخا پر کچھ عجب قسم کا اثر کیا :۔
رابعہ کا نام آج پہلی مرتبہ اس نے اپنایت کے لہجہ میں امتیاز کی زبان سے سنا تھا ۔ اور بہت خوشی ہوئی ،

واقعی اگر اس الم کدہ سے نکل کر وہ کسی طرح سعادت گنج پہنچ جائے تو وہاں کی فضا ہی دوسری ہوگی۔ رابعہ کا برتاؤ ماں کا سا ہوگا اور

---

"پھر اسے ارشاد یاد آگیا، وہ سوچنے لگی، اب تو کب کا مجھے فراموش کر چکا ہوگا۔ ممکن ہے اس کی شادی ہو چکی ہو۔ ممکن ہے کہیں بات ٹھہر چکی ہو —— نہیں میں وہاں نہیں جاؤں گی خالہ نے مجھے فراموش کر دیا، ارشاد کا اب ذکر ہی بیکار ہے وہاں جانا تو اپنے آپکو ذلیل کرنا ہے۔

اور پھر اسے باپ کے آخری الفاظ یاد آئے، یعنی حج بیت اللہ کے لئے جا کر پھر واپس نہ آنے کا عہد۔

اس بات نے اسے اور زیادہ جنون میں مبتلا کر دیا۔ وہ سوچنے لگی، اگر اباجی چلے گئے تو یہ دنیا میرے لئے تاریک ہو جائے گی۔ نہ میں اس گھر میں رہ سکتی ہوں نہ خالہ کے ہاں رہنا چاہتی ہوں؟ آخر کیا حشر ہوگا میرا؟

یہ سوچتے سوچتے اس نے باچشم پرآب انتیاز سے کہا:۔

اباجی، یہ نہیں ہو سکتا ——

اور پھر وہ رونے لگی، انتیاز نے پوچھا:۔

کیا نہیں ہو سکتا بیٹی ؟

زلیخا نے جواب میں کہا:۔

"نہ میں خالہ کے ہاں جاؤں گی، نہ تنہا آپ کو جانے دوں گی!"

ان الفاظ میں زور تھا، قوت تھی، عزم تھا، فیصلہ تھا،

انتیاز نے محبت بھری نظروں سے پہلی مرتبہ اسے دیکھا اور سوال کیا:۔

"کیوں تو رابعہ کے ہاں کیوں نہیں جائے گی؟"

وہ بولی "اس لئے کہ وہ مجھے بھول چکی ہیں۔ اماں جی کے مرنے کے بعد سے آجتک انہوں نے میری خبر نہیں لی، نہ ایک دن کے لئے یہاں آئیں۔ میں ناخوانده مہمان بن کر وہاں جانا اپنی اور اپنے باپ کی توہین سمجھتی ہوں"

انتیاز نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا:۔

"اپنے باپ کی بھی توہین کا فیصلہ تو کرنے لگی ہے؟"

اور پھر پوچھا، اچھا تو رابعہ کے ہاں نہیں جاتی، اور یہ کیا کہ مجھے تنہا نہیں جانے دے گی،

وہ کہنے لگی، "آپ اگر چلے جائیں گے تو میں یہاں رہ کر کیا کروں گی؟"

"کیا تو بھی میرے ساتھ چلے گی؟"

"کیوں نہیں چلوں گی! یہاں میرا کون ہے؟ بھیا بھی تو نہیں۔ نہ جانے کہاں ہیں؟"

اعجاز کا ذکر سن کر انتیاز کے دل میں تلاطم برپا ہو گیا۔ جیسے اس کے سینہ پر کسی نے گھونسہ مار دیا ہو، جیسے اس کے زخم دل

کھرنڈ کو کسی نے ناخن سے اکھیڑ دیا ہو۔ جیسے اس غم کو جسے اس نے نہ جانے کب سے چھپا رکھا تھا کسی نے دیکھ لیا ہو لیکن ——

اس نے ذرا تلخ لہجہ میں کہا:۔

"اس نالائق کا نام میرے سامنے مت لو۔"

زلیخا سہم کر خاموش ہو گئی

---

(۴)

اور اس گفتگو کے دوسرے دن ایک عجیب و غریب واقعہ رونما ہوا "زلیخا جس کے ہاں" ناخواندہ مہمان بن کر نہیں جانا چاہتی تھی، وہ خود ناخواندہ مہمان بن کر اس کے گھر آیا ——— یعنی رابعہ اور وہ بھی تنہا نہیں، ارشاد کے ساتھ۔

دفعتہً اور بے سان و گمان رابعہ کو دیکھ کر، زلیخا نہ خوشی کا اظہار کر سکی، نہ غم کا، وہ اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی جیسے اسے سکتہ ہو گیا۔

رابعہ نے بڑھ کر اسے کلیجہ سے لگایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، اس کی پیشانی اور رخسار کو بوسہ دیا اور کہا:—

"میری بچی" ———

لیکن روٹھی ہوئی زلیخا نے اس اظہار محبت سے بظاہر ذرا بھی متاثر

ہوئے بغیر کہا :-

"بیٹے خالہ جان ——————— اب تک آپ کہاں

تھیں ؟ مجھ پر غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ، میری ماں اس دنیا سے رخصت

ہوگئی ، میرا بھائی بچھڑ گیا - یہ گھر میرے لئے جہنم بن گیا - مگر آپ نے بات

نہ پوچھی ، خبر نہ لی - بھولے سے بھی یہ معلوم کرنے کی کوشش نہ کی کہ زلیخا زندہ

ہے یا مر گئی ——— کاش میں مر گئی ہوتی ؟"

یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں آب گوں ہو گئیں - رابعہ نے ایک

مرتبہ پھر اسے گلے سے لگا لیا ، خوب پیار کیا اور کہا :-

"میری جوتی رکھی ہے اٹھا اور میرے سر پر مار ، بیشک میں نہیں آئی ، بیشک

میں نے خط نہیں لکھا ، بے شک میں نے خبر نہیں لی کیونکہ میں اس گھر میں

قدم رکھنا نہیں چاہتی تھی ، جہاں میری بہن کا قاتل موجود ہے ، اس

قاتل سے مجھے نفرت ہو گئی تھی - میں تجھے بہت چاہتی تھی ، اعجاز بھی

میرے دل کا ٹکڑا تھا ، لیکن اپنی آپا سے زیادہ تم میں سے کسی کی محبت

بھی میرے دل میں نہیں تھی ، اس قاتل نے اگر میری بہن کو مار ڈالا تو بلا سے

بھانجا اور بھانجی بھی مر جائیں - میں نے تو اپنے دل میں فاتحہ پڑھ لیا تھا !"

زلیخا سمجھ گئی ، رابعہ قاتل انتیاز کو کہہ رہی ہے ، اس نے کہا :-

"لیکن وہ قاتل تو اب بھی موجود ہے ، پھر کیسے آگئیں آپ ؟"

رابعہ نے زیر لب تبسم کے ساتھ کہا :-

"لیکن اب وہ تائب ہو چکا ہے" -

اور پھر زلیخا کے پوچھے بغیر اس نے بتایا :-

بھائی صاحب خود ہی بیگم کوٹ سے سعادت گنج گئے تھے ، اب وہ بدل چکے ہیں - اب آپا سے انہیں ——— مرنے کے بعد — محبت پیدا ہو چکی ہے ، اب ان کا دل محبت کا مخزن ہے ، وہ تمہیں چاہتے ہیں ، اعجاز سے گو بظاہر خفا ہیں اور بہت زیادہ خفا ہیں اس کا ذکر بھی سننا نہیں چاہتے - لیکن میں نے بھی دنیا دیکھی ہے - اس نفرت میں محبت جھلک رہی ہے - اس خفگی میں محبت کا سوتا ابل رہا ہے -

بھائی صاحب میرے پاس آئے ، انہوں نے مجھ سے معافی مانگی ، انہوں نے کہا مریم کی زندگی میں تو قدر نہ کر سکا لیکن اب میں نے اس کی قدر پہچانی ہے - جب تک وہ زندہ رہی مجھ سے میری ہر طرح کی زیادتیوں کے باوجود محبت کرتی رہی ——— اور بیٹی یہ سچ بھی ہے ——— اور اب بھی وہ مجھ سے محبت کرتی ہے ، ہر روز خواب میں آ کر مجھے تسلی دیتی ہے ، میری خدمت کرتی ہے - میں اب اس سے محبت کرتا ہوں ، شاید ہی کسی مرد نے کسی عورت سے اتنی محبت کی ہو جتنی مجھے مریم سے ہے ——— اور یہ کہہ کر بھائی صاحب رونے لگے ،

زلیخا بیٹی تو نے آج تک کبھی اپنے باپ کی آنکھیں روتی دیکھی ہیں ؟

وہ بولی " نہیں خالہ جان کبھی نہیں "

رابعہ نے کہا " اور میں نے ان آنکھوں سے جو ہمیشہ انگارے برساتی رہتی تھیں آنسوؤں کی جھڑی لگتی دیکھی ہے "

زلیخا جیسے یہ سن کر بہت خوش ہوئی، اس نے بے یقینی کے لہجہ میں پوچھا "سچ"؟

رابعہ نے کہا "ہاں بیٹی بالکل سچ۔ وہ مجھ سے یہ عہد کر کے آئے تھے کہ میں آؤں اور وہیں رہوں۔ یا تجھے لے کر سعادت گنج آجاؤں، بھائی صاحب کے آنسوؤں نے میرا دل صاف کر دیا، میں چلی آئی،

---

(۵)

رابعہ کے پہلو میں، بالکل اس کے قریب، ایک خوش پوش، خوش وضع اور خوش اندام شخص کھڑا تھا۔

زلیخا نے اپنی محویت میں، اپنی باتوں کے استغراق میں رابعہ کی داستان عجیب کے انہماک میں اب تک اس طرف توجہ ہی نہیں کی تھی، اب دفعتہً نظر اٹھی تو دیکھا ——— یہ ارشاد تھا۔

عالم خیال میں وہ اکثر ارشاد کو دیکھتی بلکہ اس سے باتیں بھی کرتی رہتی تھی، لیکن عالم مثال میں کتنے دنوں سے، کتنے برسوں سے، اس نے اس کا دیدار نہ کیا تھا، نہ باتیں کی تھیں۔

اور آج وہ بالکل سامنے کھڑا تھا!

اسے دیکھ کر اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ چہرے پہ سرخی سی دوڑ گئی وہ گو مگو اور چہ کنم کی مصیبت میں گرفتار ہو گئی۔

نہ مخاطب کر سکتی تھی ، نہ آغاز کلام !

لیکن یہ مشکل ارشاد نے فوراً آسان کر دی ، اس نے بڑے زور
ے السلام علیکم کا نعرہ مارا ، پھر رابعہ سے کہا :۔

امّی پہلے دستور یہ تھا کہ چھوٹے بڑوں کو سلام کیا کرتے تھے ،
ب زمانہ بدل گیا ہے ، بڑے چھوٹوں کو سلام کرتے ہیں ——
میں نے ٹھیک کہا نا ؟"

رابعہ نے مسکراتے ہوئے کہا " تجھے تو ہر وقت ہنسی دل لگی کی باتیں
سوجھا کرتی ہیں - سیدھا بیٹھ وہ بے چاری اپنی پریشانی میں گرفتار ہے
تجھے سلام کرنے کھڑی ہو جاتی ؟"۔

ارشاد نے برجستہ جواب دیا :۔

" لیکن کیا سلام کا جواب بھی نہیں دے سکتی " ؟

بے ساختہ زلیخا کا ہاتھ ماتھے تک گیا اور پھر وہ اٹھ کر سیدھی باورچی
خانے کی طرف بھاگی -

اس وقت اس کا دِل وفور طرب سے بلّیوں اچھل رہا تھا"

اس وقت وہ بہت خوش تھی -

وہ دل ہی دل میں کہنے لگی ، ارے یہ شخص تو ذرا بھی نہیں بدلا ، وہی
شوخی ، وہی تبسم ، وہی شرارت . ——————

اور واقعی یہ میری غلطی تھی ، مجھے سلام کرنا چاہیئے تھا -"
" لیکن کیسے کرتی ، اوّل تو مجھے ہوش ہی نہیں تھا ، خالہ کو چھوڑ کر

کسی اور طرف دیکھنے کا، دو دکر، اتنے دنوں کے بعد ملنے اور دیکھنے کا اتفاق ہوا تو اجنبیت اور تکلف محسوس ہونا ہی چاہیئے تھا۔

مجھ سے تو سلام کا ڈنڈا نہیں مارا گیا اور حضرت کو موقعہ مل گیا، مجھے جتانے کا، چھڑانے کا۔"

اور پھر وہ جلدی جلدی چائے اور اسکی لوازمات تیار کرنے لگی اور تھوڑی ہی دیر میں چائے کے ساتھ کئی اور چیزیں تیار کر کے خوان میں رکھ کر اپنے کمرے میں پہنچ گئی، جلدی جلدی میز ٹھیک کی، ساری چیزیں سلیقہ سے رکھیں، پھر رابعہ سے کہا:۔

"آیئے خالہ جان چائے تو پی لیں۔"

وہ بولیں "بیٹی ابھی آئی، ذرا منہ ہاتھ دھو لوں،

وہ منہ ہاتھ دھونے چلی گئیں، ارشاد کو پھر چھیڑنے کا موقع مل گیا، اس نے پوچھا:۔

"کیا میں بھی منہ ہاتھ دھو آؤں؟"

وہ دزدیدہ تبسم کے ساتھ گویا ہوئی:۔

"دھو آئیے،—————"

ارشاد نے کہا "لیکن میں گرم پانی سے منہ ہاتھ دھونے کا عادی ہوں"

وہ چائے دانی کی طرف اشارہ کرتی ہوئی بولی:۔

"حاضر ہے —————"

ارشاد ہنس پڑا،

، کیا چائے سے ہاتھ منہ دھولوں ؟ پھر پیوں گا کیا ؟"

وہ بولی "پہلے پی لیجیے، پھر ہاتھ منہ دھو لیجئے گا۔

اتنے میں رابعہ بیگم تشریف لے آئیں۔ ان کے آتے ہی زلیخا نے خوان

لوا ادر جو چیزیں پکائی تھیں سب الگ الگ طشتریوں میں رکھ دیں،

بنائی اور ماں بیٹے کے سامنے رکھ دی۔

ارشاد نے ماں سے کہا: "اچھے میزبانوں سے پالا پڑا ہے جو مہمانوں

سے پہلے پیٹ بھر لیتے ہیں۔"

رابعہ نے ڈانٹا "تو بک بک کئے جائے گا؟"

اس نے اپنی پیالی زلیخا کی طرف بڑھا دی اور خود اپنے لئے بنانے

لگا:

---

(۶)

رابعہ کے آنے سے زلیخا کو بڑا سکون پہنچا اور کلثوم و نسیم نہ جانے کیوں انگار دل پر لوٹنے لگیں۔ بلکہ احراز تک اس کی آمد سے کچھ بے کیف سا نظر آ رہا تھا۔

رابعہ کی آمد ان لوگوں کے لئے حیرت انگیز اور تکلیف دہ یوں تھی کہ وہ مہمان کی طرح دو چار دن کے لئے نہیں آئی تھی بلکہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا، اب وہ یہاں مستقل طور پر ورنہ ایک عرصہ دراز تک مقیم رہے گی،

زلیخا کی حیثیت مریم کی زندگی میں بھی اس گھر کے اندر کچھ نہ تھی، اور اس کے انتقال کے بعد تو وہ بالکل ناچیز ہو کر رہ گئی تھی، لیکن رابعہ مریم نہیں تھی، اس نے آتے ہی اپنے دبدبے اور طنطنے کا مظاہرہ شروع کر دیا۔

رقیہ اور شاہینہ اور صفدر وغیرہ جا چکے تھے۔ نکاح میں ابھی کافی تھے۔ طے یہ ہوا تھا کہ نکاح اور رخصتی کی تقریب ساتھ ساتھ میں آجائے گی، گو جہیز وغیرہ کے لئے کلثوم کو کسی طرح کا نیا بندوبست کرنا تھا۔ پھر بھی احراز کے ایما پر ایک سال کی مہلت رقیہ سے کی گئی جو بادل نخواستہ انہوں نے دے دی۔ صفدر نے لاکھ ہاتھ مارے لیکن بڑوں کے فیصلہ کے آگے سر جھکانا ہی پڑا۔

صفدر جا چکا تھا لیکن اعجاز کا وہ کمرہ جس میں اتنے عرصہ تک وہ رہا تھا، اب تک کلثوم اور نسیم کے کنٹرول میں تھا لیکن رابعہ نے ہی سب سے پہلے اس کمرہ پر قبضہ کیا اور ارشد کو وہاں کا مالک دیا۔ کلثوم اور نسیم کو یہ بات بری تو بہت لگی لیکن زبان سے کچھ نہ سکیں۔ کلثوم کا جی چاہا کہ رابعہ سے ایک جنگ کر ڈالے لیکن اس کے دیکھ کر ہمت نہ پڑی اور ہمت نہ پڑنے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ جب بیگم کورٹ سے آیا تھا، بالکل بدل گیا تھا، اس نے اپنا سارا گھر تحویل میں دے دیا تھا، اور اس نے اس اختیار واقتدار سے اٹھانے میں ذرا بھی تکلف یا تامل سے کام نہیں لیا تھا۔

سب سے پہلے اس نے گھر کے اس حصہ پر جو انیاز کا تھا سفیدی کرائی میں رنگ کرایا۔ ٹوٹے پھوٹے فرنیچر کو ٹھکانے لگایا، نیا اور اچھا خرید کر گھر کو اس طرح سجایا کہ اب واقعی وہ ایک کھاتے پیتے کا گھر معلوم ہوتا تھا۔

زلیخا کی یہ حالت تھی کہ اول تو اس کے پاس کپڑے یوں ہی کم تھے اور اعلیٰ درجہ کے ملبوسات تو گویا بالکل نہیں تھے، معمولی سے لباس میں زندگی کے دن گذار رہی تھی۔ دل بجھ چکا تھا۔ شوق افسردہ ہو چکا تھا۔ مہینوں آئینہ نہ دیکھتی، کنگھی چوٹی سے بھی کوئی دلچسپی باقی نہیں رہ گئی تھی۔

لیکن رابعہ نے زلیخا کو بھی بالکل بدل ڈالا۔ زلیخا کو اپنے ساتھ لے کر خود بازار پہنچی اور اس کی پسند اور اپنے مشورے سے کافی قیمتی اور اچھے کپڑے خرید لائی اور چند ہی روز میں اس کے یہ نئے ملبوسات تیار ہو گئے۔ خوبصورت وہ پہلے بھی تھی لیکن اب حسن کے ساتھ سنگھار کا اضافہ ہو گیا، چار چاند لگ گئے، رانی معلوم ہونے لگی، اب وہ اپنی شان اور ٹھاٹھ میں نسیم سے ٹکر لیتی تھی

اب تک گھر کا سارا کام کاج وہ خود کیا کرتی تھی، یا نادرہ کچھ ہاتھ بٹا لیتی تھی، وہ اس گھر کی خانہ زاد تھی، اس کا معاوضہ کھانا اور کپڑا اتھا۔ کبھی احراز دو چار روپے دے دیتا، کبھی امتیاز اور وہ اسی میں مگن تھی۔ پوری وفاداری کے ساتھ دونوں بھائیوں کے گھر یلو کام کرتی رہتی تھی، چونکہ کلثوم کا دبدبہ تھا۔ اسی لئے زیادہ تر انہی کی خدمت میں حاضر رہا کرتی تھی، اور ان ہی کے کام کیا کرتی تھی۔ لیکن رابعہ نے اس سے باقاعدہ کام لینا شروع کر دیا۔ محض یہ ثابت کرنے کے لئے کہ نادرہ صرف کلثوم کے لئے وقف نہیں ہے، اسے پورا وقت یہاں بھی صرف

رنا ہے ، اس کے علاوہ باہر دری کے کام کے لئے ایک لڑکا بھی ملازم
کھ لیا ۔

امتیاز جس نے نہ گھر سے کبھی دلچسپی تھی نہ گھر کا بجٹ سو پچاس
سے زیادہ بڑھنے دیا تھا ، اب نہایت خوشی سے اعتراض کا ایک لفظ
بھی منہ سے نکالے بغیر یہ تمام مصارف پورے کر رہا تھا ؛

---

(۷)

امتیاز میں اتنا زبردست انقلاب کس طرح آگیا، یہ سوال کلثوم اور اعزاز کے لئے یکساں طور پر تشویش انگیز بھی تھا اور حیرت خیز بھی،

ایک روز کلثوم نے نادرہ سے کہا:-

"اری سنتی ہے۔ میں غسل کروں گی، ذرا میرا سر دھو دینا آج؟"

نادرہ نے نہایت سعادت مندی کے ساتھ وعدہ کر لیا اور کہا:-

"جب غسل خانے جائیے گا، آواز دے لیجئے گا۔ میں جب تک ذرا چھوٹی بیگم صاحبہ کو ناشتہ کرا آؤں،

چھوٹی بیگم یعنی رابعہ!

"یہ لفظ سن کر کلثوم کی تیوریاں چڑھ گئیں، برا سا منہ بنا کر کہا:-

"اے ہے، وہ اب خیر سے ناشتہ بھی نہیں کر سکتیں، تم لقمے ڈالو گی جا کر ان کے منہ میں ——— کیا کہنا ہے بی نبو کا۔"

نادرہ دوپٹہ سے منہ ڈھانپ کر ہنسنے لگی اور گویا ہوئی،

کیا کروں سرکار، حکم یہی ہے ——— بے چاری بڑی بیگم تو اللہ میاں کی گائے تھیں، خدا انہیں جنت نصیب کرے اور یہ اتنی ہی تیز مزاج ہیں!"

یہ غیبت نہیں تھی، دراصل نادرہ کلثوم کے اس پیچ و تاب سے لطف لے رہی تھی۔ کلثوم نے کہا:۔

وہاں ہیں تو سہی، لیکن کسی دن میرے منہ آئیں تو ایک کی دس دس سناؤں گی"

نادرہ دل ہی دل میں دعا مانگا کرتی تھی کہ خدا وہ ساعت سعید جلد لائے جب رابعہ اور کلثوم میں زوردار لڑائی ہو۔ تب ہی ان کا (کلثوم کا) غرور جائے گا ——— اس وقت بھی دل ہی دل میں اس نے یہ دعا مانگی، پھر گویا ہوئی،

"آپ کے منہ لگنا کچھ ہنسی کھیل ہے"!

ان الفاظ میں کلثوم کو اپنی شان جھلکتی نظر آئی۔ کہنے لگی:۔

میں تو بھائی صاحب کی وجہ سے چپ ہوں، لیکن صبر کی بھی کوئی حد ہوتی ہے، کسی دن ایسی خبر لوں گی کہ سیدھی سعادت گنج کا رخ کریں گی"!

نادرہ ہنسنے لگی "بی بی ——— اب تو وہ سعادت گنج جاتی نظر نہیں آتیں!

جیسے کوئی خیال دل میں مچل رہا تھا بے ساختہ زبان پر آگیا۔
ہاں معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے ——— لیکن کیوں؟"

"یہ میں کیا جانوں؟"

"مجھے تو کچھ دال میں کالا نظر آتا ہے؟"

"(ڈوہ لینے کے لئے) بی بی میں سمجھی نہیں!"

"اب اتنی نادان بھی نہ بنو ——— میں پوچھتی ہوں جو دبدبہ مریم کو بھی حاصل نہ تھا، وہ رابعہ کو کیسے حاصل ہو گیا؟"

"یہی تو میں بھی سوچتی ہوں مگر خاک سمجھ میں نہیں آتا۔"

میرا خیال تو یہ ہے کہ بھائی صاحب اس بڑھاپے میں دوسری شادی کریں گے ———

"اے بی بی توبہ کرو، وہ اب شادی وادی نہیں کرنے کے!"

"تو کیا جانے؟ ——— دیکھ لینا، ایک دن ان کے سر پہ سہرا پڑا ہوگا، اور بی رابعہ دلہن بنی نظر آئیں گی ———"

نادرہ کھلکھلا کر ہنس پڑی

"اب ایسا اندھیر بھی نہیں ہے ——— وہ تو چھوٹی بیگم کو اپنی بیٹی کی طرح مانتے ہیں اور ان سے چھوٹی بھی تو بہت ہیں!"

"لیکن بیوہ بھی تو ہیں؟"

"تو اس سے کیا ہوتا ہے؟ ——— ماشاء اللہ جوان لڑکا ہے، انہیں ضرورت کیا ہے شادی کرنے کی!"

میرا دل تو یہی کہتا ہے ، دیکھ لینا ، ایک دن یہ ہو کر رہے گا !

اتنے میں رابعہ کی آواز آئی ، نادرہ ———

اور اپنا نام سنتے ہی نادرہ جھٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور کہنے لگی :-

" بڑی دیر ہو گئی ہے ، آج ضرور میری شامت آئے گی "

کلثوم نے گھور کر اسے دیکھا اور اس وقت تک دیکھتی رہی جب تک وہ نظر سے اوجھل نہیں ہو گئی ، کتنا غصہ تھا اسے نادرہ کی دہشت پر ، گویا اس گھر میں اب کوئی اور بھی تھا جس سے نادرہ ڈر سکتی ہے ❖

———

(۸)

ایک روز زلیخا اپنے کمرہ میں بیٹھی ہوئی کتاب پڑھ رہی تھی، نادرہ کلثوم کی طرف تھی، رابعہ باورچی خانہ میں "لنچ" تیار کر رہی تھی، یکایک ارشاد آ گیا اور وہیں دروازے پر ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا، پھر اس نے پوچھا

"کیا امی یہاں نہیں ہیں"؟

ذرا کے ذرا زلیخا نے کتاب سے نظر ہٹائی اور جواب دیا:-

"دکھائی تو نہیں دیتیں ——"

یہ کہہ کر پھر اس نے کتاب پڑھنا شروع کر دی

ارشاد نے دوسرا سوال کیا،

"تو پھر آخر کہاں ہیں"؟

ذرا کے ذرا اس نے کتاب سے نظر اٹھائی اور بولی:-

"وہ آلیں تو پوچھ کر بتا سکوں گی"

پھر نظریں کتاب پر،
ارشاد جھلایا ہوا اندر آگیا اور زلیخا کے بالکل قریب پہنچ کر

اس نے پوچھا:-
"یعنی آپ کو اتنا بھی نہیں معلوم؟"
اس نے پھر ایک لمحہ کے لئے کتاب سے نظریں ہٹائیں، اور گویا ہوئی:-
"اگر معلوم ہے تو اتنا ہی جتنا آپ جانتے ہیں۔"
ارشاد نے ایک مرتبہ زلیخا کے سراپا پر نظر ڈالی اور پوچھا:-
"میں کیا جانتا ہوں؟ ——— مجھے کیا معلوم ہے؟"

"یہی کہ وہ میری خالہ اور آپ کی امی جان ہیں؟"
"میں بالکل نہیں جانتا اگر جانتا ہوتا تو پوچھتا کیوں؟"

"اسی پر تو مجھے بھی حیرت ہے!"

"یعنی میں جھوٹ بول رہا ہوں؟"
"یہ ذرا سخت لفظ ہے۔ میں اگر اس مفہوم کو ادا کرتی تو میرے الفاظ

یہ ہوتے، آپ درست نہیں کہہ رہے ہیں ———"
"مجھے اب تہذیب کا درس بھی آپ سے لینا چاہیئے؟"
"آپ نے مجھے تو نہیں کہا تھا، اپنے آپ کو کہا تھا اور آدمی اپنے
تئیں جو چاہے کہے اس کا تہذیب یا بدتہذیبی سے کیا تعلق؟"
"آخر ان باتوں کا مقصد کیا ہے؟"
"مقصد؟ ——— میرا خیال ہے ہم دونوں کی باتیں بے

مقصد ہی ہیں۔"

"مجھے یہ تسلیم کر لینے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ میں اوّل درجے کا بے غیرت ہوں۔"

"لیکن آپ تو اس طرح تسلیم کرتے ہیں جیسے میرا یہ مطالبہ ہے"؟

"ہاں یہ آپ کا مطالبہ ہے"

"حالانکہ میں آپ کے بارے میں ایسا تصور بھی نہیں کر سکتی!"

"کیا خیال ہے آپ کا میرے متعلق؟"

"یہ کہ آپ خالہ جان کے بیٹے ہیں۔"

اور ——— ؟

"اور یہ کہ اس وقت بے بات کی بات پر مجھ سے لڑ رہے ہیں۔"

"اور ——— ؟

"اور یہ کہ بے انتہا غصے میں ہیں، لیکن نہ جانے کیوں"؟

"بتا دوں میں بے غیرت کیوں ہوں؟"

"جب میں آپ کو بے غیرت تسلیم ہی نہیں کرتی، تو پوچھ کر کیا کروں؟"

"میں بے غیرت بھی ہوں اور احمق بھی۔"

"مجھے اس سے بھی اختلاف ہے۔"

"میں بے غیرت ہوں، بے وقوف ہوں، گدھا ہوں، —

———

"لیکن میں کیسے مان لوں؟"

"آپ کو ماننا پڑے گا!"

"کچھ زبردستی ہے؟ —— نہیں بھئی!"

"یہ آپ کی دھاندلی ہے!"

"آخر آپ کو اتنا اصرار کیوں ہے، توبہ توبہ اپنے بے غیرت، بے وقوف اور وہ تیسرا لفظ تو میں ہرگز نہیں کہہ سکتی۔ —————— ہونے پر۔"

"اس لئے کہہ رہا ہوں، اس لئے کہ بنا دیا گیا ہوں، اس لئے کہنا پڑا ہے!"

"ایک سانس میں اتنی ساری باتیں کہہ گئے آپ، اب میں کس کس کی تردید کروں؟"

"آپ کو تو پرزور تائید کرنی چاہئیے، کیونکہ یہ سب کچھ آپ ہی کا تو کرشمہ ہے۔"

"میرا کرشمہ ہے یہ سب کچھ؟"

"اور کیا؟ صرف آپ کا، صرف آپ کا۔"

"اگر جانے کی جلدی نہ ہو تو بتا دیجئے، کیوں؟ —————— کیسے؟"

"جی مجھے جانے کی جلدی نہیں، مرنے کی جلدی ہے۔"

خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کیجئے۔

"بہت تکلیف ہوتی ہے آپ کو ان باتوں سے"؟

"ظاہر ہے، ہونی ہی چاہیئے"!

"کیوں ہونی چاہیئے —— کیا میرے مرجانے کے بعد آپ کو اذیت ہوگی، رنج ہوگا؟ دُکھ ہوگا؟ —— بتائیے جواب دیجئے، خاموش رہنے سے کام نہیں چلے گا"؟

"پہلے بتائیے آپ اتنے بھرے ہوئے کیوں ہیں؟ —— کیا کسی سے لڑ کر آئے ہیں؟

"جی نہیں، لڑنے آیا ہوں —— آپ سے"؛

"مجھ سے لڑنے آئے ہیں —— کیوں مگر"؟

"اس لئے کہ آپ کے طرزِ عمل نے مجھے بدحواس کر دیا ہے اور یہ زندگی اب میرے لئے ایک بوجھ بن گئی ہے"!

میرے طرزِ عمل سے اگر آپ کو یہ شکایت ہے تو مجھے اپنی بدنصیبی پر افسوس ہے اس لئے کہ میں نے تو کوئی ایسی بات نہیں کی جو آپ کے لئے اہانت انگیز یا تکلیف دہ ہو —— آپ خود سوچئے بھلا ایسا کر سکتی ہوں میں"؟

"جی ہاں کیا کہنا ہے آپ کا"؟

پھر وہی جلی کٹی باتیں —— آخر ان باتوں کا کچھ سرا بھی تو معلوم ہو"؟

"کیا آپ چاہتی ہیں، کچھ صاف صاف باتیں کروں؟ دقت

"منظور ہے، فرمائیے کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟"

"میں کون ہوں؟"

(ہنسی ضبط کر کے) "ظاہر ہے ہیں وہ الفاظ نہیں دوہرا سکتی،

آپ ابھی کہہ چکے ہیں اپنے لئے، میں تو آدمی ہی کہوں گی"

"اچھا آدمی ہی سہی اور اس کے علاوہ؟"

"اس کے علاوہ خالہ جان کے لخت جگر ہیں۔"

"چلئے آدمی بھی ہوں اور آپ کی خالہ جان کا لخت جگر بھی ہوں؟

اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوں گے، مگر میں تو اتنا ہی جانتی ہوں۔"

"کیا آپ اس ارشاد کو جانتی ہیں جو آج سے بہت پہلے کبھی آپ کے

گھر میں آیا کرتا تھا؟ آپ سے ملا کرتا تھا، آپ سے باتیں کیا کرتا تھا؟ کھیلا کرتا

تھا، جھگڑا کرتا تھا"

"بہت اچھی طرح؟"

"اب وہ کہاں ہے؟"

"میرے سامنے اس کمرے میں۔"

"مگر اس کے ساتھ آپ کا سلوک کیا ہے؟"

"کیا ہے؟ آپ ہی بتائیے۔"

"وہ آپ کو کبھی نہیں بھولا، وہ ہمیشہ آپ کو یاد کرتا رہا۔ اس نے

عالم خیال میں جب دیکھا، آپ ہی کو دیکھا۔ آپ ہی سے ملا، آپ ہی سے

باتیں کیں، لیکن ———

ہاں کہہ ڈالئے لیکن ———

"لیکن آپ نے اسے بھلا دیا، آپ نے اسے کبھی نہیں یاد کیا؟"

"یہ کس نے کہا آپ سے؟"

"میرے دل نے، آپ کے برتاؤ نے۔"

"دونوں جھوٹے!"

"تو کیا میں یہ سمجھ لوں کہ آپ نے مجھے فراموش نہیں کیا؟ آپ نے

مجھے یاد رکھا؟"

واقعہ تو یہی ہے، باقی سمجھنا یا نہ سمجھنا آپ کا کام ہے، آپ جا

"(ذرا جذباتی لہجہ میں) زلیخا کیا تم سچ کہہ رہی ہو؟"

"جھوٹ کہنے کی کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہیئے ——— مگر نعت

آپ "آپ سے تم" پر کیسے آگئے؟

(سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے) لیکن اگر واقعہ یہی ہے جو تم

کہہ رہی ہو تو پھر مجھ سے الگ الگ کیوں رہتی ہو؟ یہ بیگانگی سی کیوں نظر

آتی ہے؟ ایک طرف قرب، ایک طرف دُوری، یہ کیا ماجرا ہے؟

"کوئی ماجرا نہیں، سوچیئے تو آپ کا دل جواب دے سکتا ہے۔

میں نے بہت کچھ سوچا مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔"

"نہیں آپ نے بالکل نہیں سوچا!"

"اچھا تو اب تم ہی بتا دو!"

"آپ آئے میں خوش ہوگئی، جیسے میں نے کوئی دولت پالی۔ آتے ہی آپ نے مجھے چھیڑنا اور ستانا شروع کر دیا۔ میں سمجھی آپ وہی ہیں، ذرا بھی نہیں بدلے۔ مگر اس کے بعد یک بیک آپ کے اندر کچھ جھجک، کچھ رکاوٹ، کچھ اجنبیت سی محسوس ہونے لگی۔ آپ قریب آکر پھر دور ہو گئے۔ میں نے بھی سمجھ لیا، زمانہ بدلتا ہے، موسم بدلتا ہے، وقت بدلتا ہے، انسان بدلتے ہیں، آپ بھی بدل گئے۔

"اور تم خفا ہو گئیں!"

"خفا ہونے کا مجھے کیا حق تھا۔ ہاں یہ ضرور کیا کہ بڑھے ہوئے قدم پیچھے ہٹا لیے۔

"زلیخا کبھی آئینہ بھی دیکھتی ہو تم؟"

"ہاں کبھی کبھی ——— مگر یہ کیوں پوچھا آپ نے؟"

"ایک مرتبہ پھر سے اپنے سراپا پر نظر ڈالو۔"

"الحمد للہ کہ میرا دماغ خراب نہیں ہے۔"

"زلیخا تم آئینہ دیکھو اور میری نظروں سے اپنے آپ کو دیکھو!"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"پھر تم محسوس کرو گی، میرے اندر جھجک کیوں پیدا ہوئی۔"

"اب اس وقت آئینہ ڈھونڈنے کہاں جاؤں، آپ ہی بتا دیں گے تو کیا ہو جائے گا؟"

"زلیخا تم بہت بدل چکی ہو۔"

"میں بدل چکی ہوں؟"

"ہاں ——— پہلے تم ایک الہڑ اور نادان لڑکی تھیں، جسے چڑایا جا سکتا تھا، چھیڑا جا سکتا تھا، بنایا جا سکتا تھا، اور میں نے جب اس گھر میں قدم رکھا تو وہی لڑکی سمجھ کر تمہیں چھیڑا بھی، چڑایا بھی، بنایا بھی،

———

"مگر کیا میں خفا ہو گئی، کیا میں نے آپ سے شکایت کی؟"

"نہیں لیکن میں نے جب باقاعدہ تمھیں دیکھا تو محسوس کیا، تم وہ لڑکی نہیں ہو۔ تم اب دوسری دنیا میں پہنچ چکی ہو، تمہاری آنکھوں میں پہلے چمک تھی، اب سحر ہے، تمہاری باتوں میں معصومیت تھی، اب جادو ہے، تمہارے انداز و اطوار میں۔ پہلے سادگی تھی، اب وقار ہے، پہلے تمہیں چھیڑ کر لطف آتا تھا اور اب ———

"اور اب؟"

"ڈر لگتا ہے،"

زلیخا کھلکھلا کر ہنس پڑی، کہنے لگی:۔

"آپ نے اپنے تئیں بے غیرت، احمق، گدھا اور نہ جانے کیا کیا کہہ ڈالا مگر جو اصل بات تھی وہ نہیں کہی:۔

"وہ کیا بات تھی؟"

"آپ بے وقوف نہیں ہیں مگر دوسروں کو بے وقوف بنانے کی کوشش ضرور کرتے ہیں!"

"کیا کیا میں نے؟

آپ باورچی خانے کی طرف سے آئے، وہاں خالہ جان موجود تھیں، آپ نے ضرور دیکھا ہوگا، لیکن یہاں آکر انجان بن گئے اور مجھ سے پوچھنے لگے امی کہاں ہیں؟

ارشاد نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا:-

"تکلف برطرف تھا، ایک انداز جنوں وہ بھی،

زلیخا بھی مسکرانے لگی!

---

(۹)

رابعہ کو دیکھ دیکھ کر کلثوم تو انگاروں پر لوٹ رہی تھی، بدقسمتی سے رقیہ بھی جا چکی تھی، ورنہ اس کے سامنے دل کے جلے پھپھولے پھوڑ لیتی، اب لے دے کے نادرہ تھی، کبھی کبھی بے ساختہ اس کے سامنے دل کا زہر زبان پر آجاتا تھا لیکن یہ ڈر بھی لگا رہتا تھا کہ کہیں یہ جا کر رابعہ سے نہ لگا دے۔ بھائی صاحب سے نہ کہہ دے تو لینے کے دینے پڑ جائیں۔ کلیجہ مسوس مسوس کر رہ جاتی تھی بے چاری، اور رابعہ کا اقتدار تھا کہ دن بدن بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ وہ پورے طور پر انیاز پر، اس کے گھر پر، اس کے آمد و خرچ پر حاوی ہو چکی تھی۔

آخر سوچتے سوچتے ایک تدبیر کلثوم کے ذہن میں آئی، زلیخا کو ...

جائے یہ اگر آلۂ کار بن جائے تو بڑی آسانی سے رابعہ کا طلسم توڑا جا سکتا ہے ۔ اور پھر بعد میں زلیخا کو بے سہارا اور تنہا پا کر ہدفِ ستم بنایا جا سکتا ہے،

لیکن ایک مصیبت یہ تھی کہ زلیخا سے تعلقات اتنے بگڑ چکے تھے بول چال تک بند تھی ۔ ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی نہ وہ اس طرف آتی تھی، نہ نسیم یا کلثوم اس کی طرف جاتی تھیں، جانے کے لئے منہ بھی نہ جائیے تھا ۔

لیکن ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے، آخر ایک روز کلثوم نے زلیخا کو گرفتار کر ہی لیا

ہوا یہ کہ رابعہ اور ارشاد کسی کام سے شہر گئے ہوئے تھے، امتیاز دفتر میں تھا ۔ نادرہ گھر کے کام کاج میں مصروف و منہمک تھی، زلیخا حسبِ معمول اور حسبِ عادت اپنے کمرے میں بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی،

اس صورتِ حال سے مطمئن ہو کر کلثوم زلیخا کے کمرے میں پہنچ گئی، اور جاتے ہی کہنے لگی :-

"نہ جانے نادرہ کمبخت کہاں مر گئی ہے ——— ادھر تو نہیں آئی تھی ؟

زلیخا یہ عجوبہ دیکھ کر حیرت میں رہ گئی، کہ کلثوم بیگم اس کے کمرے میں رونق افروز تھیں ۔ بہر حال وہ اس کی بڑی تھیں، چچی تھیں ۔ ماں کی جگہ تھیں، تعلقات لاکھ تلخ سہی، لیکن جب وہ اس کمرے میں آئی ہیں

تو شرافت اور سعادت کا تقاضا یہ ہے کہ ان سے بات کی جائے
ان کا ادب ملحوظ رکھا جائے، چنانچہ کتاب میں نشانی لگا کر وہ اٹھ
کھڑی ہوئی اور کہنے لگی :-

"یہاں تو بڑی دیر سے نہیں آئی !
کلثوم جانے کے لئے مڑی اور کہنے لگی :-

"اچھا ——— نہ آئی ہوں گی"۔
زلیخا نے ذرا جھجکتے ہوئے کہا :-

"پان تو کھاتی جائیے ———
اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔ جاتے جاتے رک گئیں اور پھر آکر
بیٹھ گئیں

"تم کھلاؤ گی تو ضرور کھا لوں گی" !
زلیخا نے جلدی جلدی پان بنایا اور بیڑا ان کی طرف بڑھا دیا
زلیخا بے چاری پان لگانا کیا جانے، نہ کبھی کھایا، نہ کھلایا،
جب سے رابعہ آئی تھیں، پاندان کا چلن اس نے دیکھا تھا
خود کھانے کی نوبت تو کبھی نہیں آتی۔ ہاں انہیں بناتے اور پھر
کھاتے دیکھتی رہتی تھی۔ پان بالکل خراب بنا تھا۔ وہ تو
خیریت یہ گذری کہ چونا زیادہ نہیں لگایا۔ کتھہ اتنا زیادہ تھ
دیا کہ کلثوم کا منہ کھٹا ہو گیا۔ پھر بھی انہوں نے فرمایا :
"بڑا سواد ہے تیرے ہاتھ میں" ——— اپنے منہ

تو میں بھی نہیں بتا سکتی، جو عمر بھر سے کھا رہی ہوں۔"
زلیخا نے جواب کچھ نہ دیا، مسکرانے لگی۔

## (۱۰)

اس نہایت بدمزہ پان کو گلاب جامن اور بالوشاہی کی طرح شیر
سے کھاتے ہوئے کلثوم نے کہا :-
"بیٹی آخر کب تک خفا رہو گی اپنی چچی سے ؟"
یہ کہتے کہتے کلثوم کی آواز بھرا گئی اور آنکھیں پرنم ہو گئیں ، زلیخا
نے سوچا ، شاید یہ ضمیر کی خلش ہے جو آنسوؤں کی صورت میں نمودار
ہو رہی ہے ، اس کا دل بالکل صاف ہو گیا ، اس نے کہا :-
"چچی جان ، یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ؟ ——— کہیں چھوٹے بھی
بڑوں سے خفا ہوتے ہیں ؟
کلثوم نے ایک بالشت آگے کھسک کر اسے کلیجہ سے لگا لیا اور
کے سر پر دستِ شفقت پھیرتی ہوئی کہنے لگی :-
"نہیں بیٹی یہ نہ کہو ——— میں خطا وار ہوں ، میں

تصور کیا ہے ۔ مجھ سے تیرا دل دکھا ہے، میں نے تیرے ساتھ [illegible] کی ہے ——

زلیخا کے لئے اس سے زیادہ سننا مشکل ہو گیا، اس نے کہا:۔

"ان باتوں کا ذکر نہ کیجئے، میرا دل آپ سے بالکل صاف ہے، مجھے کوئی شکایت نہیں۔"

ایک مرتبہ پھر کلثوم نے زلیخا کو کلیجہ سے لگایا اور کہا:۔

"بالکل ماں کا دل پایا ہے میری بچی نے —— بہی ادا خدا غریق رحمت کرے بھابی (مریم) کی تھی کوئی کچھ کہہ لے، مگر ان کے دل پر میل نہیں آ سکتا تھا۔

ماں کا ذکرِ خیر سن کر زلیخا اور زیادہ متاثر ہوئی۔ کلثوم نے باتوں کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا ضبط نہ ہوا چلی آئی۔

"تو آپ کو تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ —— مجھے بلا لیا ہوتا؟"

کلثوم نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا:۔

"نہیں، یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ کنواں پیاسے کے پاس نہیں جاتا، پیاسا کنویں کے پاس آتا ہے —— میں آ گئی!"

زلیخا نے زچ ہو کر کہا:۔

جانے کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ میں تو سمجھی نہیں

کلثوم نے گویا اسے راز دار بناتے ہوئے سرگوشی کے لہجہ میں کہا:۔

جاتی ہے ——— ؟ اس انقلاب کا سبب تجھے معلوم ہے؟
ہے کالے دل پر نور کی روشنی نے کیسے قبضہ کر لیا؟"

ان باتوں سے جن پر تصوف کا رنگ غالب تھا، زلیخا کو دلچسپی ہونے لگی، اس نے سوال کیا۔

"آپ ہی کیوں نہیں بتا دیتیں ———"

کلثوم نے اطمینان سے بیٹھتے ہوئے کہا:-

"ذرا ایک پان اور کھالوں، پھر کہوں"

زلیخا کا ہاتھ بے اختیار پاندان کی طرف گیا، اور کلثوم دوبارہ بڑھ کر پان کھانے کو تیار نہیں تھی، اس نے پاندان اپنی طرف گھسیٹ لیا اور بولی:-

"رہنے دے بیٹی تیرے ہاتھ کتھے چھونے سے خراب ہو جائیں گے
پھر اطمینان سے بیڑا بنا کر منہ میں رکھ لیا اور پاندان کو پرے کھسکاتے ہوئے کہا:-

"کئی دن سے لگاتار بھابی کو خواب میں دیکھ رہی ہوں،
بے ساختہ زلیخا کے منہ سے نکلا:-

"سچ آپ نے اماں کو خواب میں دیکھا؟-
مجھے تو خواب میں وہ بالکل نہیں دکھائی دیتیں، شاید خفا ہیں، مجھ سے ہے؟"

عارفانہ انداز میں وہ بولی:-

۔ تجھ سے کیا خفا ہوں گی؟ تیرے لئے تو وہ جنت ہیں۔ بھی یلے قرار
رہتی ہیں، خفا مجھ سے ہیں —— کہہ رہی تھیں۔ تم نے میری زلیخا
کا دل دکھایا ہے، جب تک اسے خوش نہ کر لوگی، میں تم سے خفا رہوں
گی!

---

## (۱۱)

زلیخا اس وقت کچھ کھوئی کھوئی سی تھی، ماں کی یاد، ماں کا خیال ماں کی محبت، ماں کی شفقتیں، نہ جانے کون کون سی چیزیں اس کے دل و دماغ پر حاوی اور مسلّط ہو چکی تھیں۔ کلثوم کی ان باتوں نے اسے اور زیادہ متاثر اور سحر زدہ کر دیا تھا،

یکایک کلثوم کی آواز اس کے پردۂ گوش سے ٹکرائی۔

"وہ جنت کی بی بی مجھ پر خفا ہو رہی تھی اور میرا سر ندامت سے جھکا ہوا تھا۔ میں نے ان سے وعدہ کیا۔ میں زلیخا کو راضی کر لوں گی، خوش کر لوں گی، اب اسے کبھی بھی شکایت کا موقعہ نہیں دوں گی! آنکھ کھلی تو کمرے میں عجیب طرح کی بھینی بھینی خوشبو سی مہک رہی تھی میں سمجھ گئی یہ خیال نہیں حقیقت ہے خواب نہیں واقعہ ہے، چنانچہ بیٹی میں تیرے پاس معافی مانگنے آئی ہوں، تجھے خوش کرنے آئی ہوں

تو معاف کر دے گی، خوش ہو جائے گی تو بھابی جان مجھے معاف کر دیں گی، خوش ہو جائیں گی مجھ سے

زلیخا کو بڑی حد تک ان باتوں کا یقین آ گیا، اس نے کہا:۔

چچی جان کہہ تو چکی، میرا دل صاف ہے، مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں، میں خوش ہوں آپ سے، ــــــ

کلثوم نے پوچھا " تو بھابی کو اطمینان دلا دوں؟ ان سے کہہ دوں کہ تو خوش ہے؟ تو نے معاف کر دیا؟"

زلیخا نے جواب دیا، " ہاں کہہ دیجئے!"

کلثوم نے اسے گلے سے لگاتے ہوئے کہا:۔

"میں قربان ــــــ تو نے میرے دل کا بوجھ اتار دیا ــــــ ــــــ بیٹی غلطی کس سے نہیں ہوتی؟ مجھ سے بھی ہو گئی اور اب سوچتی ہوں تو ایسی شرمندہ ہوتی ہوں، کہ کیا کہوں؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے کیا ہو گیا تھا؟"

ان باتوں کا جواب زلیخا کے پاس کیا تھا۔ وہ خاموش سنتی رہی

کلثوم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا:۔

"بیٹی یہ نادرہ بھی بڑی مال زادی ہے۔ یہی کی چڑیا یہی ہے جس نے مجھ سے تجھ سے بدظن کر دیا تھا۔

یہ انکشاف زلیخا کے لئے ناقابل یقین تھا، وہ نادرہ کی وفاداری محبت، خلوص اور سچائی کو دل سے قائل تھی، کہنے لگی:۔

نہیں چچی جان نادرہ ایسی نہیں ہے"!

چچی جان نے چمک کر کہا " تو کیا جانے بیٹی ؟ نہ جانے کیسی کیسی باتیں تیرے متعلق کہا کرتی تھی،

زلیخا دل میں ہنسی، اس نے سمجھ لیا، یہ "عذر گناہ بدتر از گناہ" ہے، لیکن زبان سے کچھ نہ کہا اور کہا تو صرف اتنا۔

"خیر جو ہونا تھا، ہوگیا، اب ان باتوں کے ذکر سے کیا حاصل ہے"
کلثوم نے گویا یہ بات سنی ہی نہیں، وہ تو اپنی منصوبہ بندی میں مصروف تھی، اس نے کہا:۔

"لیکن بیٹی تجھے اپنے کہے کا ثبوت دینا ہوگا۔ تب میرا دل مطمئن ہوگا"؟

ثبوت کے لفظ پر زلیخا ذرا چونکی، اس نے کہا:۔
"ثبوت کیسا چچی جان"؟

وہ بولیں، اگر واقعی تو نے پچھلی باتیں بھلا دی ہیں تو پھر نسیم کی شادی میں تجھے شریک ہونا پڑے گا ——— کر وعدہ! یت
یہ وعدہ کرنے پر زلیخا ہرگز تیار نہیں تھی۔ اسے کلثوم سے اتنی شکا نہیں تھی جتنی نسیم سے، اسے کلثوم نے اتنی ذہنی اذیت نہیں پہنچائی تھی جتنی نسیم نے۔ رقیہ اور کلثوم نے اسے اتنا ذلیل بھی نہیں کیا تھا جتنا نسیم نے۔ پھر بھی آج کے خوشگوار واقعہ کو وہ تلخی سے بدلنا نہیں چاہتی تھی، اس نے جواب دینے کی بجائے سوال کیا

"کب ہو رہی ہے نسیم کی شادی؟"

کلثوم نے کہا "وہ لوگ کسی طرح مانتے ہی نہیں، بہت اصرار کر رہے ہیں —— آج جنوری کی کون سی تاریخ ہے؟"

زلیخا نے بتایا "چوتھی!"

کلثوم نے کہا، "بس مارچ کی پندرہ تاریخ کو خدا نے چاہا تو دلہن بن کر اس گھر سے رخصت ہو جائے گی۔ اس عرصہ میں سارے انتظامات مکمل ہو جائیں گے۔"

---

## (۱۲)

اور پھر دفعتاً کلثوم نے سوال کیا

"یہ رابعہ بیگم کہاں گئی ہیں؟"

وہ بولی "بازار گئی ہیں کچھ سامان خریدنے!"

"اور ارشاد؟"

"وہ بھی انہی کے ساتھ گئے ہیں"

"بیٹی یوں تو رابعہ تیری خالہ ہیں اور خالہ ماں کی جگہ ہوتی ہے لیکن ایسی خالہ دشمن کی بھی نہ ہو۔ جو بن ماں کی بھانجی کو اپنے لئے تباہ ہو جانے دے ——— بلکہ بھینٹ چڑھا دے اپنی خوشی پر"

یہ عجیب و غریب الفاظ سن کر زلیخا کا بدن سنسنانے لگا اسے غصہ بھی آیا وہ اپنی خالہ کو ماں سے زیادہ چاہتی تھی، خالہ کے دامن میں جو لازوال مسرت اور عافیت اسے حاصل ہوتی تھی، وہ دنیا کی ہر

تی اور گراں بہا تھی۔ خالہ کے آنے سے پہلے اس گھر میں اس کی حیثیت
یا تھی؟ وہ ہر وقت ذلیل کی جاتی تھی، اسے چور بنایا جاتا تھا، اسے
میں ثابت کیا جاتا تھا۔ وہ اس وسیع گھر کے اس مختصر سے کمرے
میں قید رہنے پر مجبور تھی، لیکن خالہ کے آتے ہی نقشہ بدل گیا۔ سماں
ل گیا۔ حالات بدل گئے، اب کون تھا جو اسے ذلیل کرسکے؟ اسے
دکار سکے؟ اس پر تہمت لگا سکے؟ اب وہ اپنے مختصر سے کمرے میں
مگر بند رہنے پر مجبور نہیں تھی۔ وہ آزاد تھی، یہ گھر اس کا تھا،
یہاں اسے وہی اختیار اور اقتدار حاصل تھا جو نسیم کو اپنے گھر میں
ر خالہ کا حال کیا تھا؟ بھانجی پر دن رات صدقے قربان ہوا کرتی
یں، ذرا اس کے سر میں درد ہوا اور وہ اپنا دل پکڑ کر بیٹھ گئیں،
ذرا وہ افسردہ یا مغموم نظر آئی اور وہ اس پر صدقے واری ہونے
یں، کسی وقت اس نے کھانا نہ کھایا، اور وہ پریشان ہوگئیں، وہ
ے آرام پہنچانے کے لئے رات رات بھر جاگتیں اور دن دن بھر کام
نے میں خوشی محسوس کرتی تھیں اور اس کے لئے ہر ایثار اور ہر قربانی
یار رہتی تھیں، اور وہ اکثر سوچا کرتی تھی، اگر ماں زندہ ہوتیں تو
اید وہ بھی اتنا نہ چاہ سکتیں، جتنا خالہ جان مجھے چاہ رہی ہیں،
ں کی محبت مجھ میں اور بھیا (اعجاز) میں منقسم ہو جاتی لیکن خالہ
ے تو ارشاد کی محبت بھی مجھی کو دے دی ہے

اس خالہ کے متعلق کلثوم کے یہ تاثرات معلوم کر کے اسے بے حد

تکلیف ہوئی، اس کا جی چاہا کوئی سخت جواب دے لیکن یہ سوچ کر خاموش رہی کہ اس بیچاری کو تو ان سے خفا ہونا ہی چاہیئے، ان کے آتے ہی ان کی بلا شرکت غیرے حکومت ختم ہوگئی اور پھر بحث کرنے سے کیا حاصل؟ یہ خالہ کے بارے میں لاکھ بدگمانیوں سے کام لیں، ان کا بگاڑ کیا سکتی ہیں؟ وہ اپنی جگہ پہ یہ اپنی جگہ پر۔ پھر بھی بالکل خاموش نہ رہ سکی، اس نے کہا:۔

"چچی جان، ایسا تو نہیں ہے، خالہ مجھے اتنا چاہتی ہیں کہ شاید آپ بھی نسیم کو اتنا نہیں چاہتیں۔ وہ مجھے بہت چاہتی ہیں، آپ اس کا اندازہ بھی نہیں کرسکتیں ——

کلثوم کو اس جواب کی توقع تھی، لہذا نہ وہ مایوس ہوئی، نہ دل شکستہ، اس نے کہا:۔

" بیٹی کاش ایسا ہوتا —— لیکن تو نہیں جانتی، بہت جلد تیرے سر پر کیسی قیامت ٹوٹنے والی ہے اور جب وہ قیامت آئے گی، تب تجھے احساس ہوگا کہ اپنی سادہ لوحی کے باعث کتنی بڑی غلط فہمی میں مبتلا تھی۔

ان الفاظ نے ایک مرتبہ تو واقعی زلیخا کو چونکا دیا، اس نے اس گفتگو کو نہ بڑھانے کا ارادہ کر چکنے کے بعد بھی پوچھ ہی لیا:۔

قیامت کیسی چچی جان —— میں بالکل نہیں سمجھ سکی آپ کا مطلب؟

چچی جان نے ایک مرتبہ پھر نہایت چاؤ اور پیار سے پان بنایا، بیڑا منہ میں رکھا، پاندان زور سے بند کیا اور اسے پرے ہٹاتے ہوئے اور نہر خند کرتے ہوئے پوچھا:۔

"بتا دوں؟ ——"

زلیخا نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ جواب دیا:۔

"بتا دیجئے ——"

کلثوم نے اس کے اشتیاق کی آگ کو بھڑکاتے ہوئے دریافت کیا:۔

"تو مجھ سے پھر تو خفا نہیں ہو جائے گی —— اللہ جانتا ہے اس خطرہ سے صرف بھابی کی محبت اور تیری الفت کے باعث آگاہ کر رہی ہوں، ورنہ مجھے کیا تھا جو چاہے ہو جاتا"

زلیخا سخت ذہنی کشمکش میں تھی کہ آخر وہ کون سی قیامت ہے جس کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے؟ وہ کون سا خطرہ ہے جو اس کے سر پر منڈلا رہا ہے، لیکن اسے نظر نہیں آتا، آخر وہ ضبط نہ کر سکی اور سوال کرنے پر مجبور ہو گئی:۔

"چچی کچھ بتائیے بھی تو سہی بات کیا ہے؟"

کلثوم نے ادھر ادھر دیکھ کر جیسے دیوار ہم گوش دارد سے خائف ہیں بہت آہستہ سے کہا:۔

"وہ بہت جلد تیری ماں بن جائیں گی"

زلیخا پر بجلی گر پڑی

اس نے بروقت، اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے پوچھا :-

"یعنی ——

کلثوم نے نہایت اطمینان سے جواب دیا

"یعنی کیا؟ —— بھائی صاحب شادی کر رہے ہیں
بیگم سے اس بڑھاپے میں، تیری قسمت پھوڑنے کے لئے!

زلیخا کے تن بدن میں آگ لگ گئی، اس نے لاکھ لاکھ اپنے جذبا
ضبط کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکی، کلثوم نے اسے برا بھ
کہہ لیا ہوتا۔ گالیاں بھی دے لی ہوتیں، تو وہ برداشت کر لے جا
اف نہ کرتی حرف شکایت زباں پر نہ لاتی، لیکن اپنی خالہ کے بارے
ایسے ناشائستہ اور ناپاک خیالات سن کر اسے تاب ضبط نہ رہی۔ اس
نے کہا :-

میں ایسی باتیں نہیں سن سکتی"

کلثوم نے یہ دیکھ کر کہ اتنی دیر کی محنت رائگاں گئی اور وار اوچھا پ
بڑے ٹھنڈے اور میٹھے لہجہ میں کہا :-

"شاید تجھے میری بات کا یقین نہیں آیا ——"

زلیخا نے جواب دیا :-

ہاں بالکل یقین نہیں آیا، آ بھی نہیں سکتا۔

میں آپ سے زیادہ اپنے باپ اور اپنی ماں کی بہن کو جانتی ہو
مجھے آپ کا ادب ملحوظ ہے، ورنہ شاید میں سخت جواب دیتی۔ بہتر ہے

.... اس مسئلہ پر گفتگو نہ کریں ——

کلثوم نے پسپا ہوتے ہوئے کہا :-

"میں نے تو تمہاری ہمدردی میں ایک بات کہی تھی، بیٹی بری لگتی ہے تو چلو خاموش ہوئی جاتی ہوں، قسم لے لو، جواب کچھ کہوں۔"

زلیخا نے بگڑے ہوئے تیور اور درشت لہجہ میں کہا :-

"شکریہ —— اور کان کھول کر سن لیجئے کہ جو کچھ آپ نے کہا ہے اگر وہ سچ ہے تو مجھ پر قیامت کیوں ٹوٹنے لگی؟ میرے لیے کوئی خطرہ کیوں پیدا ہونے لگا؟ وہ میری ماں اب بھی ہیں، جب بھی رہیں گی اگر وہ ایسا کر بھی لیں تو شرعاً، اخلاقاً، قانوناً کون سا جرم کریں گی؟

اس جواب کی تو کلثوم کو ہرگز توقع نہیں تھی، گویا ساری اسکیم ناکام ہوئی کہنے لگیں :

ہاں بیٹی میرا کیا ہے، تم جانو اور وہ جانیں مجھے کیا غرض پڑی ہے، کسی کے پھٹے میں ٹانگ اڑانے کی، واقعی عجیب زمانہ آگیا ہے ............ یہ سب قرب قیامت کی علامتیں ہیں۔

زلیخا پھر کوئی سخت جواب دینے والی تھی کہ دھڑسے دروازہ کھلا اور ارشاد اندر، اور اس کے پیچھے پیچھے رابعہ !!

کلثوم کو اپنی منصوبہ بندی کے جوش میں اس کا احساس بھی نہ

ہو سکا کہ کتنی دیر ہو چکی ہے یہاں بیٹھے بیٹھے؟ ان لوگوں کو دیکھ کر ایک مجرم کی طرح اس کا چہرہ سفید پڑ گیا اور وہ چپکے سے اٹھی اور کسی سے مخاطب ہوئے بغیر واپس چلی گئی، اتنی تیزی سے کہ نادرہ چائے کی ٹرے لیکر آرہی تھی اس سے ٹکرا کر خود گرتے گرتے بچیں، لیکن ٹرے گرادی

---

حصہ ہفتم

# شادی و غم

شادی جو ہوئی غم کے بھی پہلو نکل آئے
جب کوئی ہنسا ساتھ ہی آنسو نکل آئے

(۱)

کلثوم کو اس طرح حواس باختہ اور سراسیمہ جاتے ہوئے دیکھ کر رابعہ
...ازلیخا سے پوچھا:۔
"خیریت تو ہے؟ آئیں کیوں؟ ——— اور مجھے دیکھتے ہی
...ا کیوں گئیں؟"
ارشاد نے لقمہ دیا،" وہ تو جانا ہی چاہتے تھا۔ آب آمد تیمم
...برخاست!"
رابعہ نے ڈانٹا،" تو ہر معاملہ میں ٹانگ کیوں اڑاتا ہے؟"
"لیکن خالہ اماں بات یہی ہے، وہ آپ کو آتا دیکھ کر ٹھہر نہ سکیں۔"
"اے ہے تو کیوں؟ میں نے کیا بگاڑا ہے ان کا؟"
"آپ نے کیا نہیں بگاڑا ہے؟ ——— اس سارے گھر پر وہ
...بلا شرکت غیرے حکمراں تھیں۔ آپ کے آتے ہی وہ طلسم درہم برہم ہو

گیا۔"

"تو بیٹی خوش ہوں یا خفا، اپنے جیتے جی تو انہیں تجھ پر حکومت کرنے دوں گی نہیں۔"

"اس مایوسی نے انہیں حواس باختہ کر دیا ہے۔"

"لیکن اس وقت کیوں آئی تھیں؟"

"کچھ امیدیں لے کر!"

"امیدیں کیسی بیٹی؟"

"یہ کہ آپ بہت بُری ہیں، آپ کا ظاہر کچھ ہے، باطن کچھ ہے، آپ درحقیقت میری سب سے بڑی دشمن ہیں ——"

اور سب سے بڑی دوست وہ خود ہیں؟ ارشاد نے مداخلت کی۔

زلیخا نے جواب دیا۔ "یہی ظاہر کر رہی تھیں - ان کا خیال تھا میرا حافظہ بہت کمزور ہے۔ میں سب کچھ فراموش کر چکی ہوں، حالانکہ —"

"مجھے یاد سب ہے، ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ یاد نہ ہو —— کیوں جی؟"

زلیخا مسکرانے لگی، رابعہ نے پھر ڈانٹا

"تو نہیں چپے گا؟"

پھر زلیخا سے پوچھا

"آخر کہہ کیا رہی تھیں، یہ بھی تو معلوم ہو!"

"خالہ جان چھوڑیئے ان باتوں کو —— ان کی تو عادت

ی یہی ہے"؟

ارشاد نے پھر مداخلت کی

"یہ کیوں نہیں کہہ دیتیں، یہ راز کی باتیں ہیں"؛

زلیخا کی تیوریاں چڑھ گیئں، اس نے ذرا درشت لہجہ میں کہا :-

خالہ جان دیکھ لیجئے مجھے ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں :

رابعہ نے پھر ارشاد کی خبر لی،

"اب تو جاتا ہے کہیں نکالوں کان پکڑ کے تجھے یہاں سے"؛

اس نے سوکھا سا منہ بنا کر کہا :-

"واہ بھئی کیا اخلاق ہے - مہمانوں کو کان پکڑ کے نکال دیا جاتا

ہے اپنے ایوان شاہی سے"؛

اتنے میں نادرہ دوبارہ چائے تیار کر کے لے آئی اور گفتگو کا موضوع

بدل گیا۔

اصل میں زلیخا وہ باتیں رابعہ کے سامنے دوہرانا نہیں چاہتی تھی جو کلثوم نے کہی تھیں - وہ جانتی تھی یہ باتیں اگر اس کے منہ سے نکلیں تو ...بات آجائے گی اور وہ آئے دن کی خانہ جنگیوں سے اتنی دل برداشتہ ...سراسیمہ ہو چکی تھی کہ اب کم از کم اپنے منہ سے کچھ کہہ کر کوئی فساد ...پا کرنا نہیں چاہتی تھی - یہی وجہ تھی کہ رابعہ کے استفسار کے باوجود ...اس نے اصل بات زبان تک نہیں آنے دی - اور رابعہ کے وہم و گمان ...میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ یہ ہمی اور دشمنی میں کلثوم شرافت اور

انسانیت کی حدوں کو توڑ سکتی ہے،

اور کلثوم گو زلیخا کی باتوں سے مایوس ہو گئی تھی لیکن درحقیقت مایوس نہیں ہوئی تھی، چنانچہ اس واقعہ کے دوسرے روز ———

———

## (۲)

سہ پہر کا وقت تھا۔ امتیاز مردانے میں بیٹھا کسی رسالہ کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ نادرہ چائے لے کر آگئی۔ اس نے رسالہ ایک طرف رکھ دیا اور چائے سے شغل شروع کر دیا، اتنے میں احراز بھی اندر سے آیا اور اس کے پاس بیٹھ گیا۔ امتیاز نے نادرہ سے کہا:۔

"احراز بھی چائے پئے گا، اس کے لئے کچھ کھانے کو بھی لاؤ۔"

ابھی نادرہ نے اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی تھی کہ کلثوم ایک طشتری میں بھنے ہوئے مٹر، کچھ سموسے اور کھجوریں لے کر آئی، نادرہ پر خفا ہو کر بولی

"کمبخت کہہ دیا تھا، بھائی صاحب چائے کے لئے بیٹھیں تو مجھے بتا دینا، لیکن تو اپنے ہوش میں کب ہے؟"

وہ معذرت کرتی ہوئی بولی:۔

"بھول گئی بی بی"؟

ناوافقتہ طور پر طنز کا تیر چل ہی گیا، کہنے لگی:۔

"ہاں ہماری باتیں کیوں یاد رہیں گی تجھے"!

وہ چپ ہو گئی، امتیاز نے سموسہ منہ میں رکھ کر چباتے ہوئے کہا:۔

بڑے مزے کا ہے ——— لیکن آج یہ عنایت کیسے ہو گئی ہم پر؟ ——— ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں ———

یہ کہہ کر امتیاز نے ایک قہقہہ لگایا، کلثوم کچھ جھینپ سی گئی، کہنے لگی:۔

"بھائی صاحب کی یہی باتیں ——— آج نسیم نے یہ چیزیں پکائی تھیں اور بیتاب ہو رہی تھی کہ بڑے ابا ضرور چکھیں ———

"لیکن وہ کیوں نہ آئی؟ ——— کہاں ہے"؟

"میں نے تو کہا تھا تو خود دے کر جا لیکن بہت ڈرتی ہے آپ سے"!

"ڈرتی ہے؟ ——— کیا میں ہوا ہوں؟

احرار نے مداخلت کی "بھائی صاحب اس گھر میں آپ سے کون نہیں ڈرتا۔ رعب ہی کچھ ایسا ہے آپ کا"؟

امتیاز نے کلثوم سے پوچھا:۔

"کیوں بہن تم بھی ڈرتی ہو مجھ سے"؟

وہ بولی "ہمیشہ سے بھائی صاحب"!

امتیاز نے پھر ایک قہقہہ لگایا اور کہا :-

"حیرت ہے ——— میں اپنے آپ کو اتنا ڈراؤنا آدمی نہیں سمجھتا تھا :"

احراز نے کہا "گھر میں جو سب سے بڑا ہو، اس سے ڈرنا بھی چاہیئے سب کو، اس طرح گھر کا نظم و امن قائم رہتا ہے :"

امتیاز نے گویا ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا :-

"اچھا بھئی ڈر لو جتنا جی چاہے۔"

کلثوم نے پوچھا بھائی صاحب تھوڑے سے مٹر اور لے آؤں ؟"

امتیاز نے مٹر الگ کھسکاتے ہوئے کہا :-

"نہیں بھئی بہت کھا لیا ——— معدہ یوں ہی ٹھیک نہیں رہتا :"

کلثوم نے وہ طشتری پھر اٹھالی جس میں مٹر لائی تھی۔ پھر جاتے جاتے احراز سے کہا :-

"تم بھی چچا ہو، آخر تم اپنا فرض ادا کیوں ——— نہیں کر چکتے، کسی طرح، کتنا اچھا ہوتا اگر صفدر اور نسیم کی شادی کے موقع پر یہ بوجھ بھی اتر جاتا سر سے !"

کلثوم تو اتنا کہہ کر چلی گئی امتیاز نے احراز سے پوچھا :-

"کیا بات ہے ؟ یہ کلثوم کیا کہہ گئی ؟"

احراز نے کچھ سوچتے ہوئے قدرے تامل اور تذبذب کے ساتھ کہا :-

"بھائی صاحب بات یہ ہے کہ ـــــــ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے نسیم کی شادی صفدر سے ہو رہی ہے۔"

"ہاں معلوم ہے پھر؟"

"منگنی کے سلسلہ میں صفدر کی ماں، باپ بہن وغیرہ بھی یہیں آئے تھے!"

"ہاں یہ بھی میں نے سنا ہے میں تو اس زمانے میں بیگم کورٹ گیا ہوا تھا"

"جی ہاں ـــــــ صفدر کی والدہ کو زلیخا بہت پسند آئی۔"

"اچھا پھر؟"

وہ چاہتی ہیں صفدر کے چھوٹے بھائی سے زلیخا کا نکاح ہو جائے،

"ہوں ـــــــ تمہاری کیا رائے ہے؟"

"میری رائے وہی ہے جو آپ کی ـــــــ ویسے اچھا ہے اگر دونوں لڑکیاں (نسیم اور زلیخا) ایک ہی گھر میں رہیں!"

"کلثوم کو بھی اس سے اتفاق ہے؟"

"جی بہت زیادہ، بلکہ سچ پوچھئے تو انہی کی تحریک پر یہ بات آگے بڑھی"

"لڑکا ہے کیسا؟"

"بہت اچھا ـــــــ صفدر کا بھائی ہے!"

"اخلاق و عادات؟"

"تعریف نہیں ہو سکتی!"

"تعلیم ـــــــ؟"

"تعلیم ؟ کوئی ڈگری تو نہیں ہے، ویسے خاصا پڑھا لکھا ہے ——— اور ضرورت بھی کیا ہے ڈگری کی ؟ گھر میں کھانے کو کمی تو ہے نہیں۔ دس کو کھلا کر کھائے گا"

"لیکن دولت ہی تو سب کچھ نہیں ہے ——— میں نے تو سنا ہے وہ نہایت آوارہ اور عیاش قسم کا آدمی ہے، شراب بھی پیتا ہے، اور جوا بھی کھیلتا ہے۔ کیا یہ سب گپ ہے ؟"

"بالکل گپ ہے بھائی صاحب، وہ تو نہایت سعید اور ہونہار لڑکا ہے !

"صورت شکل کیسی ہے ؟

"وہ بھی بُری نہیں، ناک نقشہ تو بہت ہی اچھا ہے، ویسے رنگ ذرا سفید ہے"

"یعنی بہت گورا ہے ؟"

"جی ہاں ——— بہت زیادہ گورا رنگ بھی تو بعض دفعہ بلائے جان بن جاتا ہے، یعنی سورج مکھی۔ ———

"ہاں میں سمجھ گیا !

"ویسے علاج ہو رہا ہے اور شفاء الملک صاحب نے امید دلائی ہے کہ ٹھیک ہو جائے گا، لیکن حقیقت میں یہ کوئی مرض نہیں ہے۔ نہ اس کا صحت پر کوئی اثر پڑتا ہے۔ پھر یہ بھی تو دیکھیے، بچی گھر کی گھر ہیں روپے پیسے کی کمی نہیں، عیش کرے گی، راج کرے گی"

(۳)

نادرہ چائے کی ٹرے لے کر واپس جا چکی تھی، اس کے سامنے ہی کلثوم نے احراز کو بات کرنے کے لئے اکسایا تھا۔ سارا پلان اس کی سمجھ میں فوراً آگیا تھا۔ ٹرے لے کر جیسے ہی واپس پہنچی، رابعہ نے کہا:۔

"ذرا جا کر سنیئے تو سہی، کیا باتیں ہو رہی ہیں بھائی بھائی میں۔"

وہ بولی: "مجھے کیا پڑی ہے، بھائی بھائی کی باتیں سننے کی، وہ کہنے لگی، پھر مجھے الہنا نہ دیجئے گا، کہے دیتی ہوں!"

اب تو رابعہ کے کان کھڑے ہوئے، پوچھا؟

"کس طرح کی باتیں ہو رہی ہیں؟"

وہ کہنے لگی "وہی تو کہتی ہوں سن لیجئے جا کر——— آپ ن

باتیں ہیں،

رالعہ نے پھر کوئی سوال جواب نہیں کیا، پپکی پپکی گئی اور دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو کر احراز اور انتیاز کی باتیں سننے لگی اور جب کسی طرح ضبط نہ ہو سکا تو دروازہ کھول اندر،

انتیاز نے اسے دیکھتے ہی کہا

"خوب آگئیں تم رالعہ! بڑی ضرورت تھی تمہاری، دیکھو یہ احراز کیا کہہ رہے ہیں؟

رالعہ نے اپنے جذبات اور تاثرات ظاہر نہیں ہونے دیئے، کہنے لگی،

"یہ کیا کہہ رہے ہیں؟"

انتیاز نے بتایا "زلیخا کی شادی چاہتے ہیں کہ صفدر کے بھائی سے کر دی جائے!"

پھر احراز نے کہا، بات یہ ہے کہ زلیخا پر مجھے ذرا بھی اختیار نہیں ہے، اس کی خالہ بھی ہیں، ماں بھی ہیں، باپ بھی ہیں، اس کے متعلق میں اپنے سارے حقوق سے دست بردار ہو چکا ہوں، جو یہ فیصلہ کر دیں گی، میں بھی منظور کر لوں گا"

احراز رالعہ کو آتا دیکھ کر سٹ پٹا گیا اور اب امتیاز کی یہ باتیں سن کر اور زیادہ متوحش ہو گیا، لیکن بات چھیڑ چکا تھا لہٰذا خاموش بھی نہیں رہ سکتا تھا، کہنے لگا:-

"مجھے امید ہے، آپ کو بھی اس رشتے سے انکار نہ ہو گا۔"

وہ بولیں، مجھے تو ہے، میرے جیتے جی تو یہ رشتہ نہیں ہو سکتا

---

احراز نے پوچھا" کیا آپ کو لڑکی کا مفاد عزیز نہیں ہے؟ کیا اس سے اچھا رشتہ مل سکتا ہے، ماں باپ کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ لڑکی اچھے گھر میں جائے، مالدار گھر میں جائے، دودھوں نہائے، پوتوں پھلے، خوش قسمتی سے ایسا رشتہ مل رہا ہے پھر کیا وجہ ہے کہ اسے منظور کرنے
کہنے لگیں" وجہ پوچھتے ہو تو وجہ یہ ہے کہ میں اس کی شادی ارشاد سے کروں
وہ پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی جو کلثوم نے کی تھی، وہ بولا:۔

"ارشاد سے؟

رابعہ نے نہایت اطمینان سے جواب دیا:۔

ہاں ارشاد سے —— کچھ اعتراض ہے تمہیں؟

احراز نے جواب دیا:۔" اگر بھائی صاحب کو یہ رشتہ منظور ہے تو میں اختلاف نہیں کروں گا، لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ لڑکی کی قسمت کا فیصلہ جذبات کی رو میں نہ کرنا چاہیئے، حقائق کی روشنی میں کرنا چاہیئے۔ ارشاد بے شک آپ کا لڑکا ہے اور آپ کی نظر میں وہ دنیا جہان کے لڑکوں سے بہتر بھی ہوگا لیکن ہم بھی یہ معلوم کرنے کا حق رکھتے ہیں کہ آیا وہ لڑکی کو سکھ اور آرام سے رکھ سکے گا؟

رابعہ نے جواب دیا" سکھ اور آرام کا تعلق قسمت سے ہے، مال و دولت سے نہیں، ایسی نہ جانے کتنی لڑکیوں کو میں جانتی ہوں جو

...لدار گھرانے میں بیاہی گیئں لیکن ساری عمر لڑتے جھگڑتے گزری۔ زندگی ...م بن گئی بیچاریوں کی، اور ایسی لڑکیاں بھی میری نظر میں ہیں جو ...یب گھر میں بیاہ کر گیئں لیکن شوہر کی محبت نے غریبی کی زندگی کو بھی ...ت بنا دیا!

احراز نے دفعتہً بڑا نفسیاتی سوال کیا

محبت؟ ——— کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ ارشاد ...بت کرتا ہے؟

بغیر کسی جھجک کے رابعہ نے جواب دیا:-

"کیوں نہ کرے؟ کیا اسے محبت کرنے کا حق نہیں ہے ——— کیا یہ حق صرف صفدر کو ہے؟"

احراز کا چہرہ سرخ ہو گیا، آنکھیں ابل آئیں، سارے بدن سے ...اپنے لگا۔ بڑے طیش کے عالم میں دریافت کیا:-

"یہ آپ نے کیا کہا؟"۔

وہ بغیر کسی جھجک کے گویا ہوئی۔

"جو تم نے کہا اس کا جواب دیا۔ کچھ اور کہو گے تو اس کا جواب ...بھی پا لو گے"

"(برہمی کے عالم میں) آپ نے بہت بڑی، بہت سخت اور قطعاً ناقابل برداشت بات کہی ہے؟"

وہ بولی "لیکن بالکل سچ بھی تو ہے"

"آپ تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے لڑنے آئی ہیں"

رابعہ نے کہا "مجھے کیا ضرورت ہے لڑنے کی؟ ——— میں نے ت

یہ نہیں کہا کہ نسیم کی شادی فلاں امیر کبیر، فلاں جاگیردار اور فلاں

اعظم سے کر دو، اس کی شادی اپنے ماموں زاد بھائی سے ہو رہی ہے

ٹھیک ہے، پھر تم یہ کیوں چاہتے ہو کہ زلیخا غیر کے گھر جائے اور اپنی خال

کے لڑکے سے نہ بیاہی جائے۔"

"میں کچھ بھی نہیں چاہتا جو جی چاہے کیجئے۔"

یہ کہتا ہوا احراز اٹھا اور خفگی کے عالم میں اندر چلا گیا۔

(۴)

رابعہ اور احراز کی گفتگو میں امتیاز نے بالکل حصّہ نہیں لیا، وہ حقہ کے
لگاتا اور رسالہ کی ورق گردانی کرتا رہا جیسے اس گفتگو سے اسے
تعلق نہیں ہے، جیسے یہ گفتگو اس کی موجودگی میں نہیں ہو رہی ہے
سن ہی نہیں رہا ہے، ان دونوں کی باتیں۔

احراز کے جانے کے بعد امتیاز نے رسالہ ایک طرف پٹکا۔ اور
کا ایک زوردار کش لینے کے بعد کہا:-

میں یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں، کتنا فرق ہے تم میں اور مریم

وہ بولی، "ہاں اگر اتنا بڑا فرق نہ ہوتا تو ابھی وہ زندہ ہوتیں، ن
قدر جلدی اس دنیا سے رخصت نہ ہو جاتیں۔"

امتیاز نے اس جواب کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا:-

"مریم میرے سامنے بات نہیں کرتی تھی، میری وجہ سے، کلثوم اور اسرار کی کڑوی کسیلی باتیں برداشت کرتی تھی۔ وہ میرے ماتھے کی شکن پہچانتی تھی۔ میرے مزاج کی افتاد سے آشنا تھی۔ اس کے لب میرے سامنے بند رہتے تھے، نہ اس نے مجھ سے کوئی مطالبہ کیا، نہ فرمائش، نہ میری کسی بات پر اعتراض کیا، نہ جواب دیا۔ میں نے جو چاہا کیا، وہ خدا کی بندی چپ چاپ برداشت کرتی رہی۔ نہ زبان حرفِ شکایت سے آشنا ہوئی، نہ لب شکوہ سنج ہوئے۔ مجھ سے اسے تکلیفیں پہنچیں، اذیتیں پہنچیں، دُکھ پہنچے لیکن اس نے میرے معاملہ میں کبھی مداخلت نہیں کی، زندگی میں۔ میں نے اس کی قدر نہ کی، اور اب دن میں ہزار مرتبہ یاد آتی ہے اور جب یاد آتی ہے دل خون کے آنسو روتا ہے، جب تک وہ زندہ تھی میں سمجھتا رہا یہ ایک شے زائد ہے، اس کا اور میرا کوئی میل نہیں، ہم دونوں کو نہ جانے کیوں قسمت نے ایک کر دیا ہے، اسے میری ضرورت ہوتی ہو، میں اس کی قطعاً ضرورت محسوس نہیں کرتا لیکن جب وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئی تو ایسا محسوس ہوتا ہے، سب کچھ چھن گیا، سب کچھ جاتا رہا، زندگی بے کیف ہو گئی زندہ رہنے میں مزا نہ رہا۔ اب ایسا محسوس کرتا ہوں جیسے میں اس کے دم سے زندہ تھا، اسی کے لئے زندہ تھا، اب وہ نہیں تو زندگی بے کیف ہے، بے کار ہے، بے رنگ ہے، اب زندگی کاٹنے کو دوڑتی ہے، اب زندگی سے نفرت ہو گئی ہے مجھے۔"

اور پھر بڑے جوش کے عالم میں اس نے کہا:-

"رالعہ یا تو مریم کو زندہ ہو جانا چاہیئے ورنہ مجھے مر جانا چاہیئے، وہ زندہ نہیں ہو سکتی، مجھی کو مرنا پڑے گا اور میں اس کے لئے تیار ہوں"

رالعہ امتیاز کی یہ کیفیت دیکھ کر گھبرا گئی، اس نے کہا:

"بھائی صاحب آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟ آپ کو زندہ رہنا ہے!"

مجھے زندہ رہنا ہے؟ —— تمہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے"؟

"اپنے لئے نہیں، زلیخا کے لئے"!

"زلیخا کے لئے تم کافی ہو —— میں چاہتا ہوں جلد از جلد زلیخا اور ارشاد کی شادی انجام پا جائے، تم زلیخا کو بیٹی تو بنا چکی ہو، اب بہو بناؤ اور اپنے ساتھ سعادت گنج لے جاؤ" تاکہ میں اطمینان سے مر سکوں"،

رالعہ نے دیکھا، اس وقت امتیاز کا حال کچھ عجیب سا ہو رہا ہے، یہ کیفیت اس نے کبھی نہیں دیکھی تھی، وہ گھبرا گئی اس نے کہا:-

"بھائی صاحب یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ آپ کس طرح کی باتیں کر رہے ہیں، اللہ نے چاہا تو زلیخا اور ارشاد کی شادی ضرور ہوگی ——

امتیاز نے ٹوکا: "یہ تو میں بھی جانتا ہوں ضرور ہوگی۔ لیکن میں چاہتا ہوں جلد ہو، میرے سامنے، میری زندگی میں، مرنے سے پہلے ایک خوشی تو دیکھ لوں۔ تم نہیں جانتیں رالعہ، مجھے مرنے کی کتنی جلدی ہے میں تمہیں اسی امید پہ لایا تھا کہ جلد از جلد یہ رسم انجام پا جائے گی لیکن تم نہ جانے کیا سوچ رہی ہو؟

وہ بولی، "بھائی صاحب میں تو کچھ نہیں سوچ رہی صرف آپ کے ارشاد کی دیر ہے!"

یہ کہہ کر رابعہ نے جو نظر اٹھائی تو امتیاز کی گردن ڈھلک چکی تھی — ——— وہ بے ہوش ہو چکا تھا ٭

---

(۵)

تو جل میں آیا!

امتیاز کی بے ہوشی نے سارے گھر میں ہلچل مچا دی، نوکر چاکر، عزیز قریب، دوست احباب، حکیم ڈاکٹر، بھائی بھاوج، رابعہ اور زلیخا سب ہی دوا دوش میں لگ گئے۔

کافی دیر کے بعد امتیاز کو ہوش آیا، اسے ہوش آیا تو سب کے دم میں دم آیا، آپس کے اختلافات کتنے ہی سنجیدہ ہوں لیکن ایسا کوئی نہ تھا جو اس کا مرنا چاہتا ہو۔ وہ بہر حال گھر کا بڑا تھا، اپنے مخصوص عادات و اطوار کے باوجود احترام، عزت اور وقار کی نظر سے دیکھا جاتا تھا

جب تک امتیاز کو ہوش نہیں آگیا، یوں تو سب ہی پریشان تھے لیکن زلیخا اور رابعہ کی حالت سب سے زیادہ ابتر تھی، زلیخا کی آنکھوں

سے جو سیل اشک جاری ہوا تو رکنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ یہی حالت رابعہ کی بھی تھی نہ آنسو رکتے تھے نہ پاؤں کو قرار تھا، کبھی حکیم صاحب سے حال دریافت کر رہی ہیں، کبھی ڈاکٹر صاحب سے پوچھ رہی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے تسلی دیتے ہوئے کہا:-

"ہوش میں آ گئے، یہ بڑی بات ہے لیکن مطمئن نہ ہونا چاہئے، یہ دورہ پھر بھی پڑ سکتا ہے اور مہلک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔"

یہ سن کر رابعہ کی جان نکل گئی، اس نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا:

"کیا خدانخواستہ ——"

ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا، ہاں دماغ بھی متاثر ہے اور دل بھی فالج بھی گر سکتا ہے، اور ہارٹ بھی فیل ہو سکتا ہے!

رابعہ کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی، بے بسی کی تصویر بن کر پوچھنے لگی:-

"پھر اب کیا ہوگا؟"

ڈاکٹر صاحب نے ہمدردانہ انداز میں کہا:-

"جب تک سانس تب تک آس ہے جو بہتر سے بہتر دوا ممکن ہے وہ دی جا رہی ہے، اب یہ آپ کا کام ہے کہ انہیں مشتعل نہ ہونے دیں، انہیں صدمہ نہ پہنچنے دیں، خوش رکھیں، فکر، تشویش اور اضطراب کو پاس نہ پھٹکنے دیں، اگر آپ نے یہ کر لیا تو میں ذمہ داری کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ انشاء اللہ کافی دن زندہ رہیں گے۔"

اس کے بعد رابعہ کوشش کے باوجود کچھ نہ پوچھ سکی، چپ چاپ سر جھکا کر کھڑی ہوگئی اور کچھ سوچنے لگی: اتنے میں نادرہ آئی اس بیچاری کا بھی چہرہ اترا ہوا تھا، حد درجہ غمزدہ اور پریشان نظر آرہی تھی، کہنے لگی:

"بی بی جی صاحب بلا رہے ہیں آپ کو؟"

ڈاکٹر کو رخصت ہونے کا موقعہ مل گیا، پھر وہ آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا، رابعہ نے نادرہ سے پوچھا:-

"اب طبیعت کیسی ہے؟"

وہ بولی: "ٹھیک ہے ——— ڈاکٹر کیا بتا رہا تھا؟ خدا نخواستہ کوئی خاص بات تو نہیں ہے؟"

رابعہ نے ڈاکٹر کے الفاظ باچشم پرنم دہرا دیئے اور گلو گیر آواز میں کہا:

"خدا خیر کرے، ——— آج بھائی صاحب باتیں بھی کچھ ایسی کر رہے تھے کہ شروع ہی سے میرا دل دھڑک رہا تھا، انہوں نے کبھی بھولے سے بھی آپا مریم کا نہ ذکر کیا تھا، نہ انہیں یاد کیا تھا۔ آج بس انہی کا ذکر کرتے رہے۔ انہیں کی باتوں میں الجھائے رکھا ہے مجھے، نادرہ آج تو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ آپا کے غم میں گھلے جا رہے ہیں، کئی بار انہوں نے کہا، مریم کے بغیر زندگی، زندگی نہیں، اب مرجانے کو جی چاہتا ہے میں نے ٹوکا بھی، روکا بھی لیکن وہ سنتے کسی کی بھی نہیں، یہی کہتے رہے اور یہی باتیں کرتے کرتے بیہوش ہوگئے ——— نادرہ بھائی صاحب اچھے ہو جائیں گے؟"

نادرہ نے محبت اور ہمدردی کی نظر سے رالعبہ کو دیکھا اور کہنے لگی:۔

"خدا نے چاہا تو ضرور ہو جائیں گے،——— لیکن بی بی جی دیر ہو گئی، جلدی چلئے، انہوں نے بلایا ہے، انتظار کر رہے ہیں آپ کا،

رابعہ نے دوپٹہ سنبھالا اور ساتھ ہو لی نادرہ کے،

---

(۶)

رالعہ امتیاز کے کمرے میں پہنچی ، وہ بستر پر لیٹا ہوا تھا ، لیکن اتنی ذرا سی دیر میں کئی مہینے کا بیمار معلوم ہونے لگا تھا ، مگر آدمی باحوصلہ اور باہمت تھا - کامیابی کے ساتھ اپنی کمزوریاں چھپانے کی کوشش بھی کر رہا تھا - رالعہ کو باچشم پرنم دیکھ کر اس نے مسکرانے کی کوشش کی ، پھر بڑے چاؤ کے ساتھ اُس سے کہنے لگا :-

"بے وقوف ہو اچھی خاصی رو کیوں رہی ہو ؟

اور قبل اس کے کہ رالعہ جواب میں کچھ کہے ، وہ بولا :-

زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے ، آدمی وقت سے پہلے کسی طرح نہیں مر سکتا اور وقت کے بعد کسی طرح زندہ نہیں رہ سکتا ، اور پھر میرا جہاں تک تعلق ہے ، مجھے زندگی سے کوئی خاص رغبت بھی نہیں ہے ، کافی عمر ہو گئی - کافی دنیا دیکھ لی ، اب کون سی حسرت ہے جس کی تکمیل کے

کے لئے میرا زندہ رہنے کو جی چاہے

رالعبہ خفا ہوتی ہوئی بولی :

"بھائی صاحب پھر آپ نے وہی باتیں شروع کر دیں ! ——— میں چلی جاؤں گی "

اس نے زیر لب تبسم کے ساتھ کہا :-

"ابھی نہ جاؤ ، میں نے کچھ ضروری باتیں کرنے کے لئے تمہیں بلایا ہے ———"

رالعبہ نے الجھتے ہوئے کہا : "باتیں ہوتی رہیں گی ، پہلے آپ تندرست ہو لیجئے "

امتیاز نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ احراز آگیا ، اس نے آتے ہی رالعبہ کی طرف دیکھے بغیر ، لیکن درحقیقت اس سے کہا :-

"ڈاکٹر صاحب نے سخت تاکید کی ہے کہ کسی طرح کی باتیں نہ کی جائیں ———"

پھر امتیاز سے مخاطب ہو کر گویا ہوا :

"بھائی صاحب آپ کو مکمل آرام کی ضرورت ہے ، ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے ، یہ حملہ آپ پر بیماری کا اس لئے ہوا کہ نہ آپ کو آرام میسر ہے ، نہ سکون ، اس نے حکم دیا ہے کہ دوسرے لوگ آپکے پاس کم سے کم نشست برخاست رکھیں اور آپ بھی بالکل خاموش رہیں "

امتیاز نے گویا فیصلہ کن انداز میں جواب دیا:۔

"دونوں باتیں ناممکن ہیں ــــــــــ ڈاکٹر کو بکنے دو۔"

اتنے میں کلثوم چائے کی پیالی میں یخنی لے کر آئی، اور بڑے

بت بھرے لہجہ میں کہا:۔

"لیجئے بھائی صاحب پی لیجئے۔"

امتیاز نے پوچھا "یہ کیا بلا لے آئیں؟

وہ بولی "یخنی ہے چوزے کی، ذرا طاقت آجائے گی؟"

احراز نے جھڑکا "عجیب بے وقوف آدمی ہو۔ یہ چوزے کی یخنی کا کون

سا موقعہ ہے، گلوکوز لاؤ"

کلثوم کے پیچھے پیچھے نسیم بھی آگئی تھی، گلوکوز کا نام سن کر وہ دوڑی دوڑی

گئی اور ذرا دیر میں گلوکوز کا گلاس لے کر حاضر ہوگئی، کلثوم نے دزدیدہ

نظروں سے رابعہ کو دیکھا۔ پھر کہنے لگی:۔

"خون پھر خون ہوتا ہے! ــــــ لیجئے بھائی صاحب پی لیجئے"

اس مرتبہ امتیاز نے انکار نہیں کیا، پی لیا، پھر رومال سے منہ پونچھتے

ہوئے کہا:۔

"زلیخا کہاں ہے؟"

رابعہ بول پڑی "وہیں ہے اپنے کمرے میں، اس کے تو آنسو ہی

نہیں تھمتے کسی طرح۔"

کلثوم نے بیٹی سے کہا:۔"نسیم یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو، بس دیکھ لیا

تایا جی کو، خدا کے فضل سے اچھے ہیں، بہت جلد بالکل اچھے ہو جائیں گے

——— جاؤ زلیخا کی خبر لو، میری بچی ہلکان ہوئی جا رہی ہے، ار دیتے

——— میں بھی ابھی آتی ہوں۔"

نسیم نے ایک سعادت مند لڑکی کی طرح اس ہدایت کی تعمیل کی

اور زلیخا کے کمرے میں اس کا جی بہلانے کے لئے چلی گئی۔ –

امتیاز نے بستر پر پاؤں پھیلا لئے اچھی طرح، پھر کہا :–

"نیند آ رہی ہے!"

احراز نے کہا :–

"یہ تو بہت اچھا ہے، سو جائیے ———

———

(۶)

اتفاقاً ایک مہینے تک بستر سے نہ اٹھ سکا، دوا علاج پہ کافی روپیہ صرف ہوگیا، اتنے دنوں کے بعد آج پہلی مرتبہ بستر سے اترنے اور چند قدم چلنے کی اجازت ملی، وہ ڈاکٹروں پہ سخت جھنجھلاتا تھا کہ میں کوئی خاص شکایت محسوس نہیں کرتا، نہ سر میں درد ہے نہ چکر آ رہے ہیں، نہ کوئی اور خاص تکلیف ہے، لیکن ڈاکٹروں نے مجھے بیمار بنا رکھا ہے خواہ مخواہ، نہ بستر سے اتر سکتا ہوں، نہ لوگوں سے بات چیت کر سکتا ہوں، نہ ڈھنگ کی چیز کھا سکتا ہوں، وہی ابلا ہوا کھانا، بے مزہ، بے رنگ، بے لطف۔

کمرہ کے اندر تھوڑی دیر ٹہلنے کے بعد وہ آرام کرسی پہ دراز ہوگیا، اتنے میں زلیخا آئی، اس نے دریافت کیا:۔

"اباجی کھانا لے آؤں؟

امتیاز نے شفقت اور محبت کی نظر سے بیٹی کو دیکھا، اور کہنے لگا:
"لے آؤ ـــــ لیکن وہی پھیکا اور سیٹھا کھانا بکایا ہوگا، اب تو اس کے تصور سے ابکائی آتی ہے"

یہی باتیں وہ خود بھی پکاتے وقت سوچا کرتی تھی اور اسے اپنے باپ پر بڑا ترس آتا تھا کہ اتنا خوش خوراک شخص کس طرح ابلا اور بے مزہ کھانا کھا رہا ہے لیکن زندگی بڑی قیمتی ہوتی ہے، اسے قائم رکھنے کے لئے ہر طرح کے دکھ جھیلے جا سکتے اور تکلیفیں اٹھائی جا سکتی ہیں، یہی سوچ کر وہ چپ رہتی تھی، لیکن آج باپ کے منہ سے یہ الفاظ سننے کے بعد وہ خاموش نہیں رہ سکی، بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا:-

"تو جو کچھ کہیئے وہ پکا لاؤں؟

امتیاز نے بے بسی کے ساتھ جواب دیا" لیکن گھر میں جو ڈاکٹر صاحب (درالعبد) بیٹھے ہوئے ہیں، وہ تمہیں کب کچھ پکانے دیں گے؟

وہ مسکراتی ہوئی بولی: "آج بڑے مزے کے گلاوٹ کے کباب پکے ہیں، پرہیزی کھانے کے ساتھ تھوڑے سے نظریں بچا کر وہ بھی لیتی آؤں گی، ذرا منہ کا مزہ بدل جائے گا"۔

امتیاز انکار نہ کر سکا، کہنے لگا، اچھا بھئی، تمہاری اس ہمدردی اور محبت کا شکریہ، اگر لا سکو تو لے آؤ تھوڑے سے!

زلیخا واپس جانے کے لئے مڑی ہی تھی کہ سینے پہ ہاتھ رکھے والدہ بیگم آ گئیں۔ ملامت آمیز نظروں سے اسے دیکھا اور بولیں:

"واہ بیٹی واہ، غضب خدا کا، اتنی دیر ہوگئی، تم یہاں باتیں کر رہی ہو اور کھانے کی کچھ فکر ہی نہیں!

زلیخا سٹ پٹا سی گئی، کہنے لگی:-

"خالہ جان جا تو رہی تھی کہ آپ خود لے آئیں"۔

امتیاز کو بڑی ذہنی کوفت ہوئی اس وقت، اتنے دنوں کے بعد سازش کامیاب ہوئی تھی اور منہ کا ذائقہ بدلنے کا موقعہ ملا تھا، لیکن رابعہ کی ہمدردی نے وہ زریں موقعہ بھی کھو دیا، لیکن آج وہ بھی احتجاج بلکہ اسٹرائیک پر تلا ہوا تھا، کہنے لگا:-

"رابعہ اب یہ کھانا مجھ سے نہیں کھایا جاتا، اب تو اس کے تصور سے جی متلاتا ہے، لے جاؤ اور جب تک ڈاکٹر اجازت نہ دے، مجھے فاقہ کرنے دو"!

رابعہ نے سینی ایک طرف رکھ کر سنی کی ان سنی کرتے ہوئے کھانا میز پر لگا دیا اور بولی:-

بھائی صاحب بچہ نہ بنیئے اب تو ڈاکٹر صاحب نے کافی پرہیز تڑوا دیا ہے، کئی چیزوں کی اجازت دے دی ہے، دیکھیئے یہ تھوڑے سے گلاوٹ کے کباب بھی لائی ہوں آپ کے لیئے"۔

امتیاز کے چہرے پر رونق آگئی کہنے لگا:-

"گلاوٹ کے کباب؟ —— یہ میں کیا سن رہا ہوں"!

وہ بولی "بھائی صاحب، سچ مجھے خود بڑا ترس آتا تھا آپ پر، میں

نے ارشاد کو خاص طور سے ڈاکٹر صاحب کے پاس بھیجا اور ان سے اجازت منگوائی کہنے لگے۔ تھوڑے سے دے سکتی ہو، لیکن میں کچھ زیادہ ہی لے آئی ہوں ، خدا آپ کو کھانا نصیب کرے۔ اب تھوڑے دنوں میں پرہیز بالکل ختم ہو جائے گا، پھر اللہ چاہے سب کچھ کھائیے گا۔"

امتیاز کھانے پر بیٹھ گیا کباب بہت مزے کے تھے، چند لقموں میں صاف ہو گئے۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا،

رابعہ نے پوچھا " ارے آج تو آپ نے کچھ کھایا ہی نہیں!"

وہ بولا " جو کھانے کی چیز تھی کھا لی —— اگر اور کھلانا چاہتی ہو تو وہ اور لے آؤ!"

زلیخا دوڑی دوڑی گئی اور پلک جھپکاتے میں تین چار کباب ایک طشتری میں رکھ کے لے آئی، رابعہ نے اسے گھورا اور طشتری اس کے ہاتھ سے لے لی پھر امتیاز سے کہا:۔

" بھائی صاحب، ان کبابوں سے آپ کی جان ہمیں زیادہ عزیز ہے بھلے سے اب کچھ نہ کھائیے، ہاتھ کھینچ لیجئے، لیکن یہ تو اب نہیں ملنے کے ہیں ڈاکٹر کی ہدایت کے خلاف نہیں کرنے دوں گی آپ کو۔"

"بہت اچھا جناب!" یہ کہہ کر امتیاز نے ہاتھ دھو لئے اور زلیخا سینی اور برتن لے کر واپس چلی گئی لیکن ذرا سی دیر میں پھر واپس آ گئی اور رازدارانہ لہجہ میں کہنے لگی:۔

"ابا جی میں لے آئی اور دروازہ اندر سے بند کئے دیتی ہوں، کھا لیجئے

اتنیاز کو ہنسی آگئی اس نے کہا :-

"کیا تو چوری کر کے لائی ہے؟"

اس نے اقرار میں گردن ہلائی ، امتیاز نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا :-

"کتنا خیال رکھتی ہے میری بیٹی اپنے باپ کا، لیکن میری بچی اب طبیعت راغب نہیں ہے، کل پھر سہی ؟" اور زیادہ بدپرہیزی کرتے ڈر بھی لگتا ہے ، یہ پکائے کس نے ہیں ؟"

وہ بولی "میں نے"

امتیاز نے ایک مرتبہ پھر محبت سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور کہنے لگا : - "بڑا سواد ہے تیرے ہاتھ میں ـــــ بالکل مریم کی طرح !"

زلیخا نے نظر اٹھا کر دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے !

---

if not jis like book
this bundal book

زندگی کی بازی ہار

24419-96 اسلام آباد

(۸)

باپ کی اس تبدیلی پر زلیخا حد درجہ متحیر تھی!

اس نے جب سے ہوش کی آنکھیں کھولی تھیں، کبھی مہر پدر سے آشنا نہیں ہوئی تھی۔ گھر کا ماحول اسے ہمیشہ دہشت انگیز ہی نظر آیا۔ ماں کو باپ سے ڈرتے، بھائی کو باپ سے سراسیمہ ہوتے باپ کو، ایک فرعون، ایک ڈکٹیٹر ایک سفاک، ایک درندہ خو شخص کی حیثیت سے گھر میں آتے، وہ ہمیشہ سے دیکھتی چلی آ رہی تھی، چنانچہ جب اس کی ماں اس دنیا سے رخصت ہوئی اور باپ کی آنکھ سے ایک قطرۂ اشک بھی نہ گرا۔ جب اس کے بھائی کو جلاوطن کیا گیا اور باپ نے مڑ کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھا، تو اسے صدمہ ضرور ہوا تھا۔ بڑی دیر تک وہ اپنے گوشۂ تنہائی میں روئی بھی تھی لیکن حیرت نہیں ہوئی تھی، اس لئے کہ شقاوت کے اس طرز عمل میں کوئی ندرت نہیں تھی جس پر حیرت کی جاتی۔

لیکن مریم کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد امتیاز کی روش میں تبدیلی شروع ہوئی، یہ خوشگوار بھی تھی اور حیرت انگیز بھی، پھر اعجاز کی جلا وطنی کے بعد یہ تبدیلی اور زیادہ نمایاں ہوئی، اس نمایاں تبدیلی نے حیرت بھی بڑھا دی اور خوشگواری میں بھی اضافہ کر دیا۔ پھر رابعہ اور ارشاد کے آنے کے بعد مہر پدری میں اور اضافہ ہوا اور جب سے وہ بستر علالت سے اٹھا تھا، اگر یہ کہا جائے کہ کایا پلٹ گئی تھی تو ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا۔

پہلے کبھی امتیاز اس کے پاس خود آکر نہیں بیٹھا، کبھی اپنے پاس اصرار سے بٹھا کر باتیں نہیں کیں، کبھی اس کی دلجوئی کا خیال نہیں رکھا، کبھی اسے خوش دیکھ کر خوش نہیں ہوا، کبھی اسے افسردہ دیکھ کر دکھی اور غمگین نظر نہیں آیا، لیکن اب اس کے وقت کا بڑا حصہ اس کے پاس صرف ہوتا تھا۔ وہ اسے زیادہ سے زیادہ خوش دیکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ ذرا بھی اسے پریشان یا افسردہ دیکھتا تو بے کل ہو جاتا تھا —— ایسا محسوس کرنے لگی تھی زلیخا، جیسے مریم قبر سے زندہ ہو کر واپس آگئی ہے۔

یہ کتنی خوشی کی بات تھی۔

کیا اب بھی وہ خوش اور مسرور نظر نہ آتی؟

اب اسے کیا غم تھا؟ رابعہ کی صورت میں ماں مل گئی، امتیاز کی صورت میں گم شدہ باپ مل گیا، اور ارشاد کی صورت میں اسے ایک سچا دوست، بھائی اور محبت کرنے والا عاشق جانباز مل گیا۔

کلثوم نے جو ستم توڑے تھے، نسیم کی طرف سے جو زیادتیاں ہوئی تھیں، صفدر کے زمانۂ قیام میں مسلسل اور پیہم اس کی دل آزاری توہین اور تذلیل کا جو سلسلہ جاری تھا۔ صفدر کی ماں نے جس طرح اسے پاؤں کی جوتی سمجھ کر پاؤں تلے روندنے کی کوشش کی تھی۔ یہ سب باتیں اب اس کی لوحِ دل سے محو ہو گئی تھیں —— برائے کینۂ اغیار در دلم جانیست!

اب وہ سراپا مسرت تھی، اب اس کی خوشی کوئی نہیں چھین سکتا تھا۔

وہ بیٹھی یہی باتیں سوچ رہی تھی کہ امتیاز نے ٹوکا اور پوچھا:۔

"بیٹی کیا سوچ رہی ہے تو؟"

وہ مسکراتی ہوئی کہنے لگی، "کچھ بھی تو نہیں اباجی؟"

لیکن امتیاز کا تقاضا جاری رہا۔

"ضرور تو کوئی خاص بات سوچ رہی تھی!"

زلیخا دل کی بات چھپا نہ سکی، کہنے لگی

"سوچتی ہوں آپ کتنی محبت کرنے لگے ہیں۔ مجھ سے۔ اور یہ سوچ کر میرا دل اتنا خوش ہوتا ہے۔ اتنا خوش ہوتا ہے کہ کہہ نہیں سکتی۔"

ان الفاظ میں صداقت بھی تھی اور طنز بھی تھا۔ امتیاز نے دونوں چیزیں محسوس کیں۔

لیکن بیٹی، اگر باپ بیٹی کو نہ چاہے گا، تو اور کون چاہے

وہ اس سادگی کے ساتھ گویا ہوئی :۔

"یہی تو میں خود ہمیشہ سوچا کرتی تھی ——— لیکن آپ پہلے ایسے کب تھے جیسے اب ہیں؟"

امتیاز نے محبت بھری نظروں سے اسے دیکھا اور کہنے لگا :۔

"ہاں بیٹی تو نے سچ کہا ——— میں پہلے بہت برا تھا، بہت ذلیل تھا - میں نے اپنی بیوی کا حق ادا نہیں کیا - میں نے اپنی اولاد کا حق ادا نہیں کیا - یہ باتیں جب سوچتا ہوں، تو ہوک سی اٹھتی ہے، اک تیر سا لگتا ہے آ کر کلیجے میں، لیکن ——— اب تو میں بدل گیا ہوں - یہ مانتی ہے تو!"

وہ کچھ فخر، کچھ ناز کچھ محبت کے ساتھ بولی :۔

"ہاں مانتی ہوں، ——— میں کیا سارا گھر مانتا ہے، چچا میاں چچی جان، نسیم، نادرہ سب کو حیرت ہے۔"

"کیا تجھے بھی حیرت ہے؟"

"ہاں اباجی مجھے بھی ہے، ——— کیا نہیں ہونی چاہیئے؟"

"ضرور ہونی چاہیئے، لیکن بیٹی کیا تو نے اپنے خطا کار اور گنہگار باپ کو معاف کر دیا ——— اگر تو معاف کر دے گی تو مریم بھی معاف کر دے گی - میں اس سے کہہ سکوں گا، کہ زلیخا نے مجھے معاف کر دیا ہے - زلیخا کے نام پر تو وہ جان دیتی تھی -

پھر وہ میری خطا معاف کر دے گی بڑی خوشی سے — بیٹی جواب دے ، میں تیرے منہ سے "ہاں" سننا چاہتا ہوں!

---

(۹)

زلیخا کے منہ سے "ہاں" کا لفظ تو نہیں نکلا، لیکن اس کے چہرے بشرے اور انداز و اطوار سے امتیاز نے "ہاں" کا مطلب حاصل کر لیا۔

کچھ دیر تک خاموشی سی طاری رہی پھر امتیاز نے گفتگو کا سلسلہ شروع کرتے ہوئے کہا:-

"لوگ کہتے ہیں، میں اچھا ہوں اور بظاہر ہوں بھی تندرست—

---

وہ بیچ ہی میں بول پڑی، "تو کیا خدانخواستہ آپ تندرست نہیں ہیں؟

امتیاز نے جواب دیا:-

کیا تم نہیں دیکھتی اب بھی میرے اوپر تھوڑے تھوڑے وقفہ سے دورے

پڑتے رہتے ہیں "

وہ بولی " لیکن ڈاکٹر صاحب تو کہتے ہیں، تشویش کی اب کوئی ضرورت نہیں۔

بے پروائی کے ساتھ امتیاز نے کہا :۔

" ممکن ہے وہ ٹھیک کہتے ہوں۔ ممکن ہے ان کا اندازہ غلط ہو ——— "

بے کلی کے ساتھ زلیخا نے سوال کیا

" آخر آپ اس طرح کی باتیں کیوں کرتے ہیں۔ جن سے مایوسی ٹپکتی ہے، اتنے دنوں کے بعد مجھے خوشی ملی ہے۔ میں نے اپنے کھوئے ہوئے باپ کو پایا ہے میں ایسا محسوس کرنے لگی ہوں۔ جیسے میری ماں مری نہیں زندہ ہے، اب مجھے کوئی غم نہیں، فکر نہیں، پریشانی نہیں، لیکن ——— یہ باتیں کرکے، ایسی باتیں کرکے آپ میری خوشی چھین لیتے ہیں، ابا جی، آپ زندہ رہیں گے، میرے لئے زندہ رہیں گے، آپ کو زندہ رہنا پڑے گا۔"

یہ کہتے کہتے زلیخا کی آنکھیں آب گوں ہوگئیں، امتیاز نے رحم اور ترس کی ملی جلی نظروں سے اسے دیکھا، اور کہنے لگا :۔

" اچھا اگر تو کہتی ہے، تو زندہ رہوں گا، ملک الموت آیا تو کہہ دوں گا، ابھی نہیں مرنا، زلیخا کی اجازت نہیں ہے ———

اب تو ہوئی خوش !

وہ واقعی خوش ہو گئی، آنسو خشک ہو گئے، نرم و نازک ہونٹوں پر
رقص کرنے لگا اس نے کہا :-

" سب ہی بیمار پڑ گئے ہیں اور اچھے ہو جاتے ہیں، لیکن آپ کی
رح کوئی بھی مایوس نہیں ہوتا "

" ہاں بیٹی تو نے سچ کہا - میں تیری ہر بات مانتا ہوں، کیا ایک بات
یری تو مان لے گی ؟

زلیخا سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی، اس نے کہا :-

" میں یہ مانتا ہوں کہ زندہ رہوں گا، تو یہ مان لے کہ سب کے ماں باپ
ہمیشہ زندہ نہیں رہتے —— بول مانتی ہے ؟

جی تو نہیں چاہتا تھا لیکن انکار بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، کہنے لگی :-

یہ تو سچ ہے لیکن ——

امتیاز نے آگے کچھ نہیں کہنے دیا :

لیکن ویکن کچھ نہیں، میں یہی کہلانا چاہتا تھا —— اور اب مجلس برخاست
تھک گیا ہوں، آرام کروں گا !

---

(۱۰)

امتیاز نے غلط نہیں کہا تھا۔ واقعی گو بظاہر میں اچھا ہو گیا تھا اور ڈاکٹر امید دلاتے رہتے تھے کہ بہت جلد تمام شکایتیں رفع ہو جائیں گی، لیکن کیفیت یہ تھی کہ اب بھی دَورے پڑتے رہتے تھے، اب تک وہ رخصت پر تھا۔ ملازمت پر نہیں جا سکتا تھا، کمزوری برابر محسوس کرتا رہتا تھا۔ اور کبھی کبھی باتیں کرتے کرتے کتاب پڑھتے پڑھتے کھاتے پیتے بیہوش ہو جاتا تھا اور یہ چیز اب اس طرح معمولات میں داخل ہو چکی تھی کہ گھر والے اس کے عادی ہو گئے تھے، اس میں اب کوئی ندرت نہیں رہ گئی تھی۔ بے ہوشی کا وقفہ بہت مختصر سے وقفہ کے لئے ہوتا تھا ذرا دیر میں آنکھ کھل جاتی تھی۔ اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا اور خود امتیاز بھی زیادہ سے زیادہ اپنی کمزوری کو چھپانے کی کوشش کرتا تھا اور ایسا ظاہر کرتا تھا جیسے یہ بیہوشی غنودگی

ک جھونکا تھا جو آیا اور چلا گیا، لیکن دل ہی دل میں برابر محسوس
رہتا تھا کہ اب چل چلاؤ کا وقت آگیا ہے جب بھی اجل کا
م آجائے !

امتیاز کا عندیہ پاکر رابعہ نے شادی کی تیاریاں شروع کر دی تھیں
ان تیاریوں کا اعلان نہیں کیا تھا۔ نادرہ نے بھی اپنی طرف سے
ری راز داری برتی تھی، اور احتراز، کلثوم، نسیم کسی کو بھی خبر نہیں ہونے
تھی۔ کہ اندر ہی اندر کیا گل کھل رہے ہیں۔

کلثوم وغیرہ کو اندرون خانہ تیاریوں کا علم ہو یا نہ ہو، لیکن ارشاد
لیخا کو تھا اور یہ دونوں بہت خوش تھے، دونوں کے دل کی مراد پوری
رہی تھی۔ ارشاد اگر جان و دل سے زلیخا کا پرستار تھا تو وہ
ہزار جان سے اسے چاہتی تھی، بچپن کا رشتہ ویسے بھی بڑا گہرا اور مضبوط
ہوتا ہے اور اگر اس میں محبت شامل ہو جائے تو پھر یہ رشتہ پہاڑ سے
ی زیادہ مستحکم ہو جاتا ہے، یہاں یہی کیفیت تھی !

ایک روز رابعہ امتیاز کے کمرے میں بیٹھی اس سے شادی کی تفصیلات
ر کچھ ضروری باتیں کر رہی تھی۔ نادرہ کلثوم اور نسیم کے کام میں دلچسپی لے
ہی تھی، زلیخا اپنے کمرے میں بیٹھی سویٹر بن رہی تھی کہ ارشاد صاحب
ے سان و گمان وہم سے آن موجود ہوئے، اسے یوں دفعتہً اپنے سامنے
ا دیکھ کر گھبرا گئی، اس نے اون ایک طرف پھینکا اور سہمگین لہجہ میں کہا:۔
"توبہ ہے، ——— آپ نے تو ڈرا دیا مجھے؟"

وہ مسکراتا ہوا گویا ہوا :-

"کیا میں شبیر ہوں جو تم ڈر گئیں ؟"

وہ ایک ادائے خاص کے ساتھ گویا ہوئی

"آخر آپ کو اس وقت یہاں تشریف لانے کی کیا ضرورت تھی ؟"

"نہ ہوتی تو آتے کیوں ؟"

"چلے جائیے ——— "

"کیوں ؟ اس حکم نادری کا کوئی سبب بھی تو ہوگا ؟"

"خالہ اماں آتی ہی ہوں گی ۔"

"وہ نہیں آئیں گی ، ابھی کافی دیر تک ان کی تشریف آوری کا اندیشہ نہیں ہے ، میں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں ، نہایت اطمینان کے ساتھ خالو ابا کے ساتھ باتیں کر رہی ہیں اور غالباً ہم دونوں کا مستقبل زیر بحث ہے ۔"

"ممکن ہے نادرہ آجائے !"

"وہ کیا کرے گی آکر ؟"

"آتی ہی رہتی ہے کام وام کے سلسلے میں ۔"

دروازے کے پاس تو کھڑا ہوں ، اسے آتا دیکھ کر فوراً نو دو گیارہ ہو جاؤں گا ۔

شاید نسیم ———

شاید نسیم ——————

شاید نسیم، یا کلثوم چچی یا احمرانہ چچا ادھر تشریف لے آئیں ——————

مسکراتے ہوئے ) ہاں ہو سکتا ہے !

اور ان میں سے کوئی آ گیا تو آتے ہی گولی مار دے گا ہمیں؟

گولی کیوں مارنے لگا، لیکن مفت کی بدنامی تو ہو گی، انگلیاں تو اٹھیں

ب لوگ کہیں گے، بے غیرت ہے یہ لڑکی؟

اور یہ سب لوگ اس وقت کیوں خاموش تھے جب صفدر یہاں تھا

نسیم سے آ کر ملتا رہتا تھا، بلکہ نسیم اس سے برابر ملتی رہتی تھی!

تو کیا آپ نے مجھے نسیم سمجھا ہے؟

زلیخا یہ باتیں چھوڑو، ایک سوال کا جواب دو،

کیا سوال ہے آپ کا، کہہ ڈالئے جلدی سے!

اب تمہارے مزاج کیوں نہیں ملتے؟

(زیر لب تبسم کے ساتھ) بڑے آدمیوں کے مزاج آسانی سے کب ملتے

ہیں؟

تو کیا میں چھوٹا آدمی ہوں؟ میں بڑا آدمی نہیں ہوں؟

اپنے منہ میاں مٹھو بننے سے کیا فائدہ؟ —————— ہوں گے، میں کیا

جانوں!

اچھا ایک بات تو بتاؤ؟

"ابھی کوئی بات باقی ہے ؟ —— کہیئے ؟"

کیا تم خوش نہیں ہو ؟

"اس سوال کا مطلب ؟"

"بہت جلد وہ دن آنے والا ہے کہ ہم دونوں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک ہو جائیں گے —— کیا میری طرح خوشی اور مسرت کے ساتھ تم بھی اس مبارک دن کا انتظار کر رہی ہو ؟"

زلیخا نے کوئی جواب نہیں دیا - اون اٹھا کر پھر سے سویٹر بُننا شروع کر دیا، ارشاد ایک قدم اور اندر آ گیا، اس نے کہا :-

"زلیخا میں تمہارا جواب چاہتا ہوں ؟"

وہ اس طرح سویٹر بنتے بنتے بولی :-

"جو لوگ خاموشی کی زبان نہیں سمجھ سکتے ، وہ کچھ بھی نہیں سمجھ سکتے !"

ایک عجیب تاثر اور جذبہ کے عالم میں ارشاد نے کہا :-

"گویا —— یعنی تمہارا مطلب ——"

زلیخا ہنس پڑی ، اس نے شوخ نظروں سے ارشاد کو دیکھا اور پھر تبسم کی بجلیاں گراتی ہوئی بولی :-

"گویا —— یعنی تمہارا مطلب —— یعنی میرا مطلب —— جی ہاں —— بس اب تشریف لے جایئے ، خالہ جان

تی ہی ہوں گی، اور پھر گویا، اور یعنی سب دھرے رہ جائیں
گے:

ارشاد مسکراتا ہؤا الٹے پاؤں واپس چلا گیا!

---

## (۱۱)

شادی کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی!

یہ خوشی کا موقع تھا، ارشاد کے لئے بھی، زلیخا کے لئے بھی، دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے، ایک دوسرے کو چاہتے تھے، ایک دوسرے کے بن جانا چاہتے تھے، ارشاد بھی خوش تھا اور زلیخا بھی، لیکن زلیخا کے دل میں ایک کانٹا بھی کھٹک رہا تھا، اور وہ کانٹا تھا اعجاز کی یاد!

مریم مر چکی تھی لیکن اعجاز تو زندہ تھا، اسے تو اس موقع پر موجود ہونا چاہیئے، بہن کی شادی ہو اور بھائی موجود نہ ہو، یہ کتنے ستم کی بات ہے —— کتنا بڑا ظلم؟ اور نہ جانے وہ کہاں ہے؟ کس حالت میں ہے؟ کیا کر رہا ہے؟ لیکن وہ کہیں بھی ہو، کسی حالت میں بھی ہو، کچھ بھی کر رہا ہو، اسے آنا چاہیئے، اسے اس جشنِ مسرت میں شریک ہونا چاہیئے ——

لیکن کیونکر ؟ کس طرح ؟

یہ سوچتے سوچتے یک بیک اس کے دل نے ایک طرح کی طمانیت سی محسوس کی۔ امتیاز کے بدلے ہوئے طرز عمل نے، اس کی محبت اور شفقت نے، اس کے چاؤ اور پیار کے برتاؤ نے زلیخا کی بے زبانی ختم کر دی تھی۔ اس کا حوصلہ بڑھا دیا تھا، اب وہ باپ کے سامنے دل کی بات کہہ سکتی تھی۔ اس سے منوانے کے انداز میں ضد کر سکتی تھی - اس سے مطالبہ کر سکتی تھی اور اسے تسلیم کرا سکتی تھی

کیوں نہ امتیاز سے اعجاز کو بلانے کا مطالبہ کرے ؟

دل میں ایک طرح کی خلش سی پیدا ہوئی، سوال پیدا ہوا

"کیا اباجی یہ بات مان لیں گے ؟"

خود اعتمادی نے اکسایا اور ابھارا اور وہ نتائج سے بے پروا اٹھی اور تیر کی طرح سیدھی باپ کے کمرے میں پہنچ گئی

امتیاز کی طبیعت ادھر کئی دن سے پھر کچھ خراب سی تھی، ایسی تو نہیں کہ وہ صاحب فراش ہو جاتا۔ یا حکیموں اور ڈاکٹروں کا تانتا لگ جاتا۔ لیکن تھوڑے تھوڑے وقفہ سے کئی دورے پڑ چکے تھے۔ وہ ہار ماننا نہیں جانتا تھا، ہر دورے کے بعد وہ لوگوں کے سامنے اس طرح اپنے آپ کو بے پروا ظاہر کرتا تھا گویا نہ اسے کوئی سنگین قسم کا مرض ہے۔ نہ ان دوروں سے پریشان ہونے کی کوئی بات ہے، لیکن چہرے کی زردی۔ اعصاب کی کمزوری اور عام جسمانی نقاہت اس چوری

کا پردہ فاش کر رہی تھی۔ درحقیقت وہ اپنے بارے میں طے کر چکا تھا کہ کسی وقت بھی پیامِ مرگ آسکتا ہے۔ اسی لئے زلیخا کی شادی میں وہ اتنی زیادہ جلدی کر رہا تھا۔ اس غرض سے وہ اپنی زندگی ہی میں سبک دوش ہو جانا چاہتا تھا، اس وقت ایک آرام کرسی پر دراز عالمِ خیال میں بیٹھا نہ جانے کیا سوچ رہا تھا کہ زلیخا کو آتا دیکھ کر وہ چونک پڑا۔ اس نے اضطراب کے ساتھ پوچھا:۔

"کیا بات ہے بیٹی تو اس وقت مجھے غمزدہ اور دلگیر کیوں نظر آرہی ہے؟"

زلیخا نے کوئی جواب نہیں دیا، لیکن اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ انتیاز نے سوچا، کہیں ایسا تو نہیں ہے زلیخا اس رشتہ کو پسند نہ کرتی ہو؟۔ اس نے کہا:۔

"میں نے سوچ سمجھ کر تیری بہتری، راحت، آسائش اور بہبود کے تمام پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھ کر ارشاد سے تجھے بیاہنے کا فیصلہ کیا ہے لیکن اگر تجھے یہ رشتہ منظور نہ ہو تو ابھی کچھ نہیں گیا ہے، ذمہ داری میں اپنے سر لوں گا اور صاف انکار کر دوں گا۔"

ان الفاظ نے زلیخا کے دل میں ہلچل مچا دی۔ وہ قہار و جبار باپ جو ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا تھا جس کے فیصلہ کی کوئی اپیل نہیں تھی، جس کا ہر قول گھر میں حرفِ آخر کا درجہ رکھتا تھا، اب تلافیٔ مافات پر یہاں تک اتر آیا ہے کہ بیٹی کے استمزاج سے بغیر اس کی شادی تک کرنا نہیں چاہتا۔

س نے محبت اور ممنونیت کی نظروں سے باپ کو دیکھا، پھر

بولی:-

" اباجی، میں نے تو ماں کی گود میں صرف ایک ہی بات سیکھی ہے
باپ کی اطاعت، جب تک وہ زندہ رہیں۔ مجھے اور بھیا
و صرف یہی ایک نصیحت کرتی رہیں، پھر آپ کے کسی فیصلہ کے خلاف
سوچنا میرے لئے ممکن ہی کب ہے ———"

امتیاز نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:

" تو نے مریم کا ذکر کر کے پھر میرے سینہ پر گھونسہ مار دیا۔"

اور پھر گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا:-

" اگر یہ بات نہیں تو پھر میں تجھے، غمزدہ، افسردہ اور دلگیر کیوں
دیکھ رہا ہوں؟"

دل کی بات زبان پر لانے کا بہترین موقعہ مل گیا، کہنے لگی:-

" جانے کیا بات ہے، بہت دنوں سے بھیا مجھے بہت یاد آرہے
ہیں۔ ———"

امتیاز نے غور سے زلیخا کو دیکھا، پھر کہا:-

" تجھے اعجاز یاد آرہا ہے؟"

" جی ——— بہت زیادہ!"

" تیرا وہ کون ہے؟"

" بھائی ہیں ———"

"اور میرا؟ میرا کون ہے؟"

"آپ کے تو وہ بیٹے ہیں!"

"بہن بھائی سے زیادہ محبت کرتی ہے، یا باپ بیٹے سے؟"

"اباجی یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، والدین کی محبت کو دنیا میں کون پہنچ سکتا ہے؟"

"پھر کیا تیرا خیال ہے کہ وہ صرف تجھی کو یاد آتا ہے؟"

(خوش ہو کر) آپ کو بھی ضرور یاد آتے ہوں گے!"

"ہاں مجھے بھی یاد آتا ہے۔ آخر وہ میرا بیٹا ہے۔ صرف میرا ہی نہیں، مریم کا بھی، صرف میرا اور مریم کا بیٹا ہی نہیں، تیرا بھائی بھی ہے۔ اتنی ساری نسبتوں کے بعد میں اسے یاد کرنے، اسے چاہنے پر مجبور ہوں ——"

"(بہت زیادہ خوش ہو کر) تو پھر آپ انہیں تلاش کیوں نہیں کرتے؟ انہیں بلا کیوں نہیں لیتے؟"

"نہیں بیٹی یہ نہیں ہو سکتا!"

"(حیرت سے باپ کو دیکھتے ہوئے) کیوں اباجی؟"

"اس لئے کہ وہ سرکش ہے۔ باغی ہے اور انتیاز کی گردن کسی کے سامنے نہیں جھک سکتی۔ بیٹے کے سامنے کیا جھکے گی؟ انتیاز کسی کی خوشامد نہیں کر سکتا، بیٹے کی کیا کرے گا؟"

"لیکن اباجی ——"

"ہاں بیٹی میں جانتا ہوں، تو چاہتی ہے کہ وہ آجائے۔ اس گھر کے دروازے اس کے لئے بند نہیں ہیں، کبھی بھی بند نہیں ہوں گے، لیکن ...تیاز اسے پکار نہیں سکتا، بلا نہیں سکتا، اس کا تعاقب نہیں کر سکتا!"

"لیکن اباجی ———"

"میں تیرے جذبات کو سمجھتا ہوں، تو بھی میرے جذبات کو سمجھنے کی کوشش کر۔ تو چاہتی ہے کہ اس مسرت بخش موقعہ پر اعجاز بھی موجود ہو اس خوشی میں وہ بھی حصہ لے۔ وہ بھی اپنی بہن کو دلہن بنتا دیکھے، تیرا یہ چاہنا بالکل قدرتی اور فطرتی ہے لیکن کیا تو یہ بھی جانتی ہے، میں کیا چاہتا ہوں؟"

"بتا دیجئے اباجی ———"

"وہ میرا اکلوتا بیٹا ہے، آج وہ آجائے تو مجھے نئی زندگی مل جائے۔ میں کتنے اطمینان سے مروں، زندگی کے جو چند دن باقی ہیں وہ کتنے سکھ سے کٹیں۔ وہ میرا عصائے پیری بن سکتا ہے، وہ میری تیمار داری کر سکتا ہے۔ تیرے سسرال جانے کے بعد وہ ہر طرح میری خبر گیری کے فرائض انجام دے سکتا ہے۔ میں جانتا ہوں تو مجھ سے کتنی محبت کرتی ہے۔ لیکن میری بچی اتنی محبت کرنے کے بعد بھی تو اعجاز کا بدل نہیں بن سکتی ———"

"یہی تو میں کہتی ہوں ———

تو بہرحال عورت ذات ہے، تو وہ دشواریاں نہیں جھیل سکتی، جو

اعجاز جھیل سکتا ہے میرے لئے"،

"بے شک ابا جی"

"وہ ہوتا تو میں ساری ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتا۔ اس بیماری، اس کمزوری، اس نقاہت میں بھی بہت سے کام مجھی کو کرنا پڑتے ہیں۔ وہ میرا ہاتھ بٹاتا۔ وہ میرا بوجھ اٹھا لیتا۔ وہ مجھے ہر ذمہ داری سے آزاد کر دیتا۔ تو یہاں رہتی یا سسرال میں، مجھے کوئی فکر نہ ہوتی۔ اس کے نہ ہونے سے مجھے کتنا دکھ ہے، کتنی تکلیف ہے، اسے صرف میرا ہی دل جانتا ہے کوئی نہیں جانتا، کوئی نہیں جان سکتا ——"

ابا جی، اسی لئے تو میں نے یہ کہا تھا کہ ——"

سُن لے بیٹی، باپ کی پوری بات سُن لے ——"

"سن رہی ہوں ابا جی"

لیکن وہ مجھ سے روٹھ کر چلا گیا۔ نہیں میں نے غلط کہا، وہ مجھ سے نفرت کرتا ہے، اس لئے چلا گیا۔ بیٹی جو مجھ سے نفرت کرتا ہو، اس سے محبت کی بھیک کم از کم مجھ سے نہیں مانگی جا سکتی۔ جو مجھ سے نفرت کرتا ہو۔ میں اس کی طرف محبت اور دوستی کا ہاتھ نہیں بڑھا سکتا،

---

"مگر ابا جی وہ آپ سے کس طرح نفرت کر سکتے ہیں؟ کہیں بیٹا بھی باپ سے نفرت کر سکتا ہے؟"

"ہاں کر سکتا ہے، اعجاز کو دیکھ لو"

"میں نہیں مانتی ابا جی"
"تیرے نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے ؛ تو اگر یہ کہہ دے کہ اس وقت دن
نہیں رات ہے تو کیا رات ہو جائے گی؟"
"ابا جی، وہ ہرگز آپ سے نفرت نہیں کرتے!"
"جھوٹ نہ بول بیٹی کرتا ہے- بہت زیادہ نفرت ہے اسے اپنے
گنہگار باپ سے؟"
"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"
یہ کوئی خلافِ عقل بات نہیں، کئی دفعہ میرے ذہن میں یہ بات
آچکی ہے کہ مجھ سے اس کی نفرت بے جا نہیں ——
"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ابا جی"؟ ——
ہاں بیٹی میں غلط نہیں کہتا، وہ مجھ سے اسی لئے نفرت کرتا ہے
کہ میں نے اس کی ماں کو دکھ دیا- میں نے اس کی ماں کی قدر نہ کی، میں
نے اس کی بہن کو محبت نہیں دی اور خود اس سے شفقت و محبت کا
کبھی برتاؤ نہیں کیا —— اسے اپنے آپ سے محبت ہے اپنی بہن سے محبت ہے،
اپنی ماں سے محبت ہے اور جسے وہ ان تینوں کا دشمن سمجھتا ہو، اس سے
نفرت ہی کر سکتا ہے، چنانچہ کرتا ہے!
"لیکن بھیا بڑے اچھے آدمی ہیں ابا جی!"
"اسے میں تسلیم کرتا ہوں"
وہ غیرت مند ہے، خوددار ہے، اس میں خود اعتمادی ہے جس شخص

کے یہ جوہر ہوں، اس کے اچھے آدمی ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے؟ اگر وہ بے غیرت ہوتا تو باپ کے ٹکڑوں پر پڑا رہتا۔ اگر اس میں خود داری نہ ہوتی تو ماں کی توہین اور بہن کی درگت پر اسے غصہ نہ آتا۔ اگر اس میں خود اعتمادی کا جوہر نہ ہوتا تو خالی جیب، ہر طرح کے وسائل و ذرائع سے تہی دست، دنیا کے سمندر میں بے خوف و خطر نہ کود پڑتا،

"اباجی ———

"یہاں سے جانے کے بعد اسے پھولوں کی سیج تیار نہیں ملی ہوگی۔ کانٹوں سے بار بار دامن الجھا ہوگا۔ طرح طرح کی ناقابل تصور تکلیفوں سے سابقہ پڑا ہوگا، ممکن ہے فاقے کرنا پڑے ہوں۔ ممکن ہے ٹھوکریں کھانا پڑی ہوں، ہو سکتا ہے، کہیں مزدوری کر کے پیٹ پالنا پڑا ہو، لیکن ——— اس نے پلٹ کر اس طرف نہیں دیکھا۔ اس کے بڑھتے ہوئے قدم پیچھے نہیں ہٹے، اس کی خود اعتمادی کو زمانہ شکست نہ دے سکا، وہ جہاں کہیں بھی ہے، جس حالت میں بھی ہے، جو کچھ بھی کر رہا ہے، بہر حال دنیا کے ان چند لوگوں میں ہے جو اپنی قسمت کی تشکیل خود کرتے ہیں، اپنا مستقبل خود بناتے ہیں۔ دوسروں کی محتاجی نہیں اختیار کرتے، دوسروں کے سامنے ——— حتیٰ کہ باپ کے سامنے بھی ہاتھ نہیں پھیلاتے،

"لیکن اباجی ———

"اگر وہ یہاں رہتا تو شاید بی۔اے ——— کر چکا ہوتا۔ میرا خیال ہے اسے یہاں سے گئے ہوئے چار سال سے کچھ زیادہ ہی کی مدت گزر

چکی ہے۔ اس نے بڑے امتیاز کے ساتھ میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔ میں
ے کالج بھیجتا اگر وہ چاہتا تو انگلینڈ بھی بھیج دیتا۔ میں اسے شاہزادوں کی
رح رکھتا۔ جس طرح تجھ سے پیار کرتا ہوں، اسی طرح اسے بھی چاہتا۔ تو جانتی
ہے کہ میں بدل چکا ہوں، لیکن وہ نہیں جانتا اور اسی لئے ہر طرح کی سہولتوں
آسائشوں اور فراغتوں کو چھوڑ کر اس نے دکھ اور تکلیف کی زندگی بے جھجک
اختیار کر لی ـــــ زلیخا،،

"جی اباجی ـــــ

"مجھے اس پر فخر ہے۔ میں اس سے بے پناہ محبت کرتا ہوں"

"اباجی میرے بھیا ایسے ہی ہیں کہ ان پر فخر کیا جائے۔ ان سے بے پناہ
محبت کی جائے!"

"سو وہ میں کرتا ہوں"

"پھر آپ ان سے کیوں خفا ہیں؟، انہیں بلا کیوں نہیں لیتے؟"

"بس بیٹی، یہی نہیں ہو سکتا ـــــ وہ میرا بیٹا ہو کر، اگر اتنا
ضدی، منداور خوددار ہو سکتا ہے، تو میں اس کا باپ ہو کر کیوں نہیں
ہو سکتا؟"

"لیکن اباجی ـــــ

"ہاں بیٹی کہو، کیا کہنا چاہتی ہے؟"

"بڑے چھوٹوں کی خطا معاف کر دیا کرتے ہیں، بزرگوں کا قول ہے
از خورداں خطا واز بزرگاں عطا، آپ بھی کیوں نہیں انہیں معاف کر

دیتے۔"

"معاف کر دیا بیٹی!"

"(بے انتہا خوش ہو کر) معاف کر دیا؟ اباجی آپ نے میرے بھیا کو معاف کر دیا؟"

"ہاں ——— میں اس سے نفرت نہیں کرتا۔"

"آپ ان سے نفرت نہیں کرتے؟"

"بالکل نہیں ——— میں اس سے محبت کرتا ہوں!"

"آپ ان سے محبت کرتے ہیں؟"

"ہاں۔ اتنی ہی جتنی تجھ سے کرتا ہوں!"

"اباجی اگر آپ انہیں مجھ سے زیادہ چاہیں تو مجھے خوشی ہوگی، شکایت نہ ہوگی!"

"لیکن اپنے دل کو کیا کروں؟ ——— میری دو آنکھیں ہیں، ایک تو ایک وہ!"

"اباجی ———"

"اس لئے میں نے اسے کوئی سزا ابھی نہیں دی۔"

"لیکن وہ گھر سے تو نکل گئے۔"

"ہاں، لیکن وہ خود نکلا، جب وہ نکلنے لگا تو میں نے ایک دھکا دے کر دو قدم اور آگے بڑھا دیا، ورنہ اگر میں سزا دیتا ——— کچھ معلوم ہے میری سزا کیا ہوتی؟

"میں نہیں جانتی اباجی!"

"مجھ سے سن لے —— میں اسے عاق کر دیتا، جائیداد سے محروم کر دیتا، لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں نے جو وصیت نامہ لکھا ہے اس کی رو سے اسے پورا حصہ دیا ہے، ہر چیز میں اس کی ذرا بھی حق تلفی نہیں ہونے دی ہے، اور اب تجھ سے کہتا ہوں کہ میرے بعد اگر وہ آئے تو خبردار اسے ذرا بھی ملامت نہ کرنا، کوئی تلخ اور ناگوار بات نہ کہنا، جب مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں اور کسی کو ملامت کرنے کا کیا حق ہے؟ —— وہ جب آئے، اگر آئے تو اس کا پورا حصہ اسے سونپ دینا۔ وصیت نامہ کی رو سے میں نے سب کچھ تیری تحویل میں دیا ہے، تو ہی مختار ہے اور اگر میرے مرنے کے بعد بھی نہ آئے تو پھر تجھے اختیار ہے جو چاہنا کرنا!"

"لیکن اباجی اگر آپ انہیں بلا لیں گے ——"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے بیٹی؟ تو اب تک اپنے باپ کو نہیں سمجھ سکی؟ —— تو انیاز سے یہ توقع کرتی ہے کہ وہ اپنی آن چھوڑ دے؟ اپنی شان سے دستبردار ہو جائے؟ اپنی خودداری کو خود اپنے پاؤں سے روند ڈالے؟ جب تک وہ پاگل نہیں ہو جاتا، اس کے بارے میں کبھی ایسا خیال نہ کرنا!"

اور پھر دفعتہً اس نے کہا:-

"بیٹی، میرا دل گھبرا رہا ہے، ذرا ٹھنڈا پانی تو مجھے پلا!"

زلیخا تیزی سے اٹھی اور پانی —— لینے کے لئے چلی گئی۔ پانی لے

دیتے۔"

"معاف کر دیا بیٹی!"

"(بے انتہا خوش ہو کر) معاف کر دیا؟ اباجی آپ نے میرے بھیا کو معاف کر دیا؟"

"ہاں ——— میں اس سے نفرت نہیں کرتا!"

"آپ ان سے نفرت نہیں کرتے؟"

"بالکل نہیں ——— میں اس سے محبت کرتا ہوں!"

"آپ ان سے محبت کرتے ہیں؟"

"ہاں۔ اتنی ہی جتنی تجھ سے کرتا ہوں!"

"اباجی اگر آپ انہیں مجھ سے زیادہ چاہیں تو مجھے خوشی ہوگی، شکایت نہ ہوگی!"

"لیکن اپنے دل کو کیا کروں؟ ——— میری دو آنکھیں ہیں، ایک تو ایک وہ!"

"اباجی ———"

"اس لئے میں نے اسے کوئی سزا ابھی نہیں دی۔"

"لیکن وہ گھر سے تو نکل گئے۔"

"ہاں، لیکن وہ خود نکلا، جب وہ نکلنے لگا تو میں نے ایک دھکا دے کر دو قدم اور آگے بڑھا دیا، ورنہ اگر میں سزا دیتا ——— بچے معلوم ہے میری سزا کیا ہوتی؟

"میں نہیں جانتی اباجی!"

"مجھ سے سن لے ــــــ میں اسے عاق کر دیتا، جائیداد سے محروم کر دیتا، لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں نے جو وصیت نامہ لکھا ہے اس کی رو سے اسے پورا حصہ دیا ہے، ہر چیز میں اس کی ذرا بھی حق تلفی نہیں ہونے دی ہے اور اب تجھ سے کہتا ہوں کہ میرے بعد اگر وہ آئے تو خبردار اسے ذرا بھی ملامت نہ کرنا، کوئی تلخ اور ناگوار بات نہ کہنا، جب مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں اور کسی کو ملامت کرنے کا کیا حق ہے؟ ــ ــــــ وہ جب آئے، اگر آئے تو اس کا پورا حصہ اسے سونپ دینا۔ وصیت نامہ کی رو سے میں نے سب کچھ تیری تحویل میں دیا ہے، تو ہی مختار ہے اور اگر میرے مرنے کے بعد بھی نہ آئے تو پھر تجھے اختیار ہے جو چاہنا کرنا!"

"لیکن اباجی اگر آپ انہیں بلا لیں گے ــــــ"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے بیٹی؟ تو اب تک اپنے باپ کو نہیں سمجھ سکی؟ ــــــ تو انیاز سے یہ توقع کرتی ہے کہ وہ اپنی آن چھوڑ دے؟ اپنی شان سے دستبردار ہو جائے؟ اپنی خودداری کو خود اپنے پاؤں سے روند ڈالے؟ جب تک وہ پاگل نہیں ہو جاتا، اس کے بارے میں کبھی ایسا خیال نہ کرنا!"

اور پھر دفعتہً اس نے کہا:۔

"بیٹی، میرا دل گھبرا رہا ہے، ذرا ٹھنڈا پانی تو مجھے پلا؟"

زلیخا تیزی سے اٹھی اور پانی ــــــ لینے کے لئے چلی گئی۔ پانی لے

کر آئی تو امتیاز کو پانی پینے کا ہوش نہ تھا، وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔
اس نے جلدی سے الماری کھولی اور ایک دوا نکال کر اسے سنگھائی اور پنکھا جھلنے لگی، کوئی دس منٹ کے بعد اسے ہوش آ گیا لیکن اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ منہ سے بات نکلنا مشکل تھی۔

(۱۲)

امتیاز جب ہوش میں آ گیا تو تھوڑی دیر زلیخا باپ کے پاس بیٹھی رہی اس کے بعد جب دیکھا کہ اس نے کروٹ بدل لی ہے اور سونا یا آرام کرنا چاہتا ہے تو چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی آئی اور حالات کا جائزہ لینے لگی،

امتیاز کی اس گفتگو سے اس نے اندازہ کر لیا تھا، ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے مگر وہ کسی قیمت پر بھی اس بات کے لئے آمادہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اعجاز کو بلا لے، لیکن اسے یہ امید تھی کہ اگر وہ خود آ جائے تو ساری غلط فہمی اور خفگی آن کی آن میں دور ہو جائے گی، کیونکہ آج کی باتوں سے اس نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ اعجاز کے اقدام سے امتیاز کو کتنا ہی صدمہ پہنچا ہو لیکن وہ اس سے بے پناہ محبت کرتا ہے، جیسے ہی نظر سے نظر ملی، ساری تلخیاں ختم ہو جائیں گی - اور اعجاز کی سلامت

ردی اور سعادت مندی سے بھی اسے توقع تھی کہ باپ کا سامنا ہونے کے بعد وہ سر جھکا دینے کے سوا کچھ نہ کر سکے گا۔

لیکن سوال یہ تھا کہ وہ آئے کس طرح ؟ یہ بات کس طرح ہو ؟ اگر یہ معلوم ہوتا کہ وہ فلاں شہر میں ہے ، فلاں مقام پر ہے تو جس طرح بھی بنتا وہ اسے تلاش کرتی اور ڈھونڈ کر لے آتی اور باپ کے قدموں پر گرا دیتی۔ لیکن اس یوسف گم گشتہ کا سراغ لگانا بھی تو آسان نہیں تھا۔

وہ اسی فکر میں بیٹھی تھی کہ ارشاد کسی کام سے اس طرف ہوتا ہوا گزرا وہ اٹھ کر دروازے تک آ گئی اور ارشاد سے مخاطب ہوتی ہوئی کہنے لگی :-

" کیا آپ میرا ایک کام کر دیں گے ؟"

ارشاد صاحب نہال ہو گئے ، کہنے لگے :-

" صرف ایک کام ؟ کیوں میرے جذبۂ وفا کی توہین کرتی ہو ، کم از کم ہزار کام     تو ہوں "

وہ ذرا چڑتی ہوئی بولی :-

" جاہیے نہیں ، کہتی کچھ ؟"

ارشاد نے نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ بہت زیادہ سنجیدہ ، افسردہ اور دل گرفتہ نظر آئی ۔ وہ بھی سنجیدہ ہو گیا ، اس نے کہا :-

" معلوم ہوتا ہے کوئی خاص بات ہے ؟ —— اچھا میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں ، کہو !

وہ بولی، "جس طرح بھی ہو سکے، بھیّا کا پتہ چلایئے ———"

"بھیا کا پتہ چلاؤں؟ ——— یعنی اعجاز کا؟"

"ہاں؟ ——— کیا آپ کا جی نہیں چاہتا کہ ہماری خوشی میں ان کا حصہ بھی ہو؟ کیا اس بات پر آپ کا دل نہیں کڑھتا کہ ہم خوش ہوں اور وہ پردیس میں کسی انجانی جگہ ٹھوکریں کھا رہے ہوں؟ وہ صرف میرے ہی بھائی تو نہیں ہیں آپکے بھی تو ہیں؟

ان باتوں سے ارشاد بہت متاثر ہوا اُس نے کہا:-

"میں تمہارے اس جذبہ کی قدر کرتا ہوں ———

وہ چمک کر بولی، "قدردانی کا شکریہ، لیکن کچھ کرکے دکھائیے، تب جانیں ———

ارشاد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا:-

اتنے بڑے ملک میں ایک گمنام شخص کا تلاش کرنا کچھ آسان سمجھ رکھا ہے تم نے؟

وہ طنز کا تیر چلاتی ہوئی بولی:-

"آسان سمجھا ہوتا تو خود ہی یہ کام کر لیتی، آپ کو کیوں زحمت دیتی؟"

ارشاد کچھ جھینپ سا گیا، کہنے لگا:-

ایک ترکیب سمجھ میں آتی ہے ——— اگر کارگر ہو سکتی ہے تو صرف وہی، ورنہ ———

اضطراب کی تصویر بن کر زلیخا نے پوچھا :-

" وہ ترکیب بتائیے ، دوسری باتیں پھر دیکھی جائیں گی !"

ارشاد نے کہا " وہ ترکیب یہ ہے کہ اخبارات میں اپنی طرف سے
ایک اشتہار دیتا ہوں ؛ اگر اعجاز کی نظر پڑ گئی تو انشاءاللہ بھاگا بھاگا آئے
گا :

" لیکن اباجی جو دیکھ لیں گے ؟ پھر تو آپ کی شامت آجائے گی
ان سے چھپ کر یہ کام کرنا ہے !"

" ہمارے گھر میں صرف "صداقت" آتا ہے ، اس میں نہیں دیں گے اشتہا
باقی اخبارات میں دیں گے !"

وہ خوش ہو گئی ، " اچھا یہی سہی لیکن جلد !"

حصہ ششم

# زلزلہ

(۱)

امتیاز کی حالت روز بروز مایوس کن ہوتی جاتی تھی۔
بیماری کا پہلا حملہ وہ جھیل سا گیا۔ اس کے بعد بھی بارہا دورے پڑے لیکن اس کی خود اعتمادی نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اس نے ہار نہیں مانی۔ مگر اب گزشتہ چند ہفتوں سے مسلسل دورے پڑ رہے تھے اور وہ بستر سے لگ گیا تھا۔ گھر والے بھی ناامید ہو چکے تھے اور ڈاکٹروں نے بھی جواب دے دیا تھا۔ انہوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا جڑ اکھڑ چکی ہے، کسی دن ہوا کا ایک معمولی سا جھونکا بھی اس تناور اور چھتنار درخت کو زمین پر گرا دے گا، جہاں تک امتیاز کا تعلق تھا۔ وہ تو ایک عرصہ سے موت کے لئے چشم براہ تھا، اسے یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ نہیں بچ سکے گا، لیکن کسی طرح کی دہشت یا سراسیمگی موت کے تصور سے نہیں تھی۔ وہ ہنسی خوشی مرنے کے لئے تیار تھا۔

ایک روز اس نے رابعہ کو بلایا اور پوچھا

ارشاد اور زلیخا کی شادی کی تاریخ تو مقرر ہو چکی ہے اور دن بدن وہ تاریخ قریب بھی آتی جا رہی ہے۔ میرے خیال میں اب مشکل سے آٹھ دس دن رہ گئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ تم نے تیاریاں بھی مکمل کر لیں اچھی طرح سے ؟

رابعہ خود کئی دن سے اسی شش و پنج میں تھی ——— !

بے شک شادی کی تاریخ قریب آتی جا رہی تھی اور خود اس کی بھی دلی خواہش تھی کہ یہ تقریب بڑی خوبی کے ساتھ جلد از جلد تمام کو پہنچ جائے۔ اسے اندیشہ تھا کہ اگر خدانخواستہ شادی سے پہلے بھائی صاحب چل بسے تو احراز میاں راستہ کا پتھر بن جائیں گے اور ہرگز یہ رشتہ نہیں ہونے دیں گے لیکن ایک مصیبت یہ تھی کہ کلثوم اور نسیم وغیرہ نے علی الاعلان اور احراز نے دبے دبے لفظوں میں طنز و تعریض کا سلسلہ شروع کر دیا تھا کہ واہ بھئی، یہ بھی خوب رہی، باپ بستر مرگ پر دراز ہے اور لڑکی کو بیاہنے کے سامان ہو رہے ہیں۔ اتنا نہیں ہو سکتا کہ ذرا اس کی صحت کا انتظار کر لیں۔ ان طنز و تعریض کی باتوں سے اس کا ارادہ ڈانواں ڈول ہو جاتا تھا اور وہ سوچنے لگتی تھی، بہتر یہی ہے کہ کچھ روز کے لئے یہ تقریب ملتوی کر دی جائے، لیکن اپنے میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ کھل کر یہ بات امتیاز سے کہہ سکے، کیونکہ وہ بضد تھا کہ اس تقریب کو تاریخ مقررہ پر بہر حال انجام پانا چاہئے، لیکن آج جب خود امتیاز نے یہ سوال اٹھایا، تو اسے آغاز گفتگو کا بڑا اچھا موقع مل گیا، اس نے کہا :-

"بھائی صاحب میرا جہاں تک تعلق ہے - میں تو چاہتی ہوں، کل ہوتا آج یہ رشتہ ہو جائے، لیکن ——————

امتیاز نے کڑے تیوروں سے رابعہ کو دیکھا اور سوال کیا :-

"لیکن کے بعد کیا کہنا چاہتی ہو تم ؟"

وہ بولی، "کچھ نہیں میرا مطلب یہ تھا کہ آپ کی صحت تک اگر یہ تقریب ملتوی ہو جائے تو کیا حرج ہے ؟"

امتیاز سے اٹھا تو نہیں جاتا تھا لیکن ہمت کر کے وہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اس نے کہا :-

"یہ کیوں نہیں کہتیں کہ تم میری موت کی منتظر ہو - تمہاری خواہش ہے کہ میں مر جاؤں - تب یہ تقریب انجام پائے، تاکہ میں یہ آخری مسرت اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکوں !

رابعہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا :-

"بھائی صاحب کیا واقعی میرے بارے میں آپ کا یہی خیال ہے ؟"

امتیاز نے اس تیکھے لہجہ میں جواب دیا :

"اگر یہ بات نہیں ہے تو پھر پرلے درجے کی بے وقوف ہو تم ؟"

وہ بولی، بھائی صاحب اس میں بے وقوفی کی کیا بات ہے ؟

امتیاز نے تیوری چڑھا کر جواب دیا :-

"اس سے بڑھ کر بے وقوفی اور کیا ہو گی کہ تم میری صحت کی منتظر ہو، خدا کی بندی - میں اب نہیں اچھا ہو سکتا، کسی طرح بھی !

وہ کانپ گئی اور کہنے لگی :-

خدا کے لئے بھائی صاحب ایسا نہ کہیئے، آپ ضرور تندرست ہو جائیں گے - ایسی بیماری ہی کون سی ہے ؟

وہ بولا " نہ ہو گی ، یہ بھی مان لیتا ہوں کہ تندرست ہو جاؤں گا مگر سوال یہ ہے کہ اس تقریب کے ملتوی کر دینے کا خیال تمہارے دل میں کیسے آیا ؟ " -

وہ کہنے لگی " بھائی صاحب میرے لئے تو آپ کی ہر بات فرمان کی حیثیت رکھتی ہے ، کیونکر ممکن ہے کہ آپ کچھ کہیں اور میں اسے ٹال جاؤں ———

" پھر یہ کیا سوجھی تھی ؟ "

" گھر میں سب لوگ یہی کہہ رہے ہیں ؟ "

" مثلاً کون لوگ ؟ ——— ذرا میں بھی تو ان کا نام نامی سن لوں ؟ "

" سب ——— کلثوم، نسیم ، احراز میاں ، کون ہے جو اس تقریب کا ملتوی ہونا نہیں چاہتا - میں تو نکو بن کر رہ گئی ہوں ، بھائی صاحب ایسے ایسے طعنے دیتے ہیں - یہ لوگ کہ کلیجہ منہ کو آجاتا ہے ؟

" طعنے دیتے ہیں ؟ "

" جی ——— بڑے دل شکن اور ناقابل برداشت قسم کے "

" کیا کہتے ہیں ؟ "

"اب چھوڑیئے یہ ذکر ——— آپ کی جو مرضی ہوگی، وہی کیا جائے
گڑے مردے اکھاڑنے سے کیا حاصل؟"

"نہیں میں سننا چاہتا ہوں، تمہیں بتانا پڑے گا، ورنہ مجھے صدمہ ہوگا!"

"بھائی صاحب، میں ان باتوں کو پسند نہیں کرتی!"

"یہ تم اس بھائی صاحب سے کہہ رہی ہو جس سے ابھی کہہ چکی ہو کہ اس کی
بات کو فرمان سمجھتی ہو؟ کیوں؟"

"میری حیثیت اس گھر میں جو ہے آپ کو معلوم ہے میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ
سے کسی قسم کی تلخی اور بدمزگی پیدا ہو۔ آپ کے مزاج سے میں واقف ہوں
آپ کو غصہ آجائے گا۔ بات بڑھے گی۔ نہ میں یہ چاہتی ہوں کہ بات بڑھے
نہ یہ منظور ہے کہ آپ مشتعل ہوں۔ اس کا اثر آپ کی صحت پہ بہت برا پڑتا
ہے۔ مختصر یہ کہ اگر آپ کا حکم ہے تو تاریخ مقررہ پر ضرور شادی ہو جائے
گی میری بچی کی!"

امتیاز رابعہ کی طبیعت اور مزاج سے واقف تھا۔ پھر اس نے اصرار
نہیں کیا۔ لیکن اسے اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ اس شادی میں رخنے ڈالنے
کی کوشش کی جا رہی ہے۔

اور اسی احساس نے اس کے ارادے کو اور زیادہ پختہ کر دیا۔ اس
نے فیصلہ کر لیا کہ کسی قیمت پر بھی یہ شادی ملتوی نہیں ہو سکتی، اس
نے رابعہ سے کہا:

"ہاں میرا یہ اٹل فیصلہ ہے کہ شادی کی تاریخ میں تبدیلی نہیں ہو

سکتی !"

"بہت اچھا بھائی صاحب ایسا ہی ہوگا"

"دعوت نامے بھیج دیئے تم نے؟"

"ابھی تو نہیں .. ایک آدھ دن میں روانہ کردوں گی، فہرست بن رہی ہے"

"میں چاہتا ہوں۔ اس موقعہ پر میرے ہر دوست، ہر عزیز، ہر رشتہ دار اور شناسا کو مدعو کیا جائے"

"ایسا ہی ہوگا۔ بالکل مطمئن رہیے!"

"میں چاہتا ہوں۔ یہ شادی خوب دھوم دھام سے ہو، اہل خاندان اور اہل خاندان ہی نہیں۔ اہل شہر بھی یاد کریں کہ ہاں یہ تھی شادی، ایسی دھوم دھام سے ہم نے اور کہیں نہیں دیکھی۔"

"(مسکراتے ہوئے) لیکن بھائی صاحب اس کی کیا ضرورت ہے؟"

"کیوں نہیں ہے؟ میرے پاس روپے کی کمی نہیں ہے، میری ایک ہی لڑکی ہے ——"

"ایسا نہ کہیئے، خدا رکھے لڑکا بھی ہے"

"ہاں وہ بھی ہے، لیکن نہ جانے کہاں ہے، اس کا ذکر نہ کرو۔ میں اپنی لڑکی کو بہت چاہتا ہوں، میری تمنا ہے کہ شادی ایسی دھوم دھام اور تزک و احتشام کے ساتھ ہو کہ عرصۂ دراز تک لوگ یاد رکھیں کہ کبھی اتنیانند نے اپنی لڑکی کی شادی میں کمال کر دیا۔ کوئی حسرت باقی نہ رہ

جائے "

"(زیرلب تبسم کے ساتھ) بہت اچھا بھائی صاحب ایسا ہی ہوگا۔
میں اپنی طرف سے کیا کوئی کسر نہیں اٹھا رکھوں گی"

"شاباش، اس طرح کی باتیں کرو تاکہ طبیعت خوش ہو۔ میں تم
سے یہی توقع رکھتا تھا۔ میری دلی آرزو بھی ہے"

تو بالکل مطمئن رہیئے، چاہے کوئی جلے یا بھنے شادی ہوگی اور
دھوم دھام سے ہوگی؟

"(خوش ہوکر) یہ آواز ہے رابعہ کی تو پہلے تو وہ نہ جانے کون سی چڑیل
بول رہی تھی!

وہ ہنس پڑی اس نے شکوہ سنج ہوتے ہوئے کہا:۔

"واہ بھائی صاحب، یہ بھی اچھی رہی، آپ نے مجھے چڑیل بنا دیا"

چڑیل نہ بناتا تو راہ راست پر بھی نہ آتیں —— مجھے غصہ اور صدمہ
اس بات پر تھا کہ رابعہ جیسی رستم دوراں اور ایسی بزدل! لیکن اب تم
نے طبیعت خوش کردی۔ جاؤ معاف کر دیا۔

---

## (۲)

آج ارشاد اور زلیخا کی شادی تھی !

کتنا مبارک اور نشاط افروز دن تھا یہ !

ارشاد تو خیر سراپا سرود و طرب تھا ہی لیکن زلیخا بھی کچھ کم خوش نہ تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ بہت زیادہ خوش تھی تو مبالغہ نہ ہوگا !

اور خوش ہونا بھی چاہیئے تھا

زندگی بھر کا پیمانِ وفا اس شخص سے باندھا جا رہا تھا جو دل کے آشیانے میں ایک عرصہ سے متمکن تھا، بچپن ہی سے جس کی محبت دل کے گوشہ گوشہ میں پیوست ہو گئی تھی۔

لیکن خوشی کے ساتھ ساتھ غم کا کانٹا بھی کھٹک رہا تھا دل میں!

اعجاز کی یاد !

مفقود الخبر لیکن چہیتے بھائی کی یاد!
آج اگر وہ موجود ہوتا تو اس گھر میں بہار آجاتی، یہاں کی رونق اور
ہما گہمی کا عالم ہی کچھ اور ہوتا، لیکن ———
لیکن اس گھر میں شادیانے بج رہے ہیں اور وہ غریب الدیار نہ
جانے کہاں ہے؟ نہ جانے کس طرح جہد حیات میں مصروف ہے؟
کاش وہ آجاتا،
ایک ہی دن کے لئے، ایک ہی ساعت کے لئے
لیکن وہ نہیں آیا۔ نہ جانے کہاں ہے وہ؟ ارشاد نے اس
کی تلاش و جستجو میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، بے چارے نے
اخبارات میں اشتہار دیا۔ آس پاس کے شہروں میں گیا اور تلاش کیا
لیکن بے سود، وہ یوسفِ گم گشتہ نہ ملنا تھا، نہ ملا!
آج رہ رہ کے اعجاز کا خیال آرہا تھا، اس کی یاد ستا رہی تھی،
اور جب وہ یاد آجاتا، جب اس کا خیال آجاتا تو دل کے اندر سے
اٹھتی ہوئی خوشی کی لہریں سرد پڑ جاتیں۔ جی چاہتا اس مسرت کدہ
میں آج جتنے لوگ جمع ہیں، ہنس رہے ہیں، قہقہے لگا رہے ہیں۔ ان
کے منہ نوچ لے، انہیں گھر سے باہر نکال دے، ان سے کہدے، میرا
دل خون کے آنسو رو رہا ہے اور تم ہنس رہے ہو۔ جاؤ چلے جاؤ،
اب کبھی اس گھر میں قدم نہ رکھنا
لیکن نہ وہ کسی کا منہ نوچ سکی، نہ کسی کو گھر سے نکال سکی،

خاندان اور محلہ کی عورتیں اور لڑکیاں جمع تھیں۔ یہ سب آ رہی تھیں۔ اسے دولھن بنا دیکھ رہی تھیں۔ اس کی تعریف میں رطب اللسان تھیں۔ کوئی اس کے ناک نقشہ کی تعریف کرتا کوئی رنگ روپ کی، کوئی گدگداتا کوئی لطیفے سنا کر ہنسانے کی کوشش کرتا اور وہ بے بسی کے ساتھ ان سب کی یہ زیادتیاں برداشت کرتی، وہ دولھن تھی، انتہائی خاموشی کے ساتھ اسے سب کچھ برداشت کرنا تھا، اسے جنبش لب کی بھی اجازت نہ تھی۔

امتیاز کا نام بڑا تھا۔ اپنے حلقے میں اس کی شخصیت بہت اونچی تھی۔ اس کے پاس مال و دولت کی بھی کمی نہ تھی، اس کی طرف سے دعوت نامہ جائے اور کوئی رد کر دے۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ دعوت نامہ پاتے ہی مہمان ٹوٹ پڑے جیسے وہ اس دن کے، اس تقریب مسرت کے نہ جانے کب سے منتظر تھے

سارا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ مردانے میں مرد اور زنان خانے میں عورتیں اور نوجوان لڑکیاں۔ ان میں سے شاید ہی زلیخا نے کسی کو دیکھا ہو، کسی سے ملاقات کی نوبت آئی ہو، لیکن یہ سب اسی طرح صدقے قربان اور واری ہو رہی تھیں جیسے ہمیشہ سے اس گھر میں ان کا آنا جانا ہے، جیسے یہ ہمیشہ سے زلیخا کو جانتی اور چاہتی چلی آئی ہیں سب میں وہ اپنائیت نظر آ رہی تھی جیسے دلوں اور رشتوں سے تعلقات چلے آ رہے ہوں۔ یہ ثبوت تھا امتیاز کی شخصیت اور اس کی دلعزیزی

رابعہ بیگم کا تو کہنا ہی کیا !

وہ پاؤں رکھتی کہیں تھیں، پڑتا کہیں تھا۔ جوشِ مسرت سے وہ
وش ہوئی جا رہی تھیں۔ یہ تپاک، یہ گرم جوشی، یہ اپنایت جو ان
ادر اجنبی مہمانوں میں دیکھ رہی تھیں۔ یہ ان کے لئے بالکل نئی اور
غیر متوقع چیز تھی۔ امتیاز کا اب سے پہلے جو طرزِ عمل رہا تھا، اس
تو گھر کو جیل خانہ بنا دیا تھا۔ نہ کوئی آتا تھا نہ جاتا تھا۔ نہ کسی سے
اور ہم نہ ربط ضبط، لیکن آج سب اس طرح ٹوٹ پڑے، جیسے
جانے کب سے شناسائی چلی آ رہی ہو۔ اس واقعہ نے رابعہ کا حوصلہ
بڑھا دیا اور وہ کہیں زیادہ جوش و خروش کے ساتھ اس تقریب کو
کامیاب بنانے کی جدوجہد کرنے لگیں

لیکن اس سارے گھر میں جہاں ہر طرف غلغلۂ نشاط اور ہنگامہ
ب برپا تھا۔ اگر کہیں خاموشی تھی تو وہ کلثوم کا گوشۂ احزان تھا۔
احواز کو دفعتہً سرکاری کام سے باہر جانا پڑا، لہٰذا وہ شرکت
نہ کر سکا۔ کلثوم عین موقعہ پر ایسے شدید دردِ سر اور دردِ سینہ میں مبتلا
ہوئی کہ بستر سے اٹھنا دوبھر ہو گیا۔ نسیم البتہ تندرست تھی لیکن وہ
ماں کی تیمارداری میں مصروف تھی، اسے اصل تقریب میں شرکت کا حصہ
لینے کا موقع ہی نہ مل سکا۔

نادرہ نے اس طرزِ عمل کو "بائیکاٹ" کا نام دیا تھا، رابعہ کی رائے

بھی یہی تھی لیکن اس نے خاموشی کو ترجیح دی، زلیخا سب کچھ سمجھ رہی
لیکن اس کے لیئے زبان کا ہلانا بھی ممکن نہ تھا۔

باہر مردانے میں ارشاد دولہا بنا بیٹھا تھا۔ ارد گرد حاشیہ نشین
تھے۔ سب نئے، سب اجنبی، لیکن سب مہر و محبت کے پیکر، اس
کی باتوں میں اپنایت اور تپاک و گرم جوشی کے جلوے!

امتیاز بدستور بستر علالت پہ دراز تھا۔ ڈاکٹروں نے سختی
ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ بستر سے اترنے کا ارادہ بھی نہیں کر سکتا اور اس
پر دوست احباب نے عمل کرنے پر اسے مجبور بھی کر رکھا تھا، لیکن اس
کا کمرہ بزم بے تکلف بنا ہوا تھا۔ اس کے محکمہ کے لوگ، اس کے
اس کے ہم نشین، ہمدم، دمساز، سب بکثرت موجود تھے اور طرح
سے اسے خوش کرنے اور اس کا دل بہلانے کی کوشش کر رہے تھے

اعزاز چونکہ موقع واردات پہ موجود ہی نہیں تھا اور کلثوم بیار تھی
نسیم ٹھہری خود "لڑکی"۔ وہ کیا جانے ایسے موقعوں پر کیا کیا جاتا ہے
لہٰذا چچا، چچی اور چچازاد بہن کی طرف سے تو زلیخا کو کچھ نہ ملا، لیکن امتیا
کے جو دوست احباب اور ان کی بیویاں اور لڑکیاں آئی تھیں، انہوں نے
قیمتی تحائف سے ارشاد اور زلیخا کے جیب و دامن بھر دیئے، اس موقعہ پر
تحائف کی صورت میں ارشاد اور زلیخا کو جو کچھ ملا اس کی مالیت کسی
طرح ۲۵ - ۳۰ ہزار سے کم نہ ہوگی۔ امتیاز نے لاکھ لاکھ منع کیا
ہزار ہزار نہیں نہیں کی لیکن سنتا کون تھا۔ جو شخص بھی اپنے ساتھ

...ا تھا۔ وہ زبردستی امتیاز کے سر منڈھ کر واپس گیا

اور ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا۔ آخر زندگی بھر امتیاز کی آمدنی ——
—— اور وہ بہر حال معمولی نہ تھی —— کہاں صرف ہوئی ؟ ——
—— انہی دوستوں پر۔ پھر اگر آج اس کی اکلوتی لڑکی کی شادی ہو
رہی تھی تو وہ لوگ جن کے ہاں معمولی سے معمولی تقریب پر وہ زر و گوہر
نثار کیا کرتا تھا۔ کس طرح خاموش رہ سکتے تھے ؟ کچھ نہ کچھ تو انہیں
چاہیئے تھا منع کرنے اور روکنے کے باوجود نہ وہ باز آ سکتے تھے ، نہ
انہیں باز آنا چاہیئے تھا —— چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

احراز کی غیر حاضری اور کلثوم و نسیم کی عدم شرکت امتیاز کو بہت
کھلی ، لیکن اس نے الفاظ کے ذریعہ اپنے تاثرات و خیالات کا اظہار
نہیں کیا مگر اس تقریب کے اختتام پر رابعہ سے یہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا

"کیا احراز نے یا کلثوم نے بھی کوئی تحفہ دیا ہے ؟ ——
دیا ہو تو لا دو۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں !"

کلثوم نے جواب دیا۔ احراز میاں تو سرکاری کام سے باہر گئے
ہوئے ہیں۔ اور کلثوم کی کچھ طبیعت خراب ہے ، لہٰذا ——
"لہٰذا وہ کوئی تحفہ اپنی بھتیجی کو نہ دے سکے۔ —— یہی کچھ
کہنا چاہتی ہو ؟"

وہ چپ رہی لیکن نادرہ جو پاس ہی کھڑی تھی ، خاموش نہ رہ
سکی ، کہنے لگی :-

"گئے تھے تو جاتے، وقت دیتے جاتے ——— اور بیگم صاحب (کلثوم) اللہ رکھے کچھ بے ہوش تو ہیں نہیں، اچھی خاصی لیٹی ہیں کیا بیٹا (نسیم)، کے ہاتھ بھی کچھ نہیں بھیج سکتی تھیں ——— ؟

امتیاز نے خشونت کے ساتھ کہا :-

"ہاں جی وہی بات ہے ——— تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں -

وہ ہاں میں ہاں ملاتی ہوئی بولی :-

"جی اور کیا!"

امتیاز نے کہا، خیر میں بھی سمجھ لوں گا ؟

رابعہ لرز گئی، اس نے سوچا- اگر انہیں غصہ آگیا تو غضب ہو جائے گا، اس نے کہا!-

بھائی صاحب آپ ایسی معمولی باتیں کیوں سوچتے ہیں، خدا کے فضل سے ارشاد اور زلیخا کو آپ کے دوستوں اور ان کی بیویوں کی طرف سے اتنا کچھ مل گیا ہے کہ مجھے حیرت ہوتی ہے، سچ کہوں میری توقع سے کہیں زیادہ ہے

امتیاز نے اسی انداز اور لب و لہجہ میں جواب دیا

"یہ تو میں بھی جانتا ہوں، لیکن احراز کے دس روپے ان ساری قیمتی چیزوں پر بھاری تھے، ——— اسے ایسا نہ کرنا چاہیئے تھا۔

"ہاں چاہیئے تو نہیں تھا۔ رابعہ نے کہا :۔
اب میں نے بھی فیصلہ کر لیا ہے کہ نسیم کو جو کچھ اس کی شادی
دینے والا تھا، ہرگز نہیں دوں گا۔ یہ چیزیں بھی زلیخا کے کام آئیں
سچ رابعہ، میں نسیم کو زلیخا سے اور احراز کو اعجاز سے
نہیں چاہتا تھا؟
"میں جانتی ہوں بھائی صاحب!
مجھے حیرت اس پر ہے کہ اس طرزِ عمل کا آخر مطلب کیا ہے؟
"یہی تو میں بھی سوچتی ہوں"
نادرہ نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا :۔
"میں جانتی ہوں"۔
امتیاز نے زبان سے کچھ نہ کہا، لیکن سوالیہ نظروں سے اس
کی طرف دیکھنے لگا، وہ بولی،
"اگر آپ زلیخا کی شادی وہاں کر دیتے جہاں یہ لوگ چاہتے تھے
تو نہ چھوٹے میاں کو سرکاری کام پیش آتا نہ چھوٹی بیگم اب سے
اور بیمار پڑتیں۔ چونکہ آپ نے اس کی شادی اپنی سالی کے لڑکے
سے کر دی، اس لئے یہ خفگی ہے!"
وہ برہم ہو کر بولا، لیکن احراز کی یہ مجال کہ وہ مجھ سے خفا ہو؟
"لیکن میاں یہ زمانہ ہی ایسا ہے"
"... لوں گا۔"

"میں اس سے زندگی بھر کے لئے تعلقات منقطع کر لوں گا جس نے میری اس پہلی اور آخری خوشی میں شرکت گوارا نہیں کی - اس سے میرا کیا تعلق - میرا اس کا کیا ناتہ ؟"

رابعہ نے گویا دونوں بھائیوں میں صلح کرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا :-

"لیکن بھائی صاحب گوشت سے ناخن جدا نہیں ہوتا - خون کا رشتہ بھی عجیب ہوتا ہے ، وہ کسی طرح نہیں ٹوٹتا !"

امتیاز نے ایک آہ سرد کے ساتھ کہا :-

"لیکن وہ تو ٹوٹ گیا —— اب اس کا ذکر بیکار ہے !"

"نہیں بھائی صاحب ایسا نہ کہیئے "

امتیاز نے گھور کر رابعہ کو دیکھا اور پوچھا :-

"کیا مطلب ہے تمہارا ؟ کیا کہنا چاہتی ہو تم ؟"

وہ بولی "ممکن ہے واپس آکر اس بھول چوک کی تلافی کر دیں —

---

امتیاز نے برہمی کے ساتھ کہا :-

"خبردار ، اب اگر احراز یا کلثوم کچھ دینا چاہیں تو ہرگز قبول نہ کرنا اگر تم نے قبول کر لیا تو مجھے بہت صدمہ ہوگا اور میں قطعًا اسے واپس کر دوں گا "

رابعہ نے امتیاز کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا :-

، آپ کی اگر یہی مرضی ہے تو یہی سہی ـــــ اس طرح ٹال دوں
سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے ،

اتیاز کو اور زیادہ غصہ آگیا
"میں دکھاوے اور منافقت کی باتیں پسند نہیں کرتا۔ ٹالنے کا کیا
ال، صاف صاف کہدینا چاہیئے کہ نہ تم ہمارے، نہ ہم تمہارے - تم
ری خوشی میں شریک نہیں ہوئے ، ہمیں تمہاری کسی خوشی سے سروکار نہیں
ـــــ احراز تو سنا اب کام کا بہانہ کرکے بھاگا ہے ، اس لئے کہ
ں میں یہاں رہ کر شریک نہ ہونے کی اخلاقی جرأت نہیں تھی لیکن
ریں ہے۔ میں یہیں رہوں گا اور نسیم کی شادی میں شریک نہیں ہوں

رابعہ نے سوچا، یہ بحث جتنی زیادہ طویل ہوتی جائے گی، اتنی ہی
یادہ فیصلہ کن اور نازک صورت اختیار کرتی جائے گی۔ لہٰذا مصلحت اسی
ں ہے کہ بات گول کردی جائے۔ چنانچہ اس نے موضوع بدلنے کے
ے دوسری باتیں شروع کردیں۔ جن کا احراز یا کلثوم سے کوئی تعلق نہ
تھا۔

---

## (۳۱)

سعادت گنج میں حالات کچھ ایسے پیش آئے کہ ارشاد کو شادی کے چند ہی روز بعد وہاں جانا پڑا۔ ویسے بھی رابعہ بیگم کو آئے ہوئے یہاں کافی مدت ہو گئی تھی۔ اگر امتیاز کی صحت درست ہوتی تو کب کی زلیخا کو اپنے ساتھ لے کر چلی گئی ہوتیں، لیکن یہ مجبوریاں ایسی تھیں، جس نے ان کے پاؤں پکڑ رکھے تھے

ارشاد کو گئے ہوئے ابھی مشکل سے تین دن ہوئے ہوں گے کہ امتیاز کی حالت اور زیادہ سقیم ہو گئی اور ڈاکٹروں کے مشورہ سے لے ہسپتال میں داخل کرنا پڑا

زلیخا مستقل طور پہ باپ کی خدمت اور دیکھ بھال کے لئے وہیں تھی۔ رابعہ بھی دن میں ایک چکر ضرور لگا لیا کرتی تھی۔ زلیخا کا کھانا اور ناشتہ گھر سے جاتا تھا۔ اور یہ ڈیوٹی نادرہ کی تھی اور کوئی شبہ

ہیں - بڑے خلوص اور مستعدی کے ساتھ وہ اس فرض کو انجام دے رہی تھی -

امتیاز کا حال یہ تھا کہ کبھی حالت سنبھل جاتی، کبھی تشویش انگیز صورت اختیار کر لیتی - کبھی آس بندھ جاتی، کبھی یاس طاری ہو جاتی - زلیخا کا یہ حال تھا کہ ہر وقت باپ کی پٹی سے لگی بیٹھی رہتی اور خود امتیاز کی یہ کیفیت تھی کہ ذرا غوطہ سے آنکھ کھلی اور اس نے آواز دی :-

"زلیخا ——— زلیخا بیٹی!"

اور جب تک وہ بالکل پٹی سے لگ کر بیٹھ نہ جاتی اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں نہ لے لیتا قرار نہ آتا، اس کی حالت بالکل بچوں کی سی تھی - صرف زلیخا ہی اسے بہلا سکتی تھی - نہ نرس، نہ ڈاکٹر، نہ رابعہ، سب ہی بیکار تھے زلیخا اس کے زخم دل کا مرہم بھی تھی - چاہا بھی، سکون بھی، اس کے سہارے وہ اپنی زندگی کے دن پورے کر رہا تھا

نماز پڑھ پڑھ کر، قرآن کی تلاوت کر کر کے، رات کو پچھلے پہر جاگ جاگ کر اور رو رو کر، گڑ گڑا کر، وہ اپنے باپ کی صحت و تندرستی کی دعائیں مانگتی - ان دعاؤں سے کچھ وقتی سکون حاصل ہو جاتا - مگر جب اس پر بیہوشی کے دورے پڑتے جب وہ کراہتا، جب اس پر بے چینی اور اضطراب کی کیفیت طاری ہوتی تو وہ بچوں کی طرح بلبلا کر رونے لگتی - اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتی تھی!

ایک روز بیہوشی کے دورے سے امتیاز کی آنکھ کھلی اور اس نے زلیخا

کو پکارا، وہ پاس ہی بیٹھی تھی، کہنے لگی :-

" اباجی، میں یہ رہی آپ کے پاس !"

امتیاز نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ محبت سے دبایا۔ پیار بھری نظروں سے دیکھا اور پوچھا :-

" کیا اعجاز آ گیا !"

یہ تین لفظ تھے، لیکن ان تین لفظوں میں محبت، حسرت، اضطراب اور قلق کی دنیا سمٹ آئی تھی۔ زلیخا نے محسوس کر لیا۔ اس آن بان اور شان والے خوددار اور خودپرست باپ کے دل میں بیٹے کی یاد چٹکیاں لے رہی تھی۔ یہ چاہتا ہے کہ بیٹے کو دیکھے، اسے کلیجے سے لگائے، پیار کرے اور اپنا کلیجہ ٹھنڈا کرے لیکن وہ کہاں ؟

آج زندگی میں پہلی مرتبہ اسے اعجاز پر غصہ آیا :-

آج زندگی میں پہلی مرتبہ اس کے دل میں اعجاز سے بیزاری پیدا ہوئی۔ وہ دل ہی دل میں اعجاز کو ملامت کر رہی تھی کہ اس نازک گھڑی پر بھی وہ یہاں موجود نہیں ہے، آخری وقت بھی باپ کی دعائیں لینے کے لئے وہ یہاں موجود نہیں ہے۔ کاش وہ اس وقت یہاں موجود ہوتا۔۔۔

(۴)

اس سوال کا جواب زلیخا کے پاس کیا تھا؟ اور جو تھا وہ حد درجہ دل شکن اور مایوس کن ۔

وہ خاموش رہی ، اس نے کوئی جواب نہیں دیا ۔

امتیاز نے پھر سوال کیا ، " بیٹی کیا اعجاز آگیا ؟ ——— میں نے ابھی اسے دیکھا تھا ، اسے بلا دو ، لے آؤ میرے پاس ۔ میں تو اس سے ذرا بھی خفا نہیں تھا اور اگر تھا بھی تو معاف کر دیا ۔ وہ مجھ سے بجا طور پر خفا تھا ۔ اس کی یہ خفگی بھی سعادت مندی تھی ، وہ اس لئے خفا نہیں تھا کہ مجھ سے نفرت کرتا تھا ، اس لئے خفا تھا کہ اپنی ماں سے محبت کرتا تھا ۔ اسے خفا ہونا ہی چاہیئے تھا ۔ ماں کے لئے مجھ سے خفا ہو کر روٹھ کر اس نے میرے دل میں اپنی محبت پیدا کر لی ———

لیکن بیٹی تو میرا منہ کیوں تک رہی ہے ؟ اسے بلاتی کیوں نہیں ؟ کتنا یاد کیا کرتی تھی تو اسے، مگر اب ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس کے آنے سے تجھے خوشی نہیں ہوئی، کہیں تو اس سے لڑ تو نہیں پڑی ؟ کہیں تو نے اسے پھر تو خفا نہیں کر دیا ؟ ——— ہے ہے بیٹی یہ تو نے کیا کیا ؟

اور یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا، لیکن اس کی آنکھوں سے آنسو ڈھلکنے لگے۔ زلیخا یہ دلدوز منظر دیکھ کر کانپ گئی۔ تڑپ اٹھی، اس کا دل خون کے آنسو رونے لگا۔ اس کا بس چلتا تو جہاں بھی اعجاز کا سراغ ملتا خود پہنچتی اور اسے لا کر باپ کے قدموں پر جھکا دیتی لیکن مشکل تو یہی تھی کہ اب تک اس کا سراغ نہیں چل سکا تھا کہ وہ کہاں ہے ؟ کس شہر میں ہے ؟

اس نے دوپٹہ کے دامن سے باپ کے آنسو پونچھتے ہوئے اور لرزتی ہوئی آواز میں کہا :-

ابا جی، بھیا سے بھلا میں خفا ہو سکتی ہوں ؟ آپ کو یاد نہیں کتنی دفعہ میں نے آپ سے ان کی سفارش کی ہے ؟

وہ بولا " ہاں خوب یاد ہے مگر وہ کہاں ہے ؟ تو اسے میرے پاس کیوں نہیں لاتی ؟

بدرجۂ مجبوری زلیخا کو جھوٹ سے کام لینا پڑا، کہنے لگی :-

ڈاکٹر صاحب نے ایک دوا آپ کے لئے لکھی ہے۔ بہت ڈھونڈا لی

ہیں نہیں ملی۔ بھیا نے کہا، میں لے کر آتا ہوں۔ ملے گی کیسے نہیں
اس کی تلاش میں گئے ہیں

"کاش اسے معلوم ہوتا وہ دوا میرے لئے اتنی مفید نہیں ہے
جتنا اس کا وجود۔"

"بہت جلد آجائیں گے!"

"کتنی دیر میں؟"

"بس گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں۔"

"گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں ——— اخوہ کتنی لمبی مدت ہے یہ؟ ——— کیوں بیٹی، وہ دُبلا تو نہیں ہو گیا ہے؟"

"نہیں اباجی، وہ تو بہت تندرست ہیں، ماشااللہ"

"اور میرے متعلق اس کا کیا خیال ہے؟"

"آپ کے متعلق کیا خیال ہوتا؟ ——— وہ تو رو رہے تھے۔"

"(بے قرار ہو کر) "رو رہا تھا؟" کیوں؟ آپ کو بیمار دیکھ کر؟"

"بے وقوف ہے، میری حالت ایسی کون سی نازک ہے اور اب تو وہ آگیا ہے۔ اب تو میں ہرگز مرنا نہیں چاہتا۔"
زلیخا کی آنکھیں بدستور آب گوں تھیں، کہنے لگی:—

"اباجی، آپ بہت جلد اچھے ہو جائیں گے، ڈاکٹر ——"

"چھوڑو ڈاکٹر واکٹر، اب تو میرا مسیحا آ گیا —— اعجاز"

"اباجی آپ تو انہیں بہت چاہنے لگے ہیں؟"

"ہاں بیٹی! کیا تو اسے پسند نہیں کرتی؟ اپنی خوشی کس طرح بیان کروں؟

"اب ڈیڑھ گھنٹہ ہیں، یعنی اس کے آنے میں کتنی دیر باقی ہے؟"

"ابھی تو صرف پندرہ منٹ ہوئے ہیں اسے"

"پندرہ منٹ —— کیوں بیٹی وہ پھر تو نہیں چلا جائے گا"

"نہیں اباجی، اب وہ نہیں جائیں گے، اب وہ ہمیشہ آپ کے پاس رہیں گے، کہہ رہے تھے، اب ساری زندگی اباجان کی خدمت میں گزار دوں گا"

"واقعی یہ کہہ رہا تھا؟"

"جی اباجی یہی کہہ رہے تھے، یہ بھی کہہ رہے تھے، اباجی کی صحت اگر یہاں ٹھیک نہ ہوئی تو کسی دوسرے شہر میں لے جائیں گے علاج کے لئے!"

---

(۵)

وہ تو کہیئے، امتیاز کو بیہوشی کے دورے کثرت سے پڑ رہے تھے اور اس کی یادداشت بھی اسی وجہ سے کمزور ہو گئی تھی۔ اس لئے اعجاز کی عدم موجودگی کسی نئے طوفان کا پیش خیمہ نہیں بن سکی، اول تو ہر مرتبہ جب وہ ہوش میں آتا تھا، اعجاز یاد نہیں آتا تھا اور اگر آتا بھی تھا تو زلیخا بڑی ہوشیاری سے اس کی توجہ کسی طرف بدل کر دیتی تھی۔ یا کوئی ایسا بہانہ تراش دیتی تھی جسے چار و ناچار ماننا پڑتا تھا۔ یا اگر رٹ لگتی تو بار بار اسی کا ذکر کرتا اور جب بھول جاتا تو ذکر تک نہ کرتا۔ زلیخا خود بھی اکثر یہ ذکر چھیڑتی تو وہ سنی کی ان سنی کر دیتا اس کی یہ ذہنی و دماغی کیفیت اور تبدیلی اس حقیقت کی غماز تھی کہ حالت روز بروز گیا، لمحہ بہ لمحہ نازک سے نازک تر ہوتی جا رہی ہے۔ یہ محسوس کر کے وہ رونے لگتی یا دعا مانگنے لگتی —— بس اپنا تو اتنا

ہی مقدور ہے!

ایک روز امتیاز نے زلیخا سے بچوں کی طرح اصرار کرتے ہوئے کہا:-

"آج کھیر کھاؤں گا"

وہ دوڑی دوڑی نرس کے پاس گئی اور اس کے واسطے سے ڈاکٹر کی ہدایت طلب کی۔ ڈاکٹر نے تھوڑے سے تامل کے بعد اجازت دے دی لیکن یہ تاکید کر دی کہ شکر کم ڈالی جائے اور دودھ وہ استعمال کیا جائے جس کی چکنائی نکالی جا چکی ہو اور چاولوں کی پیچ بھی نکال دی جائے۔

ان کڑی شرطوں کے باوجود زلیخا خوش تھی کہ اجازت مل تو گئی نہ ملتی تو شاید اباجی کھانا ہی کھانے سے انکار کر دیتے۔ بیماری میں آدمی ویسے ہی چڑچڑا ہو جاتا ہے اور یہ تو ہمیشہ کے ضدی ہیں!

دوپہر کو جب نا ورہ کھانا لے کر آئی۔ تو اس نے کہا:-

"آج اباجی کا کھیر کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اجازت بھی دے دی ہے۔ وہ آٹھ بجے کھانا کھاتے ہیں۔ تم وقت سے پندرہ منٹ پہلے آ جانا۔ چونکہ شکر کم ڈالنی ہے اور دودھ بھی بالائی دار نہیں ہو گا، لہٰذا ایسی مزے کی پکاؤ کہ انگلیاں چاٹتے رہ جائیں۔ اگر کہیں ناپسند ہو گئی تو پوری سینی مع برتنوں کے تمہارے سر سے ٹکرائے گی"

نادرہ نے اطمینان دلاتے ہوئے کہا "بے فکر رہو ، ایسی مزے کی پکاؤں
لت آجائے۔"

جب وہ گھر واپس پہنچی تو رابعہ کو اس نے یہ فرمائش سنادی ۔ اس
بچاری نے اسی وقت سے تیاریاں شروع کر دیں۔ چاول نکالے، انہیں
ن کیا۔ ابالا، ان کی پیچ نکال کر پھینکی۔

اب دودھ کا سوال پیدا ہوا ؛ جو گوالا ہر روز دودھ دے جاتا تھا وہ
ی ہوتا تھا جو عام طور پر استعمال ہوتا ہے گھر میں، یعنی چکنائی سے
ر پور ۔ جب اس مشکل کا حل سمجھ میں نہ آیا تو رابعہ نے بے بسی کے ساتھ
ویا ہتھیار ڈالتے ہوئے پوچھا :۔

کیوں ری نادرہ دودھ کا کیا ہوگا ؟

وہ کچھ سوچتی ہوئی بولی ۔ قاضی ٹولے میں ایک دکان ہے ۔ وہاں
س طرح کا دودھ مل جاتا ہے ، کہیئے تو وہاں سے لے آؤں ——
یکن دور ہے ۔

رابعہ نے بٹوے سے پیسے نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا :۔

"کالے کوسوں دور کیوں ہو جاؤ ۔ بھائی صاحب کی فرمائش اور خواہش
ہر حالت میں اور ہر قیمت پر پوری کرنی ہے —— لیکن جلدی
انے کی کوشش کرنا تاکہ وقت پر انہیں پہنچ جائے

وہ مسکراتی ہوئی بولی " ہاں بی بی جلد لے آؤں گی بٹیا (زلیخا)
ی کہہ رہی تھیں اگر دیر سے آئی تو سینی معہ برتنوں کے تیرے سر

پوچھا :-

" اور ہماری چائے ؟"

وہ معذرت کرتی ہوئی کہنے لگی :-

" ہاں بیٹا آج بہت دیر ہو گئی - لیکن کچھ اپنے کام سے تو گئی نہیں تھی ، ...... اللہ سلامت رکھے تمہارے تایا کے کام سے گئی تھی - کتنے دنوں سے وہ بیمار ہیں - نہ کچھ کھاتے ہیں - نہ پیتے ہیں - آج انہوں نے خود اپنے منہ سے کھیر کی فرمائش کی تھی - زلیخا نے اصرار کیا تھا - ٹھیک وقت پر لے آنا - چکنائی نکلا ہوا دودھ یہاں کہیں تھا نہیں ، اس لیے قاضی ٹولے جانا پڑا ، ورنہ کب کی چائے دے چکی ہوتی ،

" اب اب چٹکی بجاتے ہیں بنائے دیتی ہوں "

---

پھر وہ رابعہ سے مخاطب ہوئی :-

" بی بی چاول تیار کر لئے ہوں تو کام شروع کر دو ، میں بیٹا کے لئے چائے بنا دوں ذرا - پھر اس سے فارغ ہو کر آتی ہوں ،

______________ جو کسر رہ جائے گی ساری پوری کر دوں گی -

نسیم آگے بڑھی - اس نے دودھ کا برتن نادرہ کے ہاتھ سے چھین لیا اور اسے تڑ سے صحن میں پھینک دیا اور کہا " دیکھا اباجی کیسی

بر لیتے ہیں آج تمہاری ؟"

اور پھر سیدھی تیر کی طرح اپنے کمرے میں چلی گئی !

## (۸)

نادرہ کو جلال آگیا!

وہ اس گھر کی پرانی خادمہ تھی۔ اس نے یہاں کا نمک کھایا تھا اور چھوٹے بڑے ہر ایک کی دل و جان سے خدمت کی تھی۔ اس گھر میں اس نے بہت سے منظر دیکھے تھے، اچھے بھی اور برے بھی۔ اس نے مریم کو دلہن بن کر آتے بھی دیکھا تھا اور کلثوم کو بھی، وہ نسیم کی ادا شناس بھی تھی اور زلیخا کی بھی۔ اس نے رابعہ کا روپ بھی دیکھا تھا اور صفدر، ارشاد اور اعجاز کا بھی۔ اس نے احراز کی چاکری بھی کی تھی اور امتیاز کی بھی۔ ان سب کے اوضاع و اطوار، عادات و خصائص اور حرکات و سکنات شب و روز اس کی نظر میں تھے۔ ایک زمانہ تھا کہ اس کا دل امتیاز سے نفرت کرتا تھا اور مریم کے لئے خون

کے آنسو رونا تھا۔ زلیخا کے لئے پھٹا جاتا تھا۔ اور اعجاز کے لئے تڑپا کرتا تھا۔ پھر جب مریم مرگئی تو وہ اور زیادہ زلیخا اور اعجاز کی طرف مائل ہو گئی اور جب امتیاز نے اپنی روش بدلی تو وہ اس کی چاکری بھی دل وجان سے کرنے لگی۔ اس سے ہمدردی پیدا ہو گئی۔ اس کی تکلیف پر کڑھنے لگی، جب سے وہ بیمار ہوا تھا۔ اس کا صرف ایک کام رہ گیا تھا۔ وہ دل وجان سے اپنے آقا کی خدمت میں لگی ہوئی تھی نہ اسے اپنا ہوش تھا نہ کسی دوسرے کا۔ پھر بھی جہاں تک ہوتا، وہ اپنی ذمہ داریاں انجام دینے کی کوشش کرتی رہتی، لیکن آج کے واقعہ نے اسے حواس باختہ کر دیا، اس کے لئے ضبط کرنا دشوار ہو گیا۔ اس نے بغیر کسی جھجک کے کلثوم سے کہا:-

"بی بی سلام ہے ایسی نوکری کو۔ میں باز آئی!

کلثوم کا پارہ چڑھ گیا اور ساتھ ہی ساتھ پاؤں کے نیچے سے زمین بھی نکل گئی۔ اتنی کارگزار، فرض شناس اور محنتی، ساتھ ہی ساتھ سستی ملازمہ کہاں مل سکتی تھی۔ یہ چلی گئی تو کیا ہوگا؟ گھر کا کام کس طرح چلے گا؟ کچھ استمالت اور کچھ برہمی کے لہجہ میں کہا:-

"کچھ دیوانی ہوئی ہے؟"

وہ بولی، "ہاں میں دیوانی ہو گئی ہوں، اب مجھے نہ یہاں رہنا ہے نہ کام کرنا ہے۔ میں نے آج تک کی تنخواہ معاف کی، میرا کہنا سننا معاف کرنا۔

پھر وہ رابعہ سے مخاطب ہوئی اور کہنے لگی :-

لیکن جب تک بڑے صاحب ٹانتیانہ ، اچھے ہو کر نہیں آجاتے یہاں کا کام برابر کرتی رہوں گی

کلثوم نے کہا : " اگر تو نے نوکری چھوڑ دی ہے تو اس گھر میں قدم بھی نہیں رہ سکتی "

وہ بولی : " آپ کی طرف قدم نہیں رکھوں گی ، لیکن بڑے صاحب کی طرف آنے سے اور وہاں کا کام کرنے سے مجھے کون روک سکتا ہے ؟"

کلثوم نے سینہ ٹھونک کر کہا ، " ہم روک لیں گے "

رابعہ نے ان دونوں کی جنگ میں کوئی حصہ اب تک نہیں لیا تھا ، اب وہ بولی :-

" خدا کے لئے رحم کرو - ان باتوں سے کیا فائدہ ہوگا ؟

———— وہ ہسپتال میں بیمار پڑے ہیں کتنے شرم کی بات ہے کہ ان کے لئے یہاں سے کھانا بھی نہیں جا سکتا - ذرا سی چائے کے لئے ؟"

نادرہ بولی " وہ تو جائے گا - ابھی الٹے پاؤں بھاگتی ہوئی جاتی ہوں اور دودھ لے کر آتی ہوں - دیکھ لینا پلک جھپکنے میں کھیر تیار ہوگی ، اور خدا نے چاہا تو ٹھیک وقت پر انہیں پہنچا آؤں گی تم ذرا بھی فکر نہ کرو "

رابعہ کو حوصلہ مل گیا ، کہنے لگی " ہاں میری بہن ، جلدی سے دودھ

لے آ، کافی دیر ہو گئی ہے۔

"ابھی لائی۔" یہ کہہ کر نادرہ نے زمین پر گرا ہوا برتن اٹھایا، اسے جلدی جلدی دھویا، اور چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد کلثوم نے کہا:۔

بھئی تم تو بڑی سبز قدم بن کر آئی ہو۔ اس گھر میں جب سے قدم رکھا ہے، آفتیں ہی آفتیں نازل ہو رہی ہیں۔ آخر اپنے گھر کب جاؤ گی!"

وہ بولی، "یہ بھی تو میرا گھر ہے، کیا کسی غیر کا ہے؟"

کلثوم نے جواب دیا، "نہیں کسی غیر کا کیوں ہوتا۔ ماشاءاللہ جب بھائی صاحب تمہارے ہیں تو یہ گھر کیسے تمہارا نہیں ہے؟"

وہ جل کر بولی:۔ اچھا یہی سہی۔ یہ نہ سمجھو کہ آسمان کا تھوکا منہ پر آتا ہے کہیں میرے منہ سے بھی کوئی ایسا ویسا لفظ نکل گیا تو روتی روتی پھرو گی۔

---

(۹)

نہ جانے نسیم نے باپ سے جاکر کیا لگایا کہ احراز جو اب تک کمرہ میں بیٹھا تھا باہر آیا، اس نے نفرت اور حقارت سے بھری ہوئی ایک نظر رابعہ پر ڈالی پھر کلثوم سے کہا:-

"کیا ہو رہا ہے یہاں اتنی دیر سے؟"

وہ بولی، "شامت آئی تھی جو اس طرف نکل آئی —— نادرہ بھی ہاتھ سے گئی۔

(چونک کر) نادرہ کو کیا ہوا؟"

"اس نے نوکری چھوڑ دی۔"

یہ کیوں، اس کی یہ جرأت؟

"جرأت دلائی گئی تو پڑی، اس کا کیا قصور؟"

کس نے جرأت دلائی ——

"(رابعہ کی طرف اشارہ کر کے) کھڑی تو ہیں تمہارے سامنے ——

وہاں کام نہیں کرے گی۔ صرف یہاں کا کام کیا کرے گی؟"

"مارے ہنٹر کے کھال ادھیڑ دوں گا حرامزادی کی ——

وہ ہے کہاں؟"

"دودھ خریدنے کے لئے بھیجی گئی ہے!"

اب تک کلثوم اور احراز میں باتیں ہو رہی تھیں۔ اب احراز نے رابعہ سے تخاطب کرتے ہوئے کہا:۔

آپ کو اس طرح کی باتیں کرتے ہوئے شرم آنی چاہیئے، آپ تو اس گھر میں ایک زندہ —— ہنگامہ، ایک طوفان بن کر آئی ہیں۔

رابعہ نے کہا "تمہاری بیٹی مجھے گالیاں دے کر گئی ہے۔ تمہاری بیوی جتنی صلواتیں سنا سکتی تھیں۔ جی بھر کے سنا لیں۔ جو رہی سہی کسر ہو وہ تم پوری کر لو۔ وہ بھی سن لوں گی۔ لیکن بات کیا ہے، یہ بھی تو سن لو!"

اور پھر رابعہ نے ساری کہانی از اوّل تا آخر سنا دی۔ اس کے بعد گویا ہوئی:۔

ذرا کلیجہ پر ہاتھ رکھ کر جواب دو کیا میری یا نادرہ کی کوئی خطا ہے؟ کوئی غلطی ہے؟

لیکن رابعہ کی باتوں سے احراز مطمئن نہیں ہوا، اس نے کہا:-

"نادرہ کی خطا تو یہ ہے کہ اس نے بدزبانی کیوں کی؟ اور آپ کی خطا یہ ہے کہ اسے شہ کیوں دی؟ اور یہ دونوں خطائیں ناقابل معافی ہیں۔ لیکن بیچ میں بھائی صاحب ہیں۔ وہ جب تک ہسپتال سے نہیں آجاتے میں خاموش رہوں گا، اس کے بعد انہی سے بات ہو گی۔ خواہ اس کا نتیجہ کچھ کیوں نہ نکلے۔

پھر اس نے کلثوم سے کہا:-

بھائی صاحب کے ہسپتال سے آنے کے بعد نادرہ کو سزا بھی ملے گی اور وہ یہاں رہنے بھی نہیں پائے گی، اور اگر اسے رکھنے پر اصرار کیا گیا تو اس وقت فیصلہ بھی ہو جائے گا، تم کسی اور ملازمہ کا انتظام کر لو۔"

وہ بولی!

"ہاں بس آج کی تکلیف ہے۔ کل کوئی ملازمہ ضرور آجائے گی۔"

احراز چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی زلیخا آگئی۔ رابعہ نے بیقرار ہو کر پوچھا:

خیر تو ہے میری بچی، تو کیسے آگئی اس وقت؟ بھائی صاحب تو اچھے ہیں؟"

وہ سنجیدگی اور افسردگی کے ساتھ بولی :-

جیسے تھے ویسے ہی ہیں۔ اس وقت سو رہے ہیں۔ ڈاکٹر نے
ب آور دوا دی ہے۔ میرے کپڑے بڑے چکٹ ہو گئے ہیں۔ سوچا
ں لوں جا کر۔"

وہ مستعدی اور آمادگی کے ساتھ گویا ہوئیں

"ابھی پانی گرم کئے دیتی ہوں

وہ بولی "آپ کیوں یہ تکلیف کریں، میں خود کر لوں گی ——
ں خالہ اماں، اباجی کی کھیر؟

"نادرہ دودھ لینے گئی ہے؟ ——————

ب؟"

بس آتی ہی ہوگی، وہ تو کب کی دودھ لے کر آئی تھی، لیکن دیکھ

——

رابعہ نے جدھر اشارہ کیا تو زلیخا نے اس طرف دیکھا، لیکن
سمجھ نہ سکی، کہنے لگی :-

کیا بات ہے خالہ جان؟ —— یہاں تو کچھ پانی سا بہا
نظر آتا ہے!"

وہ بولیں :-

نہیں بیٹی، یہ پانی نہیں دودھ ہے۔

زلیخا کے استفسار پر آخر انہیں ساری داستان سنانا پڑی ۔ وہ رابعہ سے زیادہ بے بس تھی ۔ صبر کر کے خاموش ہو رہی اور باورچی خانے میں نہانے کے لئے پانی گرم کرنے چلی گئی ۔

(۱۰)

نہا دھو کر، کپڑے بدل کر جب زلیخا غسل خانے سے باہر آئی تو،
رہ کھیر تیار کر چکی تھی۔ اس کی اس مستعدی اور کارگزاری سے
لیخا بہت خوش ہوئی، کہنے لگی:۔

"تمہارا نام تو نادرہ کے بجائے بجلی ہونا چاہیئے تھا۔ کتنی جلدی
را کام کر ڈالا۔

کوئی اور وقت ہوتا تو اس خراج تحسین پر نادرہ کی باچھیں کھل
تیں۔ لیکن نسیم اور کلثوم کی باتوں نے اس کے دل میں زخم ڈال
یا تھا۔ چپ رہی کچھ نہیں کہا:۔

زلیخا نے کہا،

"میں ابھی ہسپتال جا رہی ہوں اگر کوئی اور کام نہ ہو تو چلو ساتھ ساتھ

چلے چلیں گے!"

زلیخا کا مقصد یہ تھا کہ راستہ میں اور ہسپتال میں اس کی کڑی دیکھ بھال کرے گی۔ نادرہ راضی ہوگئی کہنے لگی:۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ میں بھی چلتی ہوں۔ یہاں تو اب کوئی کام ہے نہیں۔"

زلیخا اور نادرہ ہسپتال جانے کے لئے تیار ہوگئیں، زلیخا آگے آگے اور نادرہ پیچھے پیچھے زلیخا کے ہاتھ میں کچھ کتابیں، نادرہ کے سر پر سینی!

یہ دونوں کمرہ سے نکل کر صحن میں آئیں اور باہر کے دروازہ کی طرف بڑھی ہی تھیں کہ نسیم تیز تیز چلتی ہوئی آئی اور راستہ روک کر کھڑی ہو گئی، زلیخا نے پوچھا:۔

"کیا بات ہے نسیم؟"

وہ بولی "بات کیا ہوتی۔ یہ حرامزادی نادرہ نہ اس گھر میں رہ سکتی ہے۔ نہ یہاں کسی کا کام کر سکتی ہے۔ اس نے ہماری نوکری چھوڑ دی۔ ہم نے اسے گھر سے نکال دیا۔

زلیخا نے جواب دیا "بہت اچھا کیا نکال دیا، اب وہ صرف ہمارے ہاں کام کرے گی!"

نسیم بولی، "یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ہمارا باغی اس گھر کے کسی گوشہ میں پناہ نہیں پا سکتا۔"

"تو تمہارا مطلب ہے میں نکال دوں اسے ؟"

"ہاں یہی مطلب ہے"

لیکن اس کی خطا ؟ اس کا قصور ؟ اس کا جرم ؟

"اس نے ہمارے لئے چائے نہیں بنائی اور دودھ کے لئے بازار کے پھیرے پر پھیرے کرتی رہی"

لیکن وہ تو اباجی کے لئے کھیر ————

"نہ ہمیں تم سے مطلب ہے، نہ تمہارے اباجی سے، نہ کھیر سے، نہ پلاؤ زردے سے نہ تمجن مزعفر سے!"

"کیا میرے اباجی تمہارے کوئی نہیں ہیں ؟"

"یہی سمجھ لو"

"پھر تمہارا مطلب کیا ہے ؟ چاہتی کیا ہو ؟"

"نادرہ کی صورت میں دیکھنا نہیں چاہتی، وہ یہاں اس گھر میں نہیں رہے گی!"

"اچھا اس وقت تو جانے دو اسے، یہ فیصلہ واپسی پر کر لینا"

"جب تک یہ فیصلہ نہ ہو جائے کہ یہ اب واپس نہیں آئے گی، میں نہیں جانے دوں گی۔ اس کے سر پر جو کچھ ہے پھینک دوں گی بتائے دیتی ہوں!"

"اس کے سر پہ تو اباجی کا کھانا ہے، کیا اسے بھی پھینک

رو دو گی ؟"

"ہاں اسے بھی پھینک دیں گے ؟"

"مجرم میں ہوں، خالہ اماں ہیں، نادرہ ہے، ان بیچارے نے کیا کیا ہے۔ وہ تو ہسپتال میں بیمار پڑے ہیں ؟"

"ہاں اور کیا بیچارے ہسپتال میں بیمار پڑے ہیں، لیکن کھیر کے شوق میں مرے جا رہے ہیں۔ بے چارے بیمار پڑے ہیں، لیکن صاحبزادی صاحبہ سولہ سنگار کر کے گشت کو نکلی ہیں۔ بے چارے مرے جا رہے ہیں لیکن صاحبزادی کی ساس صاحبہ، اور ان بے چارے کی محبوبہ تر مال پکا رہی ہیں، کھا رہی ہیں، کھلا رہی ہیں!" ———

کیا خوب ہیں وہ بیچارے، اور کیا خوب ہے ان بیچارے کی بیماری!"

اپیل کے انداز میں زلیخا نے کہا "نسیم یہ تم کہہ رہی ہو؟ ——— یہ الفاظ تو ایسے موقعہ پر کسی دشمن کے منہ سے بھی نہیں نکل سکتے!"

"یہاں دوستی کا دعویٰ کسے ہے، دشمن ہی سمجھ لو!"

"اپنے چچا کی بیٹی کو دشمن سمجھ لوں؟ ——— کیا واقعی قیامت قریب آ گئی ہے ؟"

"ہاں بہت قریب آ گئی ہے اور بہت جلد نمودار ہونے والی ہے اگر نادرہ نے بوریا بستر نہ اٹھایا۔"

زلیخا کچھ دیر خاموش رہی، پھر اس نے نادرہ سے کہا:-
"اپنا بستر ساتھ لے لو، تم ہسپتال میں رہنا۔ میں یہاں رہوں گی
ا اباجی کو تندرست کردے، اگر وہ اپنے ساتھ لائیں تو چلی آنا، نہ
ئیں تو جہاں جی چاہے سدھار جانا۔

---

حصّہ نہم

# خدا کی چکّی

دیر میں پیستی ہے لیکن بہت
باریک پیستی ہے

○

(۱)

نادرہ اپنا بستر اور کپڑے لینے سیلنی وہیں رکھ کر چلی گئی۔ نسیم اب تک پیکرِ قہر و جلال اور مجسمۂ خشم و عتاب بنی کھڑی تھی، جیسے بس چلے تو نادرہ کو ابھی قتل کر دے اور زلیخا کو کچّا چبا جائے اور رابعہ کے تکّے بوٹی کر دے، لیکن زلیخا نے اس کی بات مان لی تھی۔ فیصلہ کر لیا تھا کہ نادرہ ہسپتال میں رہے گی اور وہ گھر میں، اب کس بات پہ لڑتی؟

اسی اثنا میں یکایک دروازہ کھلا اور اعجاز نمودار ہو گیا

اعجاز کو دیکھتے ہی زلیخا بیتابی کے ساتھ اس کی طرف لپکی،

بھیا آپ آ گئے؟

اعجاز نے اس کا سر اپنے سینہ سے لگا کر اور محبت سے پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:۔

ہاں میں آگیا ——— میں کافی دیر کا آیا ہوا ہوں، دروازہ میں قدم رکھا تو دنگے اور فساد کی آوازیں کانوں میں آئیں۔ وہیں ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا اور دروازے کی اوٹ سے مہابھارت کا تماشہ دیکھنے لگا ——— یہ کیسی لڑائی تھی زلیخا؟

زلیخا نے بات کو ٹالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:۔

"کچھ بھی نہیں، گھروں میں یہ ہوتا ہی رہتا ہے"

لیکن اعجاز کی تسلی نہیں ہوئی، اس نے کہا:۔

مگر اباجی کا نام بھی بیچ میں کئی بار آیا، وہ کہاں ہیں؟، کیسے ہیں؟

زلیخا کو بات کے پلٹنے کا موقعہ مل گیا۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر بھرائی ہوئی آواز میں بولی:

"وہ ہسپتال میں موت سے لڑ رہے ہیں بھیا"

اور پھر وہ اس کے سینہ سے لگی لگی سسکیاں لے لے کر رونے لگی، اعجاز کی حالت بھی متغیر ہو گئی، اس نے کہا:۔

"خدا کے لئے بتاؤ، کیا بات ہے؟"

زلیخا نے مختصر طور پر ساری داستاں سنادی اور کہا:۔

بھیا وہ ہوش و حواس کھو بیٹھے ہیں۔ انہیں کوئی بات یاد نہیں رہتی وہ سب کو بھول چکے ہیں۔ لیکن اعجاز کی یاد میں ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ رہے ہیں

"وہ مجھے یاد کرتے ہیں ؟"

ہاں —— بہت زیادہ ہر وقت :

"وہ مجھ سے خفا نہیں ہیں ؟"

"بالکل نہیں —— بھیّا انہوں نے آپ کو معاف کر

"

"انہوں نے مجھے معاف کر دیا ؟"

ہاں بھیّا —— بالکل معاف کر دیا - وہ کہتے ہیں اعجاز
کوئی خطا ہی نہیں تھی ، وہ کہتے ہیں میرا لڑکا بڑا خود دار ہے
باغیرت ہے ، مجھے اس پر فخر ہے ، ناز ہے ، وہ مجھ سے اس
نہیں رد ٹھا کہ مجھ سے نفرت کرتا تھا ، اس لئے خفا ہوا کہ اپنی ماں
محبت رکھتا تھا - وہ اپنی ماں کی محبت میں مجھ سے خفا ہوا ، مجھے
جرم کا اقرار ہے ، اس جرم پر میں شرمسار ہوں - خود مجھے اپنے آپ
نفرت ہونے لگتی ہے ——

گلوگیر آواز میں " زلیخا —— " ہاں بھیا میں غلط نہیں کہتی
آپ ہی کے غم میں بیمار پڑے ہیں - آپ کی فرقت نے انہیں زندہ درگور
دیا ہے - وہ بھی تو آخر آپکے باپ ہیں - ان کی خودداری نے اس
اجازت نہ دی کہ آپ کا تعاقب کریں ، آپ کو بلائیں ، لیکن وہ برابر
آپ کو یاد کرتے رہے ، اور یاد کر کر کے روتے رہے ——

زلیخا ، زلیخا ، یہ میں کیا سن رہا ہوں "

"بھیاؔ میں غلط نہیں کہتی"

"لیکن سچ بھی کس طرح مان لوں؟"

مانناہی پڑے گا، وہ اب بالکل بدل گئے ہیں، سچ مچ بدل گئے ہیں ———

"بدل گئے ہیں؟"

ہاں ——— بہت زیادہ، اب وہ ہر وقت امی کو یاد کیا کرتے ہیں - ان کی یاد میں آہیں بھرا کرتے ہیں، ان سے ملنے کے لئے مرنے کی دعائیں کرتے رہتے ہیں ———

"کیا واقعی زلیخا؟"

جی بھیا، اب وہ مجھے بھی بہت چاہنے لگے ہیں - بہت ——— میری جتنی خدمت انہوں نے کی ہے، جس محبت، پیار اور شفقت کا برتاؤ کرتے رہے ہیں اگر امیؔ زندہ ہوتیں تو وہ بھی اس سے زیادہ نہیں کر سکتی تھیں ———

"وہ تجھے چاہتے ہیں اب؟ ——— واقعی؟"

"چاہنے کی کوئی حد نہیں بھیا - وہ اب میرے باپ نہیں ماں ہیں ——— صرف میرے ہی نہیں، آپ کے بھی"

"میرا نام نہ لو، میں بہت نالائق ہوں ———"

"یہی اکثر میں بھی سوچا کرتی تھی - جیسے جیسے ابا جی کی محبت بڑھتی گئی - میں آپ سے خفا ہوتی گئی، لیکن ان کے دل کو دیکھیے، وہ آپ سے ——— ایک لمحہ کے لئے بھی خفا نہیں

ے؟"

"زلیخا یہ میں کیا سن رہا ہوں؟"

" کئی دن سے انہیں رٹ لگی ہوئی ہے کہ اعجاز آگیا ہے،
نے خود اسے دیکھا ہے لیکن وہ چلا کیوں گیا؟ کہیں وہ مجھ سے
تو خفا نہیں ہو گیا؟ کہیں تو نے اس سے لڑائی تو نہیں کر لی
جھوٹ بول بول کر میں انہیں سمجھاتی ہوں، بہلاتی ہوں، دھوکا
ہوں، کبھی کہتی ہوں دوا لینے گئے ہیں، کبھی بناتی ہوں۔ آ
ہیں۔ کبھی کہتی ہوں ڈاکٹر سے حال کہنے گئے ہیں۔ وہ دروازے کی
تکتے رہتے ہیں کہ میرا بیٹا آکر پھر کہاں چلا گیا؟"

"زلیخا چلو، مجھے ان کے پاس لے چلو؟"

چلیئے ——— آپ کو وہ دیکھ کر کتنے خوش ہوں گے،
اندازہ بھی نہیں کر سکتے، آپ کو دیکھ کر ان کی آدھی بیماری
جائے گی۔ آپ کو دیکھ کر وہ اچھے ہو جائیں گے بھیّا؟"

تم تو تقریر کئے جا رہی ہو، چلتیں کیوں نہیں ———
نادرہ کو تو آ لینے دیجئے!"

اتنے میں نادرہ آگئی۔ اعجاز کو دیکھ کر پھول کی طرح کھل
رابعہ بیگم اپنے کمرہ میں رونق افروز تھیں۔ نسیم اور زلیخا کی
سن سن کر ہول رہی تھیں۔ نادرہ نے انہیں آواز دی،
ڑا کر اٹھیں کہ خدا جانے کیا حادثہ رونما ہو گیا۔ اب تو وہ

ہر وقت کسی خوفناک حادثہ کے انتظار میں رہتی تھیں۔ لیکن صحن میں آکر ان کی نظریں اعجاز پر پڑیں، اسے دیکھتے ہی وہ مادرانہ شفقت کے ساتھ آگے بڑھیں اور اسے کلیجہ سے لگا لیا۔ پھر جھپکیاں پھکوں رونے لگیں، کہنے لگیں:۔

"میرے لال تو کہاں چلا گیا تھا؟ تو نے روپوش ہو کر اپنے باپ کو نیم جان کر دیا۔ تو آپا کے لئے ان سے خفا ہوا، لیکن یاد رکھ! اگر تو نہ آتا، اور خدانخواستہ بھائی صاحب کی آنکھیں بند ہو جاتیں، تو ہرگز آپا تجھے معاف نہ کرتیں، کیا تو بھول گیا، وہ ان کی عزت و احترام کی کتنی تاکید کرتی رہتی تھیں تم بھائی بہن کو ——

اعجاز نے آشفتہ خیالی کے ساتھ یہ جواب دیا:۔

سب یاد ہے خالہ اماں —— واقعی میں بڑا نالائق ہوں۔ میں نے جو کچھ کیا اس پر حد درجہ نادم ہوں۔ میں ابھی جاتا ہوں، اور ان سے معافی مانگوں گا۔ ان کے قدموں پر سر رکھ دوں گا۔ جب تک وہ معاف نہیں کریں گے، میرا جھکا ہوا سر نہیں اٹھے گا؟

نادرہ نے ٹوکا، "اچھا یہ باتیں پھر ہوتی رہیں گی، دیر ہوتی جا رہی ہے، چلتے ہو تو چلو ورنہ میں چلی؟

تینوں ہسپتال روانہ ہو گئے، نسیم ابھی تک اسی جگہ کھڑی
تھی، لیکن گم سم، حیران اور ششدر،

---

## (۲)

نادرہ اور زلیخا کے ساتھ اعجاز ہسپتال کی طرف روانہ ہوا۔

"لیکن اس وقت اس کی عجیب کیفیت تھی"؟

آج وہ اپنی پچھلی زندگی کا جائزہ لے رہا تھا ——————

آج اسے بہت سی بھولی بسری باتیں یاد آ رہی تھیں۔ ماں کی محبت باپ کی سفّاکی، بہن کی مظلومیت اور خاندان کی بے حسی اور بے تعلقی پھر ماں کا انتقال، جذبۂ نفرت کی نشو و نما۔ پھر اس کی دھنسی ہوئی قبر دیکھ کر اشتعال، باپ سے بے انتہا نفرت، پھر زلیخا کی باتیں، نسیم کا زیور، چچا سے صاف صاف باتیں۔ تلخی۔ بدمزگی۔ پھر چوری کی تہمت چچا کی شعلہ سامانی۔ جلا وطنی، بلا ٹکٹ سفر، ایک نئے شہر میں

ردد ، ایک عجیب انسان کے دامن میں پناہ ۔ کالج میں داخلہ ، محنت ، یابی ، پھر خود ہی اپنے مربی اور محسن کے فیض صحبت سے فکر و نظر اصلاح ، اپنے گذشتہ طرزِ عمل پر ندامت ، باپ سے معافی نے ، اس کی خدمت کرنے اور اس کے قدموں کے تلے رہنے کا فیصلہ کے کئی سال کے بعد واپسی وطن ، اور یہاں آکر زلیخا اور نسیم کی جنگ نظارہ !

یہ ساری باتیں اس کے دماغ کو پریشان کر رہی تھیں ۔ آخر س سے ضبط نہ ہو سکا ، زلیخا سے پوچھا ۔

" کیوں زلیخا ! یہ نسیم کچھ بدلی بدلی سی معلوم ہوتی ہے نا ؟"

وہ بولی ، " کچھ ؟ بھیا وہ تو نہ جانے اپنے آپ کو کیا سمجھنے لگی ۔ ہم لوگوں کو تو اس قدر ذلیل کرتی ہے کہ بعض وقت خودکشی کو ی چاہنے لگتا ہے ۔ اور میں تو سب کچھ سہہ بھی لوں لیکن جب وہ اماں بیچاری کی سات پشتیں کھنگالنے لگتی ہے تو اتنا دکھ ہوتا ہے کیا کہوں ؟ ——— بڑی شرم آتی ہے اور اُن غریب کی ت دیکھ کر تو کلیجہ مسوسنے لگتا ہے ۔"

وہ کچھ سوچتا ہوا بولا ، " سخت تعجب ہے ؟"

" تعجب کیوں ہے بھیا ؟"

" جب میں گیا تھا تب تو وہ ایسی نہیں تھی ؟"

"لیکن آپ کے جانے اور آنے کی مدت میں زمانہ بہت آگے
بڑھ چکا ہے، بہت سی تبدیلیاں ہو چکی ہیں، بہت سے تغیرات عمل میں
آچکے ہیں۔"

"ہوگا بھی۔"

"تو کیا آپ کو یقین نہیں آتا؟"

"نہ بھی آئے تو آنکھوں کو اور کانوں کو کہاں تک جھٹلا سکتی
ہوں۔"

"صفدر پر تو اسے اتنا غرّہ ہے، کہ بس کچھ نہ پوچھیے"

"صفدر ——؟"

"ہاں، اس کا ماموں زاد بھائی، اسی سے تو منگنی ہوئی ہے۔

—— آپ جانتے تو ہیں صفدر کو؟"

"ہاں بہت اچھی طرح —— لیکن کیا چچا بھی اسے
نہیں سمجھاتے کہ تم سے اور نادرہ سے ایسا برتاؤ نہ کیا
کرے؟"

"وہ تو سب سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں؟"

"پھوپھی تو دو گز آگے ہوں گی؟"

(ہنستے ہوئے) جی ہاں اور کیا —— بلکہ دوسو
گز۔"

"تو یہ گھر چھوڑ کیوں نہیں دیتیں تم؟"

"کیوں چھوڑ دوں؟ کیا صرف ان کا ہے؟ ہمارا نہیں
ہے؟"

"(مسکراتے ہوئے) معلوم ہوتا ہے، تم بھی فسادی ہوگئی
ہو؟"

"تھی تو نہیں، لیکن جیسے کو تیسا بننا ہی پڑتا ہے!"

"لیکن یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہے؟

بہت چپ رہی، بہت ظلم سہے۔ مجھ پر ان لوگوں نے جو ظلم
توڑے ہیں، آپ سنیں تو رونے لگیں ———

"واقعی ———

ہاں بھیا! یہ جان کر کہ اباجی میری خبر نہیں لیتے اس گھر میں میرا کوئی
ہمدم اور دمساز نہیں۔ ان ماں بیٹی نے ناکوں چنے چبوائے ہیں، کوئی
دقیقہ نہیں اٹھا رکھا تھا۔ وہ تو میں ہی اتنی سخت جان تھی،
بچ گئی!"

خالہ اماں کب آئیں ———؟

"کافی دن ہو گئے انہیں آئے ہوئے!"

لیکن وہ اکیلی ہی آئی ہیں ——— ارشاد نہیں آیا ان کے
ساتھ؟

زلیخا نے کوئی جواب نہیں دیا، ذرا دیر انتظار کے بعد، اعجاز
نے پھر بھی سوال دوہرایا۔ لیکن اس دفعہ بھی زلیخا نے چپ سادھے

رکھی، نادرہ نے حقیقت کے چہرے سے پردہ اٹھاتے ہوئے کہا:۔
آئے تھے، ابھی گئے ہیں چند دن ہوئے ——— کچھ خبر بھی ہے نہیں؟"
"اخبار تو تم ہو، کوئی نئی اور تازہ خبر سناتی ہو؟"
"ہاں بڑے مزے کی!"
"تو انتظار کاہے کا ہے؟"
"منہ میٹھا کرنے کا وعدہ کر دیجئے!"
"وعدہ کرنے میں کیا بگڑتا ہے ——————— کر لیا وعدہ!"
"ارشاد سے زلیخا کی شادی ہو گئی؟"
"(حیرت سے) واقعی؟ ———
——— نہیں منگنی ہوئی ہو گی، اتنی جلدی شادی کیسے ہو سکتی ہے؟"
"وہ تو ہو بھی گئی۔ بڑے صاحب کو بڑی جلدی تھی، وہ بضد تھے کہ یہ رشتہ جلد از جلد ہو جائے"
"اچھا تو یہ بات ہے، ——————— یہ بات ہے اس لئے یہ میرے سوال کا جواب نہیں دے رہی تھی"
"ہاں اور کیا شرماتی ہے؟" ——— اتنے میں ہسپتال آگیا، نادرہ نے سبق پڑھایا،

"بس جاتے ہی قدموں پر گر جانا، سارے گلے شکوے آن کی آن میں ختم ہو جائیں گے۔"

(۳)

ہسپتال آگیا!

اعجاز باپ کے کمرے میں پہنچا، بہت سی آرزوؤں اور تمناؤں کا پشتارہ لے کر، لیکن باپ سے مل نہ سکا!

دو گھنٹے سے امتیاز بیہوش پڑا تھا۔ ڈاکٹروں کی تشخیص، یہ تھی کہ ہیمبرج ہوگیا ہے، یعنی دماغ کی رگ پھٹ گئی ہے۔ وہ پہلے بھی اس کی زندگی سے مایوس تھے، اب تو انہوں نے صاف جواب دے دیا اور کہہ دیا، بس اب منٹوں، یا بہت سے بہت گھنٹوں کا معاملہ ہے۔"

امتیاز بسترِ علالت پر اس طرح دراز تھا جیسے سو رہا ہو،

آج کتنے دنوں کے بعد اعجاز نے باپ کی صورت دیکھی تھی۔

وہ پُر جلال چہرہ جس کی ہیبت سے سارا گھر اور خاص کر اس کے متعلقین بید لرزاں کی طرح کانپا کرتے تھے، بے کسی اور بے بسی کی تصویر بنا ہوا تھا۔ نہ وہ اپنے ہاتھوں کو جنبش دے سکتا تھا نہ پیروں کو، نہ آنکھ کھول سکتا تھا۔ نہ بات کر سکتا تھا۔ نہ کسی کو پہچان سکتا تھا۔ نہ کسی طرح کی ہدایت دے سکتا تھا۔ مردے سے بھی بدتر!

یہ منظر دیکھ کر اعجاز کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

جب وہ یہاں سے گیا تھا تو باپ کے خلاف نفرت کا طوفان لے کر گیا تھا۔ اب آیا تھا تو عقیدت اور محبت کی پونجی لے کر آیا تھا۔ جب وہ گیا تھا تو باپ زندہ تھا، اب آیا تھا تو وہ لب گور اور جاں بلب تھا۔

اس کا جی چاہا، اپنے باپ سے معافی مانگے، اس کے قدموں پر سر ڈال دے، اس کی پیشانی کو بوسہ دے، اس کے ہاتھوں کو آنکھوں سے لگائے، اس سے عہد کرے کہ اب زندگی بھر وہ صرف اس کی خدمت کرے گا۔

اس سے کہے کہ جس نفرت کا پشتارہ میں اپنے ساتھ لے کر گیا تھا اسے ایک گہرے اور اندھے کنوئیں میں دفن کر آیا ہوں

اب میرے پاس نفرت نہیں ہے صرف محبت ہے

لیکن کس سے کہتا، جس سے کہنے کی حسرت اور آرزو تھی وہ تو بستر مرگ پر دراز تھا۔

کاش وہ اسے دیکھ لیتا چند ہی لمحے سہی۔ اس سے باتیں کر لیتا، اپنی کہہ لیتا اس کی سن لیتا، لیکن قضا و قدر کا فیصلہ اٹل ہوتا ہے، وہ آیا لیکن اس وقت جب ہر موقع ہاتھ سے نکل چکا تھا، اب کون تھا جو اس کی معذرت قبول کرتا؟ کون تھا جو اس کی غلطی کو معاف کرتا، کون تھا جو اس کی ندامت سے متاثر ہوتا؟

کوئی نہیں ——— وہ جو یہ سب کچھ کر سکتا تھا، اب اس عالم فانی سے عالم بالا کی طرف کوچ کر رہا تھا۔

دفعتہً وہ باپ کے قدموں پر گرا اور اس کے تلووں سے آنکھیں ملنے لگا۔ وہ بے تحاشا رو رہا تھا لیکن پھوٹ پھوٹ کر نہیں، آنکھوں سے جوئے اشک رواں تھی لیکن لب خاموش تھے!

زلیخا کی حالت اعجاز سے بھی زیادہ ابتر تھی۔

اس پر سکتہ کی سی کیفیت طاری تھی۔ نہ وہ رو سکتی تھی نہ اپنی جگہ سے جنبش کر سکتی تھی مگر باپ کی طرف دیکھے جا رہی تھی اور بالکل یہی کیفیت نادرہ کی تھی۔ سینی اس کے سر پر رکھی تھی اور وہ دیوانوں کی طرح کبھی ادھر دیکھنے لگتی، کبھی ادھر؟

تھوڑے تھوڑے وقفہ سے ڈاکٹر آتے، نبض دیکھتے، انجیکشن لگاتے

اور مایوسی کے عالم میں سر کو جھٹکا دیتے ہوئے چلے جاتے

اس طرح دو گھنٹے گزر گئے

جس طرح امتیاز موت و زیست کی کشمکش میں گرفتار تھا۔ اسی طرح اعجاز، زلیخا اور نادرہ پر بھی نزع کا عالم طاری تھا!

آخر اعجاز نے اپنے حواس بجا کئے، اس نے اپنے اندر استقامت اور حوصلہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس نے زلیخا سے کہا:۔

"تقدیر کا فیصلہ اٹل ہے۔ ڈاکٹر بھی کہہ گیا ہے، جو کچھ ہونے والا ہے وہ اب ہوا ہی چاہتا ہے۔ تم اور نادرہ یہیں رہو۔ میں جاتا ہوں۔ چچا اور چچی اور خالہ اماں کو اطلاع دے دوں۔ یہ ہمارا فرض ہے۔ ان سب کو اس موقع پر یہاں موجود رہنا چاہئے

اور پھر جواب کا انتظار کئے بغیر چلا گیا:

اس کے سارے بدن پر رعشہ کی کیفیت طاری تھی۔ وہ دوڑتا، ہانپتا، کانپتا گھر پہنچا

کلثوم اور نسیم صحن میں بیٹھی تھیں۔ کلثوم کچھ باتیں کر رہی تھی۔ نسیم جواب بھی دے رہی تھی اور کنگھی بھی کرتی جا رہی تھی۔ ان دونوں نے سینما جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ صرف اعجاز کا انتظار تھا، وہ آئے اور چلیں۔

اعجاز کو دیکھتے ہی نسیم نے کنگھی ایک طرف رکھ کر ہاتھوں سے بال درست کرنا شروع کر دیئے اور ماں سے مخاطب ہو کر کہا:۔

لوگوں کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ یوں دندناتے ہوئے گھر میں نہ گھس آنا چاہئیے - نہ جانے کوئی کیسے بیٹھا ہے اور ویسے بڑے باتمیز اور باادب ہیں -

کلثوم نے بیٹی سے مخاطب ہو کر کہا :-

"ہاں بیٹی، یہ اندھیر تو اس وقت تک ہوتا رہے گا جب تک دیوار نہیں کھنچ جاتی ——————

چڑتے ہوئے نسیم نے کہا "وہ تو نہ جانے کب کھنچے گی ؟"

دلاسا دیتے ہوئے ماں نے بیٹی کو جواب دیا

بس بیٹے اب چند ہی دن میں یہ کام بھی ہو جائے گا - تیرے باپ کہہ رہے تھے، اس جمعہ کو دیوار کا کام شروع ہو جائے گا -

اعجاز نے یہ باتیں سنیں، اس کے سینہ پر ایک گھونسہ سا لگا غصہ بھی آیا - اگر وہی اعجاز ہوتا جو یہاں سے جاتے وقت تھا تو شاید جواب میں کوئی سخت بات کہہ دیتا لیکن اب وہ بدل چکا تھا - اب وہ بالکل تبدیل ہو کر آیا تھا - وہ اعجاز مر چکا تھا جو یہاں سے گیا تھا، وہ اعجاز جو یہ تلخ اور ترش باتیں سن رہا تھا دوسرا اعجاز تھا —————— شاید بالکل نیا -

اس نے ان باتوں کا کوئی اثر نہیں لیا، بڑی سنجیدگی کے ساتھ "چچی میں یہ کہنے آیا ہوں - کہ کئی گھنٹے سے اباجی بیہوش پڑے ہیں، ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے اب گھڑی اور پل کا معاملہ رہ گیا ہے" وہ

میرے باپ ہیں، لیکن آپ کے، نسیم کے اور چچا جان کے بھی کچھ ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو میرے ساتھ چل سکتی ہیں، کسی کو بھیج کر چچا کو بھی اطلاع کر دیجئے

کلثوم سے پہلے نسیم نے جواب دیا

"عورتیں ہسپتال جاکر کیا کریں گی۔ وہاں تو مردوں ہی کا کام ہے۔ اباجی کو فون کر لیا ہوتا۔ یا وہ آئیں گے تو ہم بھیج دیں گے انہیں؟

اعجاز کو جواب مل گیا۔ پھر اس نے کچھ نہیں کہا۔ خاموشی سے رابعہ کے کمرے میں پہنچا اور انہیں اپنے ساتھ لے کر ہسپتال روانہ ہو گیا۔

---

## (۴)

اعجاز رابعہ کو لے کر ہسپتال روانہ ہُوا۔

دونوں خاموش تھے، اور دونوں کے دل میں ایک ہلچل سی برپا تھی ——— ہلچل نہیں، طوفان!

نہ جانے ہسپتال پہنچ کر کیا سننے میں آئے گا۔ نہ جانے زندگی بھر موت غالب آ چکی ہو گی۔ یا اب تک زندگی موت سے لڑے جا رہی ہو گی؟

اعجاز کو سب سے زیادہ صدمہ اس کا تھا کہ وہ ایک دن پہلے کیوں نہ آ گیا؟ کتنے دنوں سے آنے کا پروگرام بنا رہا تھا، لیکن وہ جو ایک جھجک سی پاؤں پکڑ لیتی تھی، بندھا ہُوا بستر کھول دینے پر مجبور کر دیتی تھی۔ لیکن جب یہ جھجک دور ہوئی اور وہ واپس آیا تو

وہ اپنے باپ سے ملاقات نہ کر سکا - اس سے باتیں نہ کر
سکا - اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ سن سکا - اس نے اپنے باپ
نیم جاں پایا اور اب اس کی موت کی خبر سننے جا رہا تھا !
لیکن موت کی خبر سننے کیوں ؟
کتنے ایسے مریض ہیں جو موت کے منہ سے بچ کر نکل آتے ہیں -
کتنے ایسے مایوس العلاج بیمار ہیں جو بالکل تندرست اور چنگے ہو
جاتے ہیں ؟
کیا یہ بات امتیاز کے ساتھ نہیں ہو سکتی - وہ موت کے منہ سے
بچ کر نہیں آ سکتا ؟
اے کاش ——

وہ ہسپتال کی پہلی منزل پر پہنچا - ایک ایک سیڑھی کنچن چنگا
اور ایورسٹ کی چڑھائی معلوم ہو رہی تھی - پھر وہ اسپیشل وارڈ کے
اس کمرے کی طرف بڑھا جو اس کے باپ کا مسکن تھا ؟
چند قدم کا فاصلہ تھا لیکن یہ ذرا سی مسافت ہفت خواں طے
کرنے کے برابر ہو گئی تھی -
وہ اس کمرے میں پہنچا -
امتیاز ایک سفید چادر میں لپٹا پڑا تھا - زلیخا نیم بیہوش تھی،
اور نادرہ اس کے حلق میں پانی ٹپکا رہی تھی - ایک نرس جس نے ساری
رات بڑی مرض شناسی اور مستعدی کے ساتھ اپنی ڈیوٹی دی

خاموش اور مہر بہ لب مریض کی چارپائی کے پاس کھڑی تھی ۔

رابعہ تو مچھلی کی طرح تڑپتی ہوئی نادرہ کے پاس پہنچی اور زلیخ[a]
کا سر اپنی گود میں رکھ کر نادرہ سے پوچھا

"میری بچی کو کیا ہو گیا ؟" ۔

لیکن اعجاز نرس کے پاس گیا ——— مگر سب کچھ سمجھ چکنے
کے بعد سوال کرنے کی جرأت نہیں ہوئی ۔

نرس کو بہر حال اپنا فرض ادا کرنا تھا ۔ اس نے کہا :۔

افسوس مریض چل بسا !

اس سے زیادہ سننے کی ضرورت بھی کیا تھی ۔ اس کا جی چاہ رہا
تھا کہ ماتم کرے ۔ سینہ کوبی کرنے لگے ۔ گریبان پھاڑ ڈالے اور خوب
چیخ چیخ کر روئے لیکن وہ مرد تھا ، اسے دوسرے گرتے ہوؤں کو سہارا دینا
تھا ۔ اس چھوٹے سے خاندان کا وہی سردھرا تھا ۔ اسے عزم و استقلال
کے ساتھ قدرت کے اس وار کو سہنا چاہیئے تھا ۔ رونے کے لئے ساری
زندگی پڑی ہے ، لیکن یہ وقت کام کا ہے !

وہ رابعہ کے پاس پہنچا اس نے کہا :۔

"خالہ اماں آپ کے بھائی صاحب اس دنیا سے رخصت ہو گئے ،
آپ کا بھانجا یتیم ہو گیا ۔ آپ کی بھانجی کے سر پر اب کوئی ہاتھ رکھنے
والا نہیں ہے ۔ یہ بہت بڑا غم ہے ۔ بہت بڑا صدمہ ہے ۔ لیکن اسے
برداشت ہی کرنا پڑے گا ؟ ——— زلیخا کو سنبھالئے میں ضروری

—— انتظامات کے لئے جاتا ہوں!

تھوڑی دیر میں اس نے ایمبولینس کا بندوبست کر لیا۔ اسی ایمبولینس میں زلیخا نادرہ رالعہ اور اعجاز امتیاز کی لاش لے کر گھر پہنچے۔ معلوم نہیں اعزاز کو اطلاع دی گئی تھی یا نہیں؟ بہرحال وہ گھر میں موجود نہیں تھا۔ کلثوم اور نسیم بدستور صحن میں بیٹھی تبادلۂ خیال میں مصروف تھیں۔ ان دونوں میں کیا باتیں ہو رہی تھیں۔ یہ تو اعجاز نہیں سن سکا لیکن "دیوار" اور صفدر کے الفاظ ضرور اس کے پردۂ گوش سے ٹکرائے۔

باپ کی لاش لے کر وہ گھر آیا۔ جس کمرہ میں امتیاز باہزاراں جاہ و تجمل نشست رکھا کرتا تھا۔ جہاں ہر وقت بزم احباب برپا رہتی تھی جہاں قہقہوں کا شور شب و روز کا پابند نہیں تھا آج وہاں اس کی لاش ایک سفید چادر میں لپٹی پڑی تھی۔

اعجاز نے اس مرتبہ کلثوم یا نسیم سے کچھ نہیں کہا۔ باپ کی لاش لانے کے بعد وہ تجہیز و تکفین کا انتظام کرنے چلا گیا۔ غسل دینا تھا۔ کفن لانا تھا۔ سلوانا تھا۔ قبر کا بندوبست کرنا تھا اور یہ سارے کام جلد از جلد انجام دینے تھے

اعجاز کے جانے کے بعد کلثوم اور نسیم اٹھیں اور امتیاز کے کمرے میں پہنچیں۔

زلیخا نیم جان، رالعہ نیم بیہوش!

کلثوم نے رالعہ کو نسیم نے زلیخا کو گلے لگا کر بہ آواز بلند

رونا شروع کیا۔ اب تک یہ ضبط سے کام لے رہی تھیں۔ اب ان کا بندِ ضبط ٹوٹ گیا اور یہ بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ تنہا نادرہ ایسی تھی جو رونے کی مصروفیت میں بھی اور رات کا وقت ہوتے بھی یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکی کہ کلثوم اور نسیم گو پیٹ پیٹ کر رو رہی تھیں لیکن دونوں کی آنکھوں میں آنسو کا ایک قطرہ بھی نہ تھا۔

## (۵)

کئی روز تک گھر پر غم کا سکوت چھایا رہا۔ پھر حالات معمول پر
گئے۔ امتیازہ کی وفات کا سب سے زیادہ صدمہ اعجاز کو تھا۔ رہ رہ
ردل میں کھٹک ہوتی تھی کہ اباجی مجھ سے خفا ہو کر اس دنیا
ے رخصت ہوئے ہیں۔ اب میرا انجام کیا ہوگا۔ خدائی بارگاہ سے
یری یہ خطا معاف ہو گی یا نہیں؟ اب وہ خدا سے محبت کرنے لگا تھا
ب وہ بالکل نیا انسان بن کر آیا تھا جس کے دل میں خدا کا خوف
ھا۔ بندوں کی محبت تھی۔ اپنوں کی چاہت تھی اور دشمنوں تک کے
ئے نفرت نہ تھی۔ یہ سبق اس نے اپنے اس محسن اور مربی سے سیکھا
تا جس نے اپنے گھر میں اسے پناہ دے کر کچھ سے کچھ بنا دیا تھا۔ یہی
وجہ تھی کہ رہ رہ کر دل میں ہوک اٹھتی تھی اور سمجھ میں نہیں آتا تھا اپنے

مرے ہوئے باپ کو کس طرح خوش کرے ؟

ایک روز وہ قبرستان گیا۔ مریم کی قبر کے ساتھ ہی امتیاز کی بھی قبر تھی۔ زندگی میں یہ میاں بیوی ایک دوسرے سے دور دور رہے، لیکن موت نے انہیں ایسی رفاقت عطا کردی تھی۔ جیسے یہ دونوں اب کبھی جدا نہیں ہوں گے۔ یہاں یعنی مریم کے پہلو میں دفن ہونے کے لئے امتیاز نے وصیت کی تھی اور اس وصیت کی تعمیل اعجاز کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ وہ یہاں صرف فاتحہ پڑھنے آیا تھا اور یہ اس کا روز کا معمول تھا، لیکن آج فاتحہ پڑھ کر رخصت ہو جانے پر طبیعت آمادہ نہیں ہوئی۔ فاتحہ پڑھ کر وہیں بیٹھ گیا اور جتنی چھوٹی بڑی سورتیں زبانی یاد تھیں، سب پڑھ ڈالیں۔ اس کے بعد صدق دل سے ماں باپ کے لئے دعائے مغفرت کی اور بڑی دیر تک باپ کی قبر پہ بیٹھا روتا رہا۔ یہ ندامت اور معذرت کے آنسو تھے۔

دل کا بوجھ جب ذرا ہلکا ہوا تو گھر واپس پہنچا، گھر کے جس مردانہ حصہ میں امتیاز کی نشست رہا کرتی تھی، اب احراز کی بیٹھک کا کام دیتا تھا۔ اعجاز جب واپس ہوا تو احراز اس آرام کرسی پہ نیم دراز جو نہ جانے کتنا عرصہ امتیاز کا گہوارۂ راحت رہ چکی تھی حقہ کے کش لگا رہا تھا۔ اعجاز کی آہٹ پا کر اس نے آنکھیں کھولیں اور سنجیدگی کے ساتھ گویا ہوا۔

" اگر فرصت ہو تو بیٹھو، کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔

اعجاز خاموشی کے ساتھ سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ معمولی اور رسمی تعزیت کے سوا اب تک احراز اور اعجاز میں کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ اس التفات پر اعجاز کو حیرت تو ضرور ہوئی، لیکن وہ صورتِ سوال بن کر احراز کی طرف تکنے لگا کہ دیکھئے کیا ارشاد ہوتا ہے اور پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔

احراز نے حقہ کا ایک زوردار کش لگاتے ہوئے کہا:

"نسیم کی شادی بہت جلد ہونے والی ہے۔ صفدر کے والدین جلدی کر رہے ہیں اور خود صفدر کا بھی شدید اصرار ہے کہ یہ رسم جلد از جلد انجام پا جانی چاہیئے ———"

احراز یہ کہہ رہا تھا اور اعجاز سوچ رہا تھا کیا دنیا اسی کا نام ہے جس گھر سے کل تک نوحۂ و ماتم کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں، اب وہاں جشن طرب برپا ہو گا؟ شہنائیوں کی آواز گونجے گی؟ رقص و سرود اور نغمہ و موسیقی کی محفل ترتیب پائے گی؟ اور یہ سب کچھ وہ شخص کرے گا جس کے سگے بڑے بھائی کو مرے ہوئے ابھی کچھ ایسی زیادہ مدت بھی نہیں گزری۔

لیکن یہ باتیں دل ہی دل میں رہیں، زبان تک نہ آسکیں، نہ اسے اعتراض کرنے کا حق تھا۔ نہ وہ کسی قسم کا اعتراض کرنا چاہتا تھا۔ اس نے کہا:-

بجا ارشاد ہوا، اصرار ٹھیک بھی ہے، منگنی کو اتنے دن ہو چکے

اب یہ رسم انجام پا ہی جانی چاہیئے

"یہی خیال میرا بھی ہے۔"

پھر کچھ دیر خاموش رہ کر اس نے کہا:۔

اس تقریب میں بہت سے لوگ شریک ہوں گے، دوست، احباب عزیز، رشتے دار، دور اور نزدیک کے ملنے والے

"بے شک ہوں گے"!

"یہ گھر ویسے بھی ناکافی ہے۔ اب تو اور زیادہ ناکافی ثابت ہوگا"؛

اعجاز مدعا سمجھ گیا وہ کہنے لگا:۔

"چند روز کے لئے ہم لوگ کہیں اور چلے جائیں اور یہ مکان مہمانوں کے لئے خالی کر دیا جائے"۔

"میری دو تجویزیں ہیں"!

"آپ کی جو تجویز بھی ہوگی، مجھے منظور ہے"۔

"ایک تجویز تو کلثوم کی ہے یعنی دیوار کھینچ دی جائے، اس طرح گھر کے دو حصے ہو جائیں گے"!

"یہ تجویز سنی تو میں نے بھی ہے لیکن اگر بے ادبی نہ ہو تو عرض کروں، دیوار کھینچنے کی کیا ضرورت ہے"؟

اعزاز نے جیسے یہ بات سنی ہی نہیں کہنے لگا:

"اور دوسری تجویز جو پہلی تجویز سے کہیں زیادہ بہتر ہے یہ ہے کہ

یا تم میرا حصہ خرید لو یا میں تمہارا حصہ خریدے لیتا ہوں۔ قیمت کیا ہو؟ اس کا فیصلہ بھی تم پر ہی چھوڑتا ہوں۔ البتہ یہ طے ہے کہ جو بھی خریدے گا وہ قیمت نقد ادا کرے گا"

"لیکن چچا جان، ایک تیسری تجویز میری ہے!"

تمہاری کیا کوئی تجویز ہے؟" ——— "کہو!"

"میری تجویز یہ ہے کہ ابا جان کے چالیسویں کے بعد زلیخا خالہ جان کے ساتھ سسرال چلی جائے گی اور مستقل طور پر وہیں رہے گی۔ رہا میں، سو مجھے اس مکان کی ضرورت نہیں، کیونکہ میرا ارادہ اس شہر میں رہنے کا نہیں ہے۔ جہاں ملازمت یا روزگار کا بندوبست ہوا وہیں ڈیرہ ڈال دوں گا۔ کبھی چھٹے چھ ماہ آیا بھی تو چند گھنٹوں کے لئے آؤں گا، اور میری آمد بھی صرف قبرستان تک محدود ہوگی، فاتحہ پڑھا اور چلا گیا، لہٰذا کیوں نہ باقاعدہ رجسٹری کے ذریعہ اپنے حصہ کا مکان میں نسیم کے نام منتقل کر دوں، آخر وہ میری بہن ہے"

احراز کا خیال تھا اعجاز کوئی ایسی جوابی تجویز پیش کرے گا جو اس سودے کو ناممکن اور اس تجویز کو ناکارہ بنا دے گی، لیکن اس نے ایسی تجویز پیش کر دی جس نے اسے غرق حیرت کر دیا، کچھ دیر تک وہ ٹکٹکی باندھے اعجاز کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کہا

"یہ تو بڑی عجیب تجویز ہے!"

اور واقعی یہ بڑی عجیب تجویز تھی، اعجاز کے ساتھ اس کا،

کلثوم کا اور نسیم کا جو برتاؤ رہا تھا۔ اس کے بعد بھی یہ انوکھی تجویز یا تو کسی ولی اللہ کی طرف سے پیش ہو سکتی تھی یا شیطان کی طرف سے۔ اعجاز کی پچھلی زندگی اس کے سامنے تھی، وہ اسے ولی اللہ ماننے کو تیار نہیں تھا۔ لہٰذا یہ رائے قائم کرنے پر اسے مجبور ہونا پڑا کہ یہ شیطانی تجویز تھی، لیکن وہ محسوس کر رہا تھا کہ جوتے اس طرح کپڑے میں لپیٹ کر لگائے گئے ہیں کہ جوابی حملہ آسان نہیں ہے اور وہ اسی حیص بیص میں بیٹھا تھا کہ اعجاز نے کہا:۔

"چچا جان، میری تجویز انوکھی اور عجیب تو نہیں ہے؟ آپ اگر باپ کی حیثیت سے نسیم کو بہت کچھ دینے کا حق رکھتے ہیں، کیا میں ایک بھائی کی حیثیت سے اتنا معمولی سا ایثار بھی نہیں کر سکتا؟

احراز نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ میدان خالی دیکھ کر کلثوم آ ٹپکی، اسے دیکھ کر اعجاز کھڑا ہو گیا، لیکن وہ نہ اس کی طرف ملتفت ہوئی، نہ اس سے مخاطب ہوئی، اس نے احراز سے کہا:۔

لڑکی کی شادی میں اب دن ہی کتنے رہ گئے ہیں، لیکن تم کسی طرح مکان کا معاملہ ہی نہیں طے کر چکتے، یا ادھر یا ادھر ہو جانا چاہیئے تاکہ معاملہ یکسو تو ہو۔ یا ہم کسی نئے مکان کا انتظام کر لیں۔ یا یہ لوگ، کہیں اپنا بندوبست کر لیں۔ گو مگو کی پالیسی مجھے ذرا بھی پسند نہیں آتی۔"

احراز نے جواب دیا، یہی بات تو طے کر رہا تھا اس وقت، لیکن تم قلم اور تلوار لے کر آن موجود ہوئیں۔

اس طنز لطیف سے وہ ذرا بھی محظوظ نہیں ہوئی، کہنے لگی:۔

تو پھر کیا طے ہوا ؟ یہ بھی تو معلوم ہو

قبل اس کے کہ احراز کچھ بتائے ، خود اعجاز ہی نے وہ تجویز دہرا دی جو ابھی اس نے پیش کی تھی۔ کلثوم نے کہا :۔

" نہیں بھیّا ، اس کی ضرورت نہیں۔ خدا کا دیا نسیم کے پاس بہت کچھ ہے ۔ وہ تمہارے ذرا سے حصہ کی محتاج نہیں ہے ۔ اس احسان سے بخشو سیدھی سادھی بات یہ ہے یا تم اپنا حصہ بیچ دو ، یا ہمارا حصہ خرید لو ، اللہ اللہ خیر صلّا !

اعجاز نے اندر جانے کے لئے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا :۔

" پہلے مجھے مکان خالی کر لینے دیجئے ۔ پھر یہ معاملہ بھی طے ہو جائے گا !

---

(۶۱)

انسان اپنے حال کو سنوارنے اور مستقبل کو بنانے کے لئے کیا کیا جتن نہیں کرتا؟ ——— بے ایمانی، فریب کاری۔ دغا، جھوٹ، مکر، ریا ——— نہ جانے کیا کیا، لیکن قدرت کے ایک جھٹکے میں اس کی ساری اسکیمیں غارت ہو کر رہ جاتی ہیں۔ وہ حیرت اور بے بسی کے ساتھ اپنی تعمیر کو منہدم ہوتے دیکھتا رہتا ہے لیکن کچھ نہیں کر سکتا۔

نسیم کی شادی کی تیاریاں زور شور سے جاری تھیں۔ اعجاز نے ارشاد کو تار دے دیا تھا۔ کہ آ کے اور زلیخا اور رابعہ کو اپنے ساتھ لے جائے۔ خود اپنے لئے اس نے طے کر لیا تھا کہ دوسرے شہر میں قسمت آزمائی کے لئے جائے گا اور ملازمت یا روزگار کی کوئی صورت پیدا کرے گا

اور بغیر ایک پائی لئے اُس مکان سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دستبردار ہو جائے گا۔ اس کے اس فیصلہ سے نہ رابعہ خوش تھی نہ زلیخا لیکن اتنے دنوں کی گم شدگی کے بعد واپس آیا تھا۔ دونوں ڈرتی بھی تھیں کہیں پھر ہاتھ سے نہ نکل جائے، لہٰذا چاروناچار اس کے فیصلہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا پڑا، ارشاد نے تار ہی سے جواب دیا تھا کہ حالات کچھ ایسے ہیں کہ پندرہ دن سے پہلے وہ کسی طرح بھی نہیں آسکتا، اور پندرہ روز تک انتظار کر لینا۔ اعجاز کے لئے کچھ ایسا گراں نہ تھا، کیونکہ نسیم کی شادی میں ابھی کم و بیش ۲۰ - ۲۵ دن باقی تھے۔

لیکن یہ بات نہ احراز کو معلوم تھی نہ اعجاز کو، نہ کلثوم کو، نہ نسیم کو کہ پندرہ دن سے بھی کم مدت میں ایک ایسا ہولناک انقلاب آ رہا ہے جو قیامت بن کر نمودار ہوگا "یعنی" ———— نہ نادر بجا ماند نے نادری! والا معاملہ صادق آئے گا۔

اعجاز اور کلثوم میں جو گفتگو احراز کے سامنے ہوئی تھی اس کے ٹھیک تین دن کے بعد رشوت اور غبن کے الزام میں احراز کی گرفتاری عمل میں آگئی اور وہ حوالات میں پہنچ گیا۔ ضمانت کی بڑی کوشش کی گئی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ الزام اتنا سنگین تھا کہ ضمانت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا اور ثبوت اتنے واضح تھے کہ بھاری جرمانے اور لمبی سزائے قید سے بچنے کی کوئی تدبیر اور صورت نظر نہیں آتی تھی۔

یہ تو گھر والے اور باہر والے سب جانتے تھے کہ احراز رشوت لیتا

ہے اور گچھرے اڑاتا ہے لیکن پولیس کے لوگ اس سلسلہ میں بدنام ہی
ہیں ۔ یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جس پر لوگ چونکتے یا انگشت نمائی کرتے
لیکن یہ اس وقت تک تھا جب تک گرفتاری عمل میں نہیں آئی
تھی ۔ گرفتار ہو جانے کے بعد یہ جرم جس کی طرف کبھی لوگوں نے
توجہ بھی نہیں کی تھی ، نہ جسے کوئی اہمیت دی تھی ۔ نہایت سنگین ،
ناقابل معافی اور نفرت انگیز جرم بن گیا ۔ اب ہر شخص اس کے سایہ سے
پناہ مانگتا تھا ۔ دوست احباب جو پسینہ پر خون بہانے کو تیار رہتے
تھے ۔ بات پوچھنے کے روادار بھی نہ تھے ۔ مزید ستم یہ ہوا کہ گھر
کی تلاشی بھی لی گئی اور بہت سی قیمتی چیزیں جو نسیم کی شادی کے لئے
مخصوص تھیں رشوت کا مال ثابت ہوئیں اور ضبط کر لی گئیں ۔ گرفتاری
سے چند منٹ پہلے تک جو شخص سارے شہر میں اعزاز و اکرام کی
نظر سے دیکھا جاتا تھا ، اب مقہور و مردود قرار دے دیا گیا ۔ جاننے
والے اور نہ جاننے والے سب اس کے نام پر لاحول پڑھتے ۔
کوئی بھی امداد و اعانت کے لئے تیار نہیں تھا ۔ ساتھ دینا تو بڑی چیز ہے
اعزاز نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ گرفتار ہو سکتا ہے ۔ اس کے گھر
کی تلاشی لی جا سکتی ہے اور تلاشی کے سلسلہ میں اس کی بیوی اور لڑکی کی بے
حرمتی کی جا سکتی ہے ۔ اس کی شہرت عزت ، وقعت ہر چیز آن کی آن
میں ختم ہو سکتی ہے لیکن جس چیز کو وہ سوچنے کا بھی روادار نہ تھا وہ
ایک ٹھوس حقیقت کی صورت میں اس کے سامنے تھی ۔

کل تک وہ خود دوسروں کو حوالات میں بھیجا کرتا تھا، اقرارِ جرم کے لئے دوسروں پر تشدد کیا کرتا تھا - آج وہ خود حوالاتی تھا۔ آج خود اس سے اقرارِ جرم کرایا جا رہا تھا - جن حوالاتیوں اور قیدیوں کو وہ ہمیشہ نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھا کرتا تھا آج انہیں کے درمیان وہ زندگی کے لمحات بسر کر رہا تھا اور یہ حوالاتی اور قیدی اس کا مذاق اڑا رہے تھے، اسے چھیڑ رہے تھے، اسے ستا رہے تھے، اس کے دسترخوان پر ہمیشہ کئی کئی قسم کے لذیذ اور مرغن کھانے ہوا کرتے تھے، لیکن اب وہ دسترخوان قصۂ ماضی بن چکا تھا۔ اب تو اسے وہی کھانا مل رہا تھا جو عام حوالاتی کو دیا جاتا تھا۔ وہ آرام دہ بستر گرمی میں خس کی ٹٹیوں کے اندر اور جاڑوں میں دہکتی ہوئی انگیٹھی کے سامنے آرام کیا کرتا تھا مگر اب شدید گرمی کے اس موسم میں لو کے تھپیڑے کھا رہا تھا - خس کی ٹٹی کا کیا ذکر، پنکھا تک میسر نہ تھا۔

## (۷)

اعجاز کے لئے یہ بڑا نازک اور کٹھن وقت تھا۔

جس طرح اسے باپ سے کبھی محبت نہیں ملی تھی ۔ چچا نے بھی شروع کے کچھ عرصہ کے علاوہ اسے کبھی مستحقِ شفقت و محبت نہ سمجھا تھا ۔ بلکہ گھر چھوڑنے کا ایک سبب چچا کا طرزِ عمل ہی تھا اور جب طویل غیر حاضری کے بعد وہ واپس آیا تو چچا نے وہ سلوک کیا جو دشمن بھی نہیں کر سکتا تھا اس کے باپ کی تیمار داری میں کوئی حصہ نہیں لیا ، اس کے انتقال پر شرکتِ غم کا مظاہرہ نہیں کیا اور انتقال کے چند ہی روز بعد نسیم کی شادی کی تاریخ مقرر کر دی اور اس سے مطالبہ شروع کر دیا کہ مکان خالی کر دے ۔ یہ ساری باتیں ایسی نہ تھیں جنہیں وہ معاف کر سکتا یا بھول سکتا ، لیکن اتنے دنوں کی غیر حاضری میں ، پردیس کی زندگی

ہیں اور ایک انسان کامل کے سایۂ عاطفت میں اس نے جو سبق سیکھا تھا وہ یہی تھا کہ دشمنی دشمن سے بھی نہیں کرنی چاہیئے۔ سب کے کام آنا چاہیئے۔ اپنا "حق" کیا ہے، اسے بھول جانا چاہیئے، اپنا فرض کیا ہے صرف اس کو یاد رکھنا چاہیئے۔

چنانچہ اعجاز کی گرفتاری کے بعد اس نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ جس طرح بھی ضمانت پر اسے رہا کرائے لیکن اس سلسلہ میں اسے کافی روپیہ خرچ کرنا پڑا اور یہ سارا روپیہ اس نے اپنے پاس سے خرچ کیا۔ وکیل کی فیس بھی اور دوسرے مصارف بھی۔

دو مرتبہ ضمانت کی درخواست مسترد ہوئی لیکن تیسری مرتبہ اس نے ہائی کورٹ سے منظور ہی کرا لی، عدالت عالیہ تک جانے میں اسے کافی زیربار ہونا پڑا لیکن اس نے کوئی پرواہ نہ کی اور بالآخر کامیاب ہوا۔

اعجاز حوالات سے جب باہر نکلا تو یہ معلوم ہوتا تھا مہینوں سے بیمار چلا آرہا ہے۔ صرف ایک ہفتہ کے اندر اس کی کایا پلٹ گئی تھی۔ جب وہ حوالات گیا تھا تو توانا، تندرست اور سرخ و سفید تھا۔ واپس آیا تو مرجھایا ہوا جیسے کئی سال کا بیمار۔ چہرے سے بڑھاپا عیاں۔ آنکھیں حلقوں میں دھنسی ہوئی، حوالات کے دروازے پر اس کا استقبال کرنے والا، اعجاز کے سوا کوئی نہ تھا۔

اعجاز اسے لے کر گھر آیا۔ راستے بھر لوگوں کی نظریں اس پر پڑتی رہیں اور وہ سر جھکائے ایک مجرم کی طرح راستہ طے کرتا رہا۔ آخر گھر پہنچا، یہاں کلثوم نسیم اور زلیخا اس کے استقبال کو موجود تھیں لیکن تینوں کے چہرے اترے، تینوں کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، کن الفاظ میں اور کیسے اس کی پذیرائی کرے۔

خود اعجاز بھی خاموش اور گم سم تھا۔ برآمدے میں ایک آرام کرسی پر وہ لیٹ گیا۔ نسیم جلدی سے شربت بنا لائی، زلیخا نے حقہ بھر کر پیش کیا۔ کلثوم خاموشی سے اس کے پاس بیٹھ گئی۔ زبان خاموش تھی لیکن دل میں طوفان اٹھ رہا تھا اور اس طوفان کی غمازی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں بھی کر رہی تھیں

اعجاز نے شربت کے دو گھونٹ مشکل سے پیئے پھر گلاس الگ رکھ دیا گویا یہ کوئی کڑوی سی دوا تھی جس کے پینے پر طبیعت مائل نہ تھی۔ حقہ کے دو چار کش لگائے اور اسے بھی الگ کر دیا، اب وہ حوالات سے نکل کر گھر آ گیا تھا، یہاں وہ آزاد تھا۔ نہ وہ قیدی تھے جو گالیاں دیتے اور چھیڑتے رہتے تھے۔ نہ وہ ماحول تھا جو ایک شریف انسان کو خودکشی پر آمادہ کر دیتا ہے، نہ وہ پھیکا اور سیٹھا کھانا تھا جس کے تصور سے ابکائی آتی ہے۔

پھر بھی دل بجھا بجھا سا تھا اور شرم و ندامت کی یہ کیفیت تھی کر

کلثوم تک سے جو اس کی ہمراز تھی آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا۔ اس نے شربت کا گلاس تپائی پہ رکھ کر اور حقہ کو ایک طرف سرکا کر پاؤں پھیلا لئے اور آنکھیں بند کر کے لیٹ رہا

اتنے میں پوسٹ مین آیا۔ صرف ایک ہی خط تھا اور وہ احراز کے نام تھا۔

کلثوم نے خط اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

"دیکھو یہ کس کا خط ہے؟"

لفافہ پر پتہ دیکھنے کے لئے نسیم جھکی اور کچھ مسرت اور کچھ شرم سے اس کی لویں سرخ ہو گئیں ——— یہ صفدر کا خط تھا

احراز نے اشتیاق، بیقراری اور اضطراب کے ساتھ لفافہ چاک کیا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ صفدر نے لکھا تھا:

آپ کی گرفتاری کی خبر پڑھ کر ہم سب کو بہت صدمہ ہوا، لیکن جس جرم میں آپ گرفتار کئے گئے وہ بہت شرمناک ہے۔ ممکن ہے اس گرفتاری اور بعد میں سزایابی کے بعد بھی آپ لوگوں سے آنکھیں چار کر سکیں اور کسی طرح کی شرم وغیرت محسوس نہ کریں۔ لیکن میں اس شخص کا داماد بننے میں شرم محسوس کرتا ہوں جو ایسے شرمناک اقدام کے ماتحت گرفتار ہوا ہو۔ اگر ان حالات میں بھی آپ کا داماد بننا منظور کر لوں، تو پھر شہر میں میری کوئی عزت رہ جائے گی، نہ عزیز و اقارب میں منہ دکھا سکوں گا

احراز نے دو مرتبہ یہ خط پڑھا اور پھر اسے تہہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔ کلثوم نسیم کا رنگ رُخ دیکھ کر سمجھ گئی تھی کہ صفدر کا خط ہے، اس نے سوال کیا:

"کیا لکھا ہے؟ ——— سب خیریت تو ہے؟"

احراز نے مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے اور خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

"ہاں بالکل!"

---

(۸)

اعجاز اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا - کچھ چپ چاپ ، کچھ اداس
اس سا - احراز کی ذلت اور رسوائی نے اسے بہت زیادہ مغموم
افسردہ کر رکھا تھا اور اب کہ وہ حوالات سے ضمانت پہ رہا ہو
آگیا تھا اس فکر نے پریشان کر رکھا تھا کہ بالآخر انجام کیا ہو گا؟
اسی سوچ میں بیٹھا تھا کہ زلیخا اور رابعہ آگئیں۔ رابعہ نے
ا،

"تم اتنے چپ چاپ کیوں نظر آ رہے ہو؟"
زلیخا بولی ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بھیا کو کسی خاص فکر نے
یشان کر رکھا ہے؟
وہ ایک افسردہ سے تبسم کے ساتھ گویا ہوا -

"ہاں زلیخا! بات کچھ ایسی ہی ہے"؟

اس نے پوچھا "لیکن معلوم بھی تو ہو، کیا بات ہے"؟

وہ کہنے لگا، "سوچتا ہوں اگر خدانخواستہ چچا کو سزا ہو گئی تو کیا ہو گا"؟

رابعہ نے حیرت سے اعجاز کو دیکھا اور بولی:-

"لیکن بیٹے، یہ تو کیئے کا پھل ہے، جو جیسا کرے گا ویسا بھرے گا"!

زلیخا نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا:-

"واقعی بات تو فکر کی ہے، لیکن بھیا ہم کیا کر سکتے ہیں، اگر وہ رشوت نہ لیتے اور غبن نہ کرتے، تو آج یہ دن کیوں دیکھنا پڑتا"؟

اعجاز نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا:-"میں تو یہ سوچ کر اور زیادہ پریشان ہو جاتا ہوں کہ اگر بہ فرض محال ——— بہ فرض محال اس لیئے کہہ رہا ہوں کہ وکیل کا خیال ہے سزا ضرور ہو گی ——— وہ رہا بھی ہو گئے تو بھی نوکری گئی، آمدنی گئی، عزت گئی، آخر وہ کریں گے کیا؟ زندگی کس طرح بسر کریں گے؟

رابعہ نے ذرا چڑتے ہوئے کہا "یہ تو خود انہیں سوچنا چاہیئے تم کیوں سر کھپا رہے ہو۔ اس بے بات کی بات میں؟

وہ بولا "خالہ اماں اتنی بے درد نہ بنیئے، وہ بہر حال میرے چچا ہیں۔ میرے محترم باپ کے بھائی۔

وہ اور زیادہ چڑتی ہوئی بولیں ۔ ہاں ہیں تو سہی لیکن چچا کی سی کوئی بات تو ہے نہیں ان میں ؟ ——— کبھی انہوں نے تمہارے یا زلیخا کے سر پر ہاتھ رکھا ؟ کبھی دکھ بٹایا ؟ کبھی کسی موقع پر کام آئے ؟ بلکہ انہوں نے میرا ذکر تو خبر چھوڑو ۔ میں ان کی کون ہوتی ہوں ۔ زلیخا تک کو معاف نہیں کیا ۔ اس غریب کے ساتھ جو سلوک ان میاں بیوی نے روا رکھا ہے اسے سوچتی ہوں تو خون کھولنے لگتا ہے !"

"خالہ اماں ایسی باتیں نہ سوچا کیجئے !"

"کیا نہ سوچا کروں لڑکے ؟"

"ایسی ہی ، اس طرح کی تلخ اور ناگوار باتیں ۔"

"بھول جاؤں انہیں ؟"

"ہاں بالکل !"

"میں تو نہیں بھول سکتی مرتے دم تک !"

"لیکن یاد رکھنے سے کیا فائدہ ہوگا ؟"

"میں کہتی ہوں تجھے کیا ہو گیا ہے آج ؟"

"خالہ اماں آپ تو خفا ہوتی جا رہی ہیں خواہ مخواہ !"

"کیسے خفا نہ ہوں ، یوں معلوم ہوتا ہے بڑا ولی اللہ بن کر آیا ہے ——— نہ بابا ہم ٹھہرے دنیا دار ۔ ہم سے جو جیسا سلوک کرے گا ، ہم بھی ویسا ہی کریں گے ۔"

خالہ اماں بعض واقعات ایسے ہوتے ہیں کہ ان سے سبق

حاصل کرنا چاہیئے ، عبرت حاصل کرنی چاہیئے۔ ان پر خوش نہ ہونا چاہیئے۔ یہ واقعہ بھی اسی طرح کا ہے ۔"

"تم تو اپنا فرض ادا کر رہے ہو ہمیں چھوڑ دو ، یہ بہت ہے ——— اگر تم نہ ہوتے تو وہ حوالات سے چھوٹ کر آتے ؛ وہیں سے سیدھے جیل بھیج دیئے جاتے ۔ شرافت ہو تو زندگی بھر تمہارے اس احسان کو یاد رکھیں !"

"میں نے جو کچھ کیا ہے اپنا فرض سمجھ کر کیا ہے ، اس لئے نہیں کہ وہ مجھے اپنا محسن سمجھیں اور میرے گن گائیں !"

زلیخا بیچ میں بول پڑی لیکن بھیّا آپ کی اس خدمت اور محبت کے باوجود نہ چچی کا رویہ بدلا ہے نہ نسیم کا ، آخر تالی ایک ہاتھ سے کب تک بجتی رہے گی ؟"

"جب تک میں زندہ ہوں ! نسیم اور چچی کا رویہ ان کے ساتھ ، میرا میرے ساتھ !

"آج بھی ایسے ایسے طعنے دیئے ہیں نسیم نے کہ کلیجہ کے ٹکڑے ہو گئے اور بات کچھ بھی نہیں ۔"

"آدمی جب پریشان ہوتا ہے تو چڑچڑا ہو جاتا ہے ۔ معاف کر دو اسے اور یہ بھی تو سوچو بہت جلد اس کی شادی ہو رہی ہے ، صفدر کا آج ہی خط آیا ہے اور شادی سے پہلے پہلے ہمیں یہ گھر خالی کر دینا ہے ۔ جب ایک ساتھ رہنا ہی نہیں ہوگا تو طعنے کون دے

گا؛ اور کلیجہ کس کا پھٹے گا؟"

"وہ مسکراتی ہوئی بولی" بھیا تو نہ جانے کیا ہو گئے ہیں —

——— ابھی اعجاز نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ دھماکہ کی آواز آئی اور اس کے ساتھ دردناک چیخ۔

---

(۹)

زلیخا نے سہمگین انداز میں کہا " یہ دھماکہ کیسا؟"

رابعہ دہشت زدہ ہو کر بولی " یہ چیخ —"

اعجاز تیزی کے ساتھ اٹھا۔ اس نے بھڑے ہوئے دروازے عجلت کے ساتھ کھولے اور باہر نکل گیا: زلیخا اور رابعہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چلیں۔

وہ سیدھا مکان کے اس حصہ میں گیا جہاں احمراز رہتا تھا۔ اس کے کانوں میں کلثوم کی آواز آئی۔

" ہائے یہ کیا ہو گیا؟"

پھر نسیم کی لرزتی ہوئی آواز سنسان فضا میں گونجی۔ " ابّا جی —"

اعجاز اور زیادہ تیزی کے ساتھ بلکہ کہنا چاہیئے دوڑتا ہوا احراز کے کمرہ میں پہنچا

احراز نے کنپٹی پہ گولی مار کر خودکشی کر لی تھی۔

کلثوم پیکرِ بے جان کی طرح لاش کے پاس کھڑی تھی۔ نسیم اسکے پہلو میں کھڑی سسکیاں لے رہی تھی۔

بڑا دردناک اور ہولناک منظر تھا۔ رابعہ اور زلیخا جو ابھی احراز کے خلاف نہ جانے کیا کیا کچھ کہہ رہی تھیں اس منظر کو دیکھ کر لرز گئیں۔ زلیخا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ رابعہ کا حال یہ تھا کہ سارے بدن سے لرز رہی تھی!

اعجاز نے اس موقع پہ بھی حاضر دماغی سے کام لیا۔ اس نے فوراً فون کے ذریعہ پولیس کو حادثہ کی اطلاع دی۔ فوراً ہی انسپکٹر، سب انسپکٹر سپرنٹنڈنٹ اور بہت سے کانسٹیبل آموجود ہوئے۔

یہ سب لوگ جب سے احراز ماخوذ ہوا تھا اس سے الگ تھلگ رہنے لگے تھے لیکن اب کہ وہ مر چکا تھا۔ جرم و سزا کی حد سے آگے نکل چکا تھا۔ ان کی ہمدردی پھر عود کر آئی، بڑی ہمدردی کے ساتھ انہوں نے کلثوم اور نسیم سے تعزیت کی رسم ادا کی۔ اصولاً لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے ہسپتال بھیجنا چاہیئے تھا۔ مگر ان لوگوں نے ایسا نہیں کیا اور اعجاز کی استدعا قبول کر کے دفن کرنے کی اجازت دے دی۔ یہ بات شک و شبہ سے بالا تھی کہ احراز نے خودکشی کی تھی۔ تکیہ کے نیچے ایک مختصر سی تحریر

بھی اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی مل گئی جس میں لکھا تھا :-

"دولت کی زندگی میرے لئے ناقابل
برداشت ہے - میں خودکشی کر رہا ہوں
اور اپنے اس فعل کا تنہا ذمہ دار
ہوں !"

اس تحریر نے افسران پولیس کی مشکل اور آسان کر دی اور انہوں نے پوسٹ مارٹم کے بغیر دفن کرنے کی اجازت دے دی ۔

تدفین کے سلسلے میں سارے انتظامات اعجاز ہی کو کرنا پڑے اور اس نے بڑی خوبی سے اور مختصر سے وقفہ میں یہ انتظامات مکمل کر لیئے

احراز کا جنازہ جب اٹھا تو قیامت کا منظر تھا - کلثوم کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی - روتے روتے اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں آواز بیٹھ گئی تھی بار بار بیہوشی اور غشی کے دورے پڑتے تھے ۔

---

نسیم شروع میں تو بہت روئی ، اب بالکل خاموش تھی - پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی باپ کی لاش کو دیکھتی - کبھی بیہوش ماں کو ، کبھی اعجاز کو ، کبھی زلیخا کو ، کبھی رابعہ کو اور کبھی نادرہ کو

زلیخا نے بہن ہونے کا حق ادا کر دیا - وہ نسیم کے گلے لگ کر خوب روئی اور اس کے بعد اعجاز کے حسب ہدایت اسے وہاں سے ہٹا لے گئی اس کمرے میں جو اعجاز کا تھا اور جہاں کبھی دونوں گھنٹوں اور پہروں اکٹھے کھیلا

کھیلا کرتے تھے۔ باتیں کیا کرتے تھے، داستاں طرازی کیا کرتے تھے،

رابعہ کلثوم کو اپنے کمرے میں نادرہ کی مدد سے لے گئی اور بستر پر آرام سے لٹا دیا۔ وہ جب ہوش آتی احراز کے کمرے کی طرف لپکتی لیکن کلثوم اور نادرہ اسے روک لیتیں۔ ایک مرتبہ جب ایسا ہی واقعہ پیش آیا تو بڑی بے بسی کے ساتھ اس نے کہا:۔

"کیا میں ان کا آخری دیدار بھی نہیں کر سکتی"؟

اور پھر آسمان کی طرف نظر اٹھا کر کہنے لگی، "یا اللہ ———

اور پھر کچھ نہ کہہ سکی، آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے اور پھر وہ بیہوش ہو گئی!

اس حادثہ کی خبر آناً فاناً سارے شہر میں مشتہر ہو گئی۔ دوست، عزیز رشتے دار، جان پہچان والے سب ہی آ موجود ہوئے، یہ ایسا وقت تھا کہ اب نہ کوئی اختلاف باقی رہ گیا تھا، نہ کوئی تلخ یاد، آنے والے آتے تھے لاش پر ایک نظر ڈالتے تھے اور کانپ کر رہ جاتے تھے۔ کوئی آدمی مر جائے یا پھانسی پا جائے یا کسی اور طرح ہلاک کر دیا جائے تو افسوس اس کا بھی ہوتا ہے، دل اس سے بھی قدرتی طور پر متاثر ہوتا ہے لیکن ایک آدمی حالات سے بے بس ہو کر خود اپنا قاتل بن جائے، اپنی جان لے لے، اپنے گولی مار لے تو صورت ہی دوسری ہوتی ہے، پھر ہمدردیاں اور زیادہ بڑھ جاتی ہیں

جو لوگ تعزیت اور تجہیز و تکفین کے لئے جمع تھے ان میں بہت سے ایسے تھے جو احراز سے خفا تھے، اس کے مخالف تھے، دشمن تھے، اسے زک دینے کی کوشش

کرتے رہتے تھے اور جب وہ ان کی سازشوں اور دراندازیوں کے باعث ماخوذ ہوا۔ حوالات بھیجا گیا تو یہ خوش بھی ہوئے تھے، انہوں نے ایک طرح کا سکون بھی محسوس کیا تھا۔ اپنی نجی محفلوں اور صحبتوں میں اس کی ذلت و رسوائی اور زیادہ سے زیادہ ــــ سزائے قید کے تصور پر جوشِ نشاط کا اظہار بھی کرتے تھے لیکن اب کہ اس نے خودکشی کر لی تھی، اپنے ہاتھوں ہی زندگی کا خاتمہ کر لیا تھا۔ کم از کم اس وقت ان میں کوئی بھی خوش نہیں تھا۔ ہر شخص غمزدہ اور افسردہ نظر آ رہا تھا۔

احراز کے جنازے میں ایک خلقت شریک تھی جیسے یہ کسی ہیرو کا جنازہ ہو!

(۱۰)

احراز کے تکیہ کے نیچے جہاں وہ تحریر تھی جس میں اسنے خود کشی کا اپنے آپ کو ذمہ دار قرار دیا۔ وہاں صفدر کا وہ خط بھی تھا جو ٹھیک اسی روز ملا تھا۔ اس خط نے یہ راز فاش کر دیا کہ جہاں خودکشی کا ایک سبب وہ ذلت و رسوائی تھی جس سے رشوت اور غبن کے مقدمہ میں ماخوذ ہونے کے باعث اسے دو چار ہونا پڑا۔ وہاں سب سے بڑا سبب یہ خط تھا

صفدر سے احراز کو بہت سی توقعات تھیں۔ وہ اسے اپنا ہونے والا داماد ہی نہیں بیٹا بھی سمجھتا تھا۔ اس تیر نے اس کا دل چھید دیا اور پھر پھڑ پھڑا کر ختم ہو گیا۔

لیکن اس خط کا سب سے بڑا اور گہرا ردعمل کلثوم پر ہوا۔ صفدر کلثوم کے بھائی کا لڑکا تھا۔ وہ اسے دل و جان سے چاہتی تھی، اس

لئے بھی کہ وہ دولتمند تھا اور اس لئے بھی کہ وہ اس کے چہیتے بھائی کا فرزند دلبند تھا - صفدر نے اپنے خلوص، اپنایت اور محبت کا جو سکہ بٹھالیا تھا اس سے وہ اور زیادہ متاثر تھی لیکن جب اس نے ایسے نازک وقت اور کٹھن گھڑی پر دغا دی تو اس کا دماغی توازن جاتا رہا -

اس نے اپنے بھائی پر اس کے دولتمند ہونے کے باوجود بڑے احسانات کئے تھے احراز کی آمدنی کا معقول حصہ وہ اس کنبہ پر صرف کر دیا کرتی تھی اسے اپنے بھائی سے غیر معمولی محبت تھی اور اس کا خیال تھا کہ وہ بھی اسے دل وجان سے چاہتا ہے - لیکن اس موقع پر نہ بھائی نے ساتھ دیا نہ بھتیجے نے -

یہ ایسا دل دوز سانحہ تھا کہ وہ برداشت نہ کر سکی - پاگل ہو گئی، چند روز تک تو گھر والے یہی سمجھتے رہے کہ وفور غم اور شدت الم کے باعث بہکی بہکی باتیں کرتی ہے - کبھی ہنسنے لگتی ہے، کبھی کپڑے پھاڑ ڈالتی ہے کبھی فرنیچر توڑ ڈالتی ہے - کبھی برتنوں کی شامت آجاتی ہے، لیکن جب یہ کیفیت بڑھتی گئی اور چند روز کے بعد وہ جارحانہ حرکتوں پر اتر آئی تو باور کرنا پڑا - شدت غم نے اسے حواس باختہ نہیں کیا دیوانہ بنا دیا ہے - نادرہ تو اس کا ہدفِ ستم تھی ہی، رابعہ اور زلیخا بھی اس کے دستِ تظلّم سے محفوظ نہیں تھیں، اور خود اعجاز بھی جب زد میں آجاتا تو نہ بچتا - گرم گرم چائے کی پیالی ہاتھ میں لئے ایک روز وہ صحن میں ٹہل رہی تھی کہ زلیخا ادھر سے گزری، پوری پیالی اس

اس کے سر پر کھینچ ماری - وہ تو خیریت ہوئی کہ وار اوچھا پڑا - ورنہ لہو لہان ہونے میں کوئی کسر رہ نہیں گئی تھی - اسی طرح ایک مرتبہ وہ برآمدے میں ایک آرام کرسی پر دراز تھی کہ رابعہ باورچی خانے سے نکل پڑی ، محبت سے اسے بلایا ، اور شکایت آمیز لہجہ میں کہا :

" بہن تم تو کبھی دو گھڑی بھی ہمارے پاس آکر نہیں بیٹھتیں - ایسی بھی کیا مغائرت -

رابعہ پاس آکر بیٹھ گئی - کرسی کے پاس آبنوس کی ایک تپائی رکھی تھی - دفعتہً وہ تپائی اٹھائی اور کھینچ ماری - اگر رابعہ اپنا سر نہ ہٹا لے تو ہسپتال جائے بغیر کام نہ بنتا - لیکن اس واقعہ سے وہ اتنی دہشت زدہ ہوئی کہ پھر ایک سیکنڈ نہ ٹھہر سکی - بھاگوں بھاگ اپنے کمرے میں جا کر پناہ لی - رابعہ کو گئے ہوئے چند منٹ ہوئے ہوں گے اعجاز باہر سے آیا اور اپنے بالاخانے کی طرف جانے لگا - کلثوم نے آواز دی :

" بیٹے ذرا سننا ؟"

وہ چند سیڑھیاں چڑھا تھا - یہ ندا سن کر نیچے اتر آیا - کلثوم نے کہا ،

" تمہارے چچا تمہارے لئے ایک تحفہ چھوڑ گئے ہیں !"

اعجاز کو اس انکشاف پر حیرت ہوئی ، اس نے کہا ، " میرے لئے تحفہ چھوڑ گئے ہیں ؟

وہ بولی :-

"ہاں! اور وصیت کی تھی مجھے کہ ان کے مرتے ہی تم تک اسے پہنچا دوں؟"

اعجاز نے پوچھا "کیا آپ کو معلوم تھا کہ وہ خودکشی کر کے مرنے والے ہیں؟"

وہ کہنے لگی :-

"معلوم تو نہیں تھا لیکن انہوں نے کہا تھا کہ جب بھی وہ مریں تو یہ تحفہ تمہیں دے دیا جائے!"

پہلے تو اعجاز کو شبہ تھا کہ یہ بہکی بہکی باتیں ہیں- لیکن اب ان کی صداقت پر یقین آ گیا۔ اس نے کہا :-

"تو پھر دے دیجئے!"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی، پیار سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا :-

"کاش وہ زندہ ہوتے اور میں مر گئی ہوتی، ......

... کاش یہ تحفہ انہوں نے خود تجھے اپنے ہاتھ سے دیا ہوتا!"

---

اعجاز کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے، اس نے کہا :

"لیکن خدا کی مرضی ہر حالت میں پوری ہو کر رہتی ہے- اس کی مرضی یہی تھی!"

گویا ان الفاظ نے اس پر بڑا اثر کیا، کہنے لگی :-

"ہاں بیٹے! خدا کی مرضی میں کون دم مار سکتا ہے"؟

اعجاز نے اور زیادہ تسلی اور دلاسا دیتے ہوئے کہا :-

"چچی جان! زیادہ غم نہ کیجئے - موت پر کسی کا بس نہیں چلتا - آج وہ کل ہماری باری ہے - آپ کی یہ غمزدہ حالت مجھ سے نہیں دیکھی جاتی آپ کو زندہ رہنا ہے -

کلثوم نے تیوری چڑھا کر سوال کیا،

"کیوں زندہ رہنا ہے؟ —— ان کے بعد زندہ رہ کر کیا کروں گی"؟

اعجاز نے جواب دیا "اپنے لئے نہیں، نسیم کے لئے، نسیم کی ضرورت ہے آپ کو!"

کلثوم نے اسے کلیجہ سے لگایا اور کہا :-

"بیٹے تو نے سچ کہا - میں زندہ رہوں گی، نسیم کے لئے مجھے زندہ رہنا چاہیئے - وہ تو مر ہی چکے - میں بھی اگر مر گئی تو نسیم زندہ نہیں رہے گی، پھر اس کی کون خبر لے گا؟ کون اس کی دیکھ بھال کرے گا؟ کون اسے پھولوں کی طرح رکھے گا؟ —— بیٹے تو نے سچ کہا - میں زندہ رہوں گی، مجھے زندہ رہنا چاہیئے - تو اندھیرے میں روشنی بن کر نمودار ہوا ہے - بات راز کی ہے لیکن تجھے بتانے میں حرج نہیں - میں نے خودکشی کا فیصلہ کر لیا تھا - شاید دو چار روز میں کر ہی لیتی، لیکن اب میری توبہ ہے - کان پکڑے میں نے خود

کشی کے نام سے خودکشی کریں میرے دشمن۔ میں کیوں کرنے لگی۔ کیا خودکشی کر کے اپنی جان سے زیادہ پیاری بچی کو زندہ درگور کردوں؟"

اعجاز نے سمجھانے کے انداز میں کہا:-

"آپ ہی سوچئے چچی جان ——— خدا کا شکر ہے اس ارادہ سے آپ باز آگئیں!"

وہ مسکراتی ہوئی کہنے لگی "ہاں باز آگئی بیٹا ——— چل تجھے وہ تحفہ دے دوں!"

آگے آگے کلثوم، پیچھے پیچھے اعجاز، دونوں اس کمرے میں پہنچے جو زندگی میں احراز کا مسکن تھا۔ کلثوم نے آہنی الماری کھولی اور اس میں سے ایک پستول نکالا۔ پستول دیکھ کر اعجاز ذرا گھبرا گیا، لیکن اس نے اپنے حواس بجا رکھے، دریافت کیا:-

"کیا یہی وہ تحفہ ہے؟"

وہ کہنے لگی "ہاں بیٹے یہی وہ تحفہ ہے جس طرح ان کے بہت سے دشمن ہیں تیرے بھی ہیں۔ حفاظت کے لئے ہر وقت اپنے پاس رکھا کر۔"

کلثوم کے ہاتھ میں زیادہ دیر تک پستول کا رہنا خطرناک سمجھتے ہوئے اس نے اسے لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ لیکن لبلبی پر کلثوم کی انگلی تھی، وہ اس کے سینہ کا "نشانہ" تاک چکی تھی اور مسکرا رہی تھی۔ اس نے بجلی کی سی تیزی سے ایک سیکنڈ سے بھی بہت کم مدت میں پوری قوت کے ساتھ اس کی کلائی پر گھونسہ مارا جس سے پستول چھوٹ کر گر پڑا، اسے اٹھایا تو وہ

بھرا ہُوا تھا۔ اس نے پستول جیب میں رکھا اور کلثوم سے کہا :-

" اطمینان رکھیئے ، یہ ہر وقت حفاظت خود اختیاری کے لئے میرے پاس رہے گا ۔"

کلثوم نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ کر ایک کھوکھلا قہقہہ لگایا اور بڑی دیر تک ہنستی رہی ۔

---

حسن اسٹیشنری اینڈ جنرل اسٹور
دوکان نمبر ۸۹۷ رحمانیہ مسجد لیاقت آباد کراچی

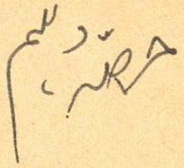

# انسان

## (۱)

کلثوم کی حالت دن بدن ابتر ہی ہوتی چلی گئی، اس کی دیوانگی نے احراز کا غم بھلا دیا تھا۔ شروع شروع میں اس کی دیوانگی ہوشیاری کا پہلو لیے ہوئے تھی۔ یعنی سب کے ساتھ وہ مار دھاڑ کرتی تھی، لیکن نسیم کو کلیجہ سے لگائے رکھتی تھی۔ مگر کچھ ہی دن بعد وہ نسیم کی بھی اسی طرح دشمن ہو گئی، جس طرح اعجاز، زلیخا اور رابعہ وغیرہ کی تھی۔ آخر تنگ آکر اعجاز نے اسے مینٹل ہسپتال میں داخل کرا دیا۔

سارے گھر میں سب سے زیادہ قابلِ رحم حالت نسیم کی تھی۔ ایک طرف باپ کی مرگ بے ہنگام کا غم۔ دوسری طرف ماں کی دیوانگی۔ تیسری طرف صفدر کی بے وفائی۔ چوتھی طرف گھر کی ابتری اور بربادی۔ ان سب غموں نے مل کر ایک ساتھ اس تن نازک پر دھاوا کیا تھا۔ اس کے

اوقات کا بیشتر حصہ روتے کٹتا تھا - کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کرے ؟ کہاں جائے ؟

کل تک وہ ایک شہزادی کی سی زندگی بسر کر رہی تھی - سارا گھر اس کی ایڑی کے نیچے تھا - ماں جان و دل سے قربان - باپ سراپا محبت و شفقت - صفدر یکسر مہر و محبت، لیکن یک لخت گردش چرخ نیلی فام کی بساط الٹ گئی - اعجاز نے خودکشی کر لی - ماں پاگل خانے پہنچ گئی - صفدر نے ناتہ توڑ لیا -

اب اس دنیا میں کون تھا اس کا ؟

جدھر نظر ڈالتی تھی مایوسی ہی مایوسی نظر آتی تھی

کوئی ایسا نہ تھا جس پر بھروسہ کر سکے، جسے اپنا کہہ سکے جس کے سامنے دل کے چلے پھپھولے پھوڑ سکے - جس کی ہمدردی پہ بھروسہ کر کے خوب جی بھر کے رو سکے - رابعہ کا برتاؤ اس کے ساتھ بہت اچھا تھا لیکن اس نے اپنی رعونت سے انہیں دشمن بنا لیا تھا - زلیخا بہن سے زیادہ چاہتی تھی - لیکن مریم کے انتقال کے بعد سے اب تک اس نے جو وطیرہ اس کے ساتھ رکھا تھا وہ ایک بدترین دشمن کے ساتھ بھی نہیں رکھا جا سکتا - پھر کس برتے پہ وہ اس سے دوستی کی لَو لگاتی ؟ اعجاز سے اس کی خوب بنتی تھی لیکن یہی تو تھی جو اس کی خانہ بربادی اور جلا وطنی کا سبب بنی تھی - جس نے اس کے ساتھ نفرت اور حقارت کا برتاؤ کیا تھا جس نے اتنے دنوں کے بعد اس کی واپسی پہ بات تک نہ پوچھی - بلکہ اسے

اور زیادہ ذلیل کیا - ان حالات میں کیسے ممکن تھا کہ وہ اس سے بھلائی کی توقع کرتی -

اور جس کے لئے اس نے اپنے کنبہ کو، اپنے قریبی عزیزوں کو اپنے چچازاد بھائی اور بہن کو دشمن بنا لیا تھا - اس نے اس نازک وقت پر دغا دی اور ساتھ چھوڑ دیا!

اگر صفدر نے بے وفائی نہ کی ہوتی تو شاید اس غم کو وہ جھیل لے جاتی باپ کی موت اور ماں کی دیوانگی کا دھچکا سہہ لیتی لیکن صفدر نے ساتھ چھوڑ کر اور آنکھ پھیر کر اسے دنیا میں کہیں کا نہ رکھا تھا - اب وہ کس سے ہمدردی کی بھیک مانگے - کون ہے جو اس کے زخم دل پر مرہم رکھے، اس کے آنسو پونچھے اور اس کے قلب ناصبور کو تسکین و تسلی دے؟

صفدر نے اور ماموں نے اور ممانی نے ——— تو اتنا تک نہیں کیا کہ اس حادثۂ المیہ پر دو لفظ ہمدردی اور تعزیت کے لکھ بھیجے ہوتے اور کوئی پرسے کے لئے آگے آتا - عملی طور سے نہ سہی زبانی ہی - ہمدردی اور محبت کا اظہار کر دیا ہوتا -

ان سب کے مقابلہ میں اعجاز پھر غنیمت نکلا - اگر وہ نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ اس مرحلہ پر جب ساری دنیا نے ساتھ چھوڑ دیا تھا - وہی وکیل کے ہاں چکر کاٹ رہا تھا - عدالت کے پھیرے کر رہا تھا - وہی تھا جو حوالات کی سلاخوں سے احراز کو نکال کر باہر لایا - وہی تھا جس نے اس کی خودکشی کے بعد گھر سے قبرستان تک کے لئے سارے مراحل طے کیے وہی تھا جس نے کلثوم کی

دیوانگی کے بعد اسے سنبھالا ۔ اس کے علاج کی کوشش کی ، اسے ہسپتال میں داخل کرایا ۔ حالانکہ اسے نفرت حقارت اور ذلت کے سوا نہ کلثوم سے کچھ ملا تھا ، نہ اعجاز سے ۔ نہ خود اس سے ۔

جب وہ یہ سوچتی تو اعجاز کے لئے اس کے دل میں ممنونیت کے جذبات پیدا ہو جاتے ۔ جی چاہتا شکریہ ادا کرے ، لیکن ندامت زبان پکڑ لیتی ۔

---

(۲)

مصائب و آلام کی یہ یورش اگر آہنی اعصاب کے انسان پر ہوتی تو وہ بھی لب گور ہو جاتا۔ نسیم تو بہر حال ایک کمزور لڑکی تھی۔ وہ کب تک اس بلائے بے درماں کا مقابلہ کر سکتی۔ آخر وہ بھی بستر پر دراز ہو گئی۔ اعجاز کی وجہ سے زلیخا اور رابعہ کو اس سے بہت ہمدردی تھی لیکن یہ ہمدردی ایسی نہیں تھی جو اس کے زخم دل کو مندمل کر سکتی، جو اس کے آلام و مصائب کو کم کر سکتی۔ اعجاز اس کی دلجوئی کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرتا تھا اور اس کے سامنے وہ آنسو پی بھی جاتی لیکن جہاں تنہائی میسر آتی اور وہ کب میسر نہیں آتی کہ اس نے رونا شروع کر دیا، اس طرح کہ کوئی سن نہ لے، اس طرح کہ دل کے ٹکڑے ہو جائیں۔

کرنل شمسی شہر کے نہایت کامیاب ڈاکٹر تھے۔ اعجاز انہی سے نسیم کا علاج

کر رہا تھا۔ وہ پوری ہمدردی اور دلسوزی کے ساتھ علاج کر رہے تھے، جب اسے کسی طرح افاقہ نہ ہُوا تو انہوں نے پیشاب، بلغم اور خون وغیرہ کا ٹسٹ کیا اور سینہ کا اکسرے لیا اور اس کے بعد کہہ دیا۔

"مریضہ کی حالت کافی تشویشناک ہے، دِق کا آغاز ہو چکا ہے۔"

یہ سن کر اعجاز کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی اس نے کہا

ڈاکٹر صاحب یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ کیا نسیم دق میں مبتلا ہو گئی ہے؟ اس کے باپ نے خودکشی کر لی، ماں اس غم میں دیوانی ہو گئی۔ صفدر نے دھوکا دیا۔ اب کیا اس کی باری ہے؟ کیا اب وہ اس دنیا سے حسرت آرزو لیکر رخصت ہو جائے گی؟ ——— نہیں ڈاکٹر صاحب ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔ آخر آپ کس مرض کی دوا ہیں۔ جس طرح بھی ہو اسے بچا لیجئے۔ اسے زندہ رہنا چاہیئے۔ ابھی اس کے مرنے کے دن نہیں ہیں۔ ابھی اسے نہیں مرنا چاہیئے!

کرنل شمسی غور اور توجہ سے اعجاز کی باتیں سنتے رہے۔ پھر انہوں نے فرمایا:

عزیز من تم ٹھیک کہتے ہو۔ واقعی ابھی نسیم کے مرنے کے دن نہیں ہیں اسے نہیں مرنا چاہیئے لیکن ———

اعجاز نے بیتابی کے ساتھ کہا" لیکن ویکن کچھ نہیں۔ آپ کو اسے بچانا ہی پڑے گا!

کرنل شمسی مسکراتے ہوئے پھر گویا ہُوا:-

یہ شہر بدل دو۔ ویسے بھی آجکل سخت گرمی پڑ رہی ہے، اسے پہاڑ پر لے جاؤ۔ اسے زیادہ سے زیادہ خوش رکھنے کی کوشش کرو۔ غم اور فکر اس کے پاس پھٹکنے نہ دو۔ مرض کا ابھی صرف آغاز ہے۔ اگر یہ کر لو گے تو وہ ضرور اچھی ہو جائے گی!"

اعجاز نے اضطراب و اشتیاق کے ساتھ دریافت کیا:۔

"واقعی ڈاکٹر صاحب اچھی ہو جائے گی؟"

انہوں نے اعتماد کے ساتھ جواب دیا "ہاں ضرور، خدا پر بھروسہ رکھو، انشاء اللہ وہ بالکل تندرست ہو جائے گی۔ مرض کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہے گا"

---

(۳)

کرنل شمسی کو رخصت کر کے اعجاز سیدھا نسیم کے کمرے میں پہنچا وہ بستر پر لیٹی تھی اور نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ پاس ہی کرسی پڑی ہوئی تھی۔ اعجاز اس پر بیٹھ گیا۔ اسے دیکھ کر نسیم نے اٹھنے کی کوشش کی، لیکن اعجاز نے اسے اٹھنے نہیں دیا، کہنے لگا:۔

"چپ چاپ لیٹی رہو اور جو کچھ میں کہتا ہوں اسے غور سے سنو"؛

وہ خاموش ہو گئی اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی اعجاز نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا:۔

"کل ہم پہاڑ چل رہے ہیں سن لیا تم نے؟"

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر کہنے لگی:۔

"وہاں کیوں جا رہے ہیں آپ؟ ——— میں بیمار ہوں میرا کیا ہوگا؟ امّی پاگل خانے میں ہیں، ان کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ ——— کیا کوئی بہت ضروری کام ہے؟"

اس نے ہمدردی کی نظروں سے اسے دیکھا۔ پھر گویا ہوا:-

"میں نہیں ہم، ——— تم بھی میرے ساتھ چلو گی، چچی کا میں نے بڑا اچھا انتظام کر دیا ہے۔ ڈاکٹر نے امید دلائی ہے، کہ دو مہینے کے اندر وہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی، بشرطیکہ ہم میں سے کوئی ان سے ملنے کی اس عرصہ میں کوشش نہ کرے، ہم میں سے جب وہ کسی کو دیکھتی ہیں تو ان کا جنون بڑھ جاتا ہے۔ اگر وہ کچھ عرصہ تک سکون سے رہیں، اور مشتعل نہ ہوں تو طبیعت بالکل درست ہو جائے گی!"

وہ بولی:- "اچھا تو ہم نہیں ملیں گے مگر پہاڑ کی کیا ضرورت ہے وہاں کیوں جائیں؟"

اعجاز نے جواب دیا:

"ڈاکٹر صاحب کی رائے ہے کہ گرمی کی یہ شدت تمہارے مرض کو بڑھا دے گی۔ وہاں کی آب و ہوا تمہارے لئے مفید ہے۔ اس عرصہ میں چچی بھی اچھی ہو جائیں گی اور تم بھی تندرست ہو جاؤ گی!"

وہ کہنے لگی، "میں سمجھ گئی، دق کے مریضوں کو پہاڑ پر لے جایا

جاتا ہے۔ شاید ڈاکٹر صاحب نے میرے لئے دق تجویز کی ہے، اگر یہی بات ہے تو میں خوش ہوں، بہت خوش ہوں۔"

"یہ کیوں؟ اوّل تو ڈاکٹر نے دق تجویز نہیں کی، لیکن بر فرض محال کی بھی ہے، تو اس میں خوش ہونے کی کیا بات ہے؟"

"مجھے زندگی نہیں چاہیئے۔ میں زندہ رہ کر کیا...... کروں گی؟"

"کیوں زندگی سے اس قدر بیزار کیوں ہو؟"

"اس لئے کہ اب زندگی میں میرے لئے کچھ نہیں رہ گیا ہے؟ کیوں زندہ رہوں، کس لئے زندہ رہوں، کون سی دلکشی رہ گئی ہے زندگی میں میرے لئے؟"

"آخر تم اپنے آپ کو تنہا اور اکیلا کیوں سمجھتی ہو؟ تم یہ کیوں سمجھتی ہو کہ دنیا میں تمہارا کوئی نہیں ہے؟"

"کیا کوئی ہے؟"

"کیوں نہیں ہے؟"

"آخر ہے تو میں اسے کیوں نہیں جانتی؟"

کیا تم مجھے نہیں جانتیں؟ ——— نسیم کیا تم مجھے نہیں جانتیں؟ کیا تم مجھے پہچاننے سے انکار کرتی ہو؟ ——— کیا تم میرے لئے بھی زندہ رہنا نہیں چاہتیں؟"

"آپ کے لئے ؟" ——————

اور پھر وہ آنکھیں نہ ملا سکی، خود اس کی آنکھیں گلاب کی پتیوں کی طرح جھک گئیں۔ اس کے زرد زرد گالوں پر سرخی کی ایک لکیر سی بن گئی

اعجاز نے اعتماد اور عزم کے ساتھ کہا:۔

"ہاں میرے لئے، بتاؤ نسیم کیا میرے لئے بھی تم زندہ رہنا نہیں چاہتیں ؟"

وہ دکھ بھرے لہجہ میں بولی "کیوں شرمندہ کرتے ہیں آپ مجھے؟ ابو نے، ممی نے اور خود میں نے آپ کے اور زلیخا کے ساتھ جو برتاؤ روا رکھا ہے، کیا کوئی اسے بھول سکتا ہے۔ معاف کر سکتا ہے ؟

——————

اعجاز نے جوش کے ساتھ جواب دیا "ہاں ہیں —————— آخر تم میری بات کا یقین کیوں نہیں کرتیں ؟"

نسیم نے جواب دینا چاہا، لیکن کچھ کہہ نہ سکی، ہاں اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے بڑے بڑے قطرے ضرور ٹپکنے لگے اور پھر لرزتے ہوئے ہونٹوں سے اس نے کہا:۔

"کاش بہت پہلے میں مر گئی ہوتی!"

اعجاز نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا:۔

"تمہیں ابھی زندہ رہنا ہے ——— اور بوڑھی ہو کر مرنا ہے ، اور تمہارے بوڑھے ہونے میں ابھی بہت دن ہیں!"

---

## (۴)

پہاڑ کی آب و ہوا کا واقعی بہت اچھا اثر پڑا نسیم کی صحت پر، چند ہی ہفتوں میں حرارت جاتی رہی - کھانسی ختم ہو گئی - چہرے کی زردی سرخی سے بدل گئی - ماحول کی تبدیلی نے بھی بہت اچھا اثر کیا - گھر میں ہر وقت ملول و دل شکستہ نظر آتی تھی - یہاں اعجاز اور زلیخا نے اسے ایک لمحہ کے لئے بھی افسردہ نہیں ہونے دیا - صبح سے لے کر رات کو جب تک سونے کا وقت نہ آجاتا وہ اس کا جی بہلایا کرتا - اسے ہنسانے کی کوشش کرتا رہتا - یہی حال زلیخا کا تھا - احراز کی موت اور کلثوم کی دیوانگی نے اس کے دل کو بھی پانی کر دیا تھا، وہ اب ساری پچھلی باتیں جنہیں یاد رکھنے کا بڑا اہتمام رکھتی تھی بالکل بھول چکی تھی، اسے اگر فکر تھی تو بس اتنی کہ نسیم خوش رہے، ہنسے، مسکرائے

دلچسپیوں میں حصہ لے، کتابیں پڑھے، لطیفے سنے، سینما دیکھے، مزے مزے کی باتیں کرے۔ زلیخا کے اس التفات میں کچھ اس کی فطری نیکی شامل تھی اور زیادہ تر اعجاز کی محبت کارفرما تھی، اس نے محسوس کر لیا تھا کہ اعجاز نے نسیم کی صحت کو اپنی موت اور زندگی کا مسئلہ بنا لیا ہے۔ لہٰذا دل سے کوشش کرتی تھی کہ اس کا ہر غم دُور کر دے۔

کئی روز سے نسیم کلثوم کے لئے پریشان تھی،

"امّاں نہ جانے کیسی ہیں؟ خدا جانے ان کی صحت کا کیا حال ہے؟ ہسپتال والے ٹھیک سے دیکھ بھال کرتے ہیں یا نہیں؟—

---

اعجاز کو خود بھی کلثوم کے بارے میں کافی فکر رہتی تھی اور اب نسیم کی پریشانی دیکھ کر اس سے رہا نہ گیا وہ زلیخا کو اس کے پاس دو دن کے لئے چھوڑ کر شہر چلا گیا کہ کلثوم کی خبر لے آئے اور اپنی آنکھوں سے اس کا حال دیکھ آئے

اعجاز کے جانے کے دوسرے دن کاٹیج کے برآمدے میں نسیم بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی کہ زلیخا آگئی، اس نے آتے ہی سوال کیا:

"کیا پڑھا جا رہا ہے؟"

وہ کتاب بند کرتی ہوئی بولی:-

"یوں ہی —— ایک کتاب ہے، دلچسپ سی"،

کچھ دیر تک خاموش رہی، پھر زلیخا نے پوچھا :-

"کیوں نسیم، کیا تم نے بھی صفدر کو بھلا دیا ہے ؟"

وہ تیوری چڑھا کر بولی " میں نفرت کا جواب محبت سے نہیں دے سکتی !"

زلیخا نے چھیڑتے ہوئے کہا : " لیکن محبت کا جواب تو نفرت سے ہو سکتا ہے ؟"

وہ کچھ جھینپ سی گئی، اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، کہنے لگی :-

" تمہیں حق ہے جتنا چاہو ذلیل کر لو ——— لیکن زلیخا میری آنکھوں پر پردے پڑ گئے تھے۔ نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ اماں نے بھائی کی محبت میں - بھائی نے اور ان کے گھر والوں نے بہن کے جاہ و جلال کے جوش میں کچھ ایسا جال بنا کہ میں پھنس گئی، میں نے کھوٹے کو کھرا سمجھا اور صفدر نے بھی محبت کا وہ سوانگ رچایا کہ میں مزاحمت نہ کر سکی۔ میں محبت سے ناواقف تھی۔ کتابوں میں میں نے محبت کا ذکر پڑھا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ میں کسی سے محبت کروں - کوئی مجھ سے محبت کرے - صفدر مجھ سے محبت کا ڈھونگ رچاتا ہوا آیا۔ میرا دل صاف تھا۔ میں اس سے محبت کرنے لگی ———"

" اور بھیا ———"

" وہ ذرا سی بات جس کا بتنگڑ بنا جس کی وجہ سے انہیں گھر چھوڑنا پڑا اور جس کے باعث میں ان سے، تم سے بیزار ہوئی۔ ایک بہانہ بن گئی۔ یہ

واقعہ نہ ہوتا تو شاید صفدر کا داؤں نہ چلتا۔ میں اس کے فریب میں نہ آتی ——— اب وہ باتیں سوچتی ہوں تو اتنی ندامت ہوتی ہے کہ جی چاہتا ہے زہر کھا لوں!

"چھوڑو یہ باتیں، ہمیں تو اب وہ یاد بھی نہیں ——— لیکن نسیم کیا اب بھی تم مجھ سے بیزار ہو؟

"ہرگز نہیں۔ اب تو میں تمہیں سگی بہن سے بھی زیادہ چاہتی ہوں!"

"اور بھیا سے"؟

"بھیا سے کیا؟"

"کیا ان سے بیزار ہو؟

"کچھ تمہارا دماغ چل گیا ہے"؟

"وہ نہ ہوتے تو ابا کی لاش سڑتی رہتی۔ اماں دیوانگی کے عالم میں سر پھوڑ کر مر جاتیں اور میرا نہ جانے کیا حشر ہوتا! وہی تو ہیں جنہوں نے ہم گرتے ہوؤں کو سنبھالا اور نئی زندگی دی، ان سے بیزاری کا کیا سوال؟ انہیں چاہا جا سکتا ہے۔ ان سے محبت کی جا سکتی ہے، انہیں پوجا جا سکتا ہے مگر ———

"ارے، ارے ——— نسیم کچھ ہوش میں ہو؟"

"کیا ہوا از لیخا؟"

"تم بھیا کو چاہتی ہو؟ محبت کرتی ہو ان سے؟ انہیں پوجتی

ہو؟"

"ہاں ——— اور مجھے اس پر فخر ہے ———

کیا میرا یہ فخر بے جا ہے"؟

"نہیں بالکل بجا ہے لیکن کہیں اس فخر کا اظہار ان حضرت کے سامنے نہ کہہ دینا۔ ورنہ وہ آپے میں نہیں رہیں گے کہیں انہیں پاگل خانے نہ بھیجنا پڑے۔ ———

خدا نہ کرے، کیوں ایسی بدفالی کی باتیں منہ سے نکالتی ہو ——— بہن ہو کر ایسی باتیں شرم نہیں آتی"!

" اچھا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہمارے اجڑے ہوئے گلستان میں بھی بہار آ جائے گی"؟

" اجڑا ہوا گلستاں کیسا؟ بہار کیسی؟

"تم ہماری بھابھی بن جاؤ گی؟ ——— کیا نہیں بنو گی؟

" زلیخا ایسی باتیں نہ کرو"؟

کیوں نہ کروں؟ ——— آخر پھر بھیا کو جواب کیا دوں گی؟"

"جواب کیسا؟"

وہ تو ماہئ بے آب کی طرح اس دن کے لئے تڑپ رہے ہیں، جب تم ان کی دولہن بنو گی، جب وہ سہرا باندھیں گے"!

یہ الفاظ سن کر نسیم کا چہرہ اور سرخ ہو گیا۔ وہ کچھ شرما سی گئی ذرا دیر تک چپ رہنے کے بعد گویا ہوئی۔

"نہیں زلیخا میں اس قابل نہیں ہوں!"

"یہ نئی بات کیا سوجھی بیٹھے بیٹھے؟

سچ ہی تو کہتی ہوں، وہ بہت اونچے، بہت اچھے، بہت شریف انسان ہیں۔ ان کے لئے ایسی رفیقۂ حیات منتخب کرو، جو انہی کی سی ہو۔

"لیکن بدقسمتی سے رفیقۂ حیات کا کام انہوں نے مجھے نہیں سونپا ہے۔ اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اور وہ انتخاب کر چکے اور سچ پوچھو تو میں بھی ان کے انتخاب پر صاد کرتی ہوں!

"آخر آج تمہیں سوجھی کیا ہے؟ ——— کیوں پریشان کرنے کے لئے آ گئیں خواہ مخواہ!

ہاں کہہ دو، میں چپ ہو جاؤں گی!"

(آہ سرد کے ساتھ) زلیخا تم کسے اپنی بھابی بنانے کے لئے چل رہی ہو؟ اسے جو ایک بدنام باپ کی بیٹی ہے؟ ایک دیوانی عورت کی لڑکی ہے جس کے پاس نہ دولت ہے، نہ ثروت، نہ عزت، نہ شہرت محض ایک کنگلی!

"دیکھو نسیم اگر اس طرح کی باتیں کرو گی تو لڑائی ہو جائے گی——

——— تم ایک غیرت مند باپ کی بیٹی ہو۔ جو میرا چچا بھی تھا، تم ایک وفا پرست عورت کی لڑکی ہو جو ہماری چچی ہے۔ تم ہمارا خون

ہو، جو ہم ہیں وہ تم ہو، جو تم ہو وہ ہم ہیں۔ ایسی باتیں سوچتے ہوئے تمہیں لاج نہیں آتی؟"

نسیم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ رونے لگی۔ زلیخا اس سے لپٹ گئی۔ اس ہمدردی نے اسے اور زیادہ جذباتی بنا دیا۔ وہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر سسکیاں لے کر رونے لگی۔

نہ جانے کب سے سیلاب اشک رکے ہوئے تھی۔ آج بند ٹوٹ گیا اور گریۂ بے اختیار نے اس کی مشکل آسان کر دی۔ زلیخا بھی اس کی حالت سے اور اس کی باتوں سے بہت متاثر تھی۔ وہ بھی اپنے آنسو نہ ضبط کر سکی، وہ اس سے لپٹی ہوئی رونے لگی:

کافی دیر تک دونوں اسی طرح ایک دوسرے کے گلے لگی روتی رہیں

دفعتہً اعجاز سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔

اسے دیکھ کر زلیخا چونک پڑی اور آنسو پونچھتی ہوئی بولی:

"ارے بھیا آپ؟"

وہ حیرت سے دونوں کو دیکھتا ہوا بولا:۔

"یہ کیا ہو رہا تھا؟ —— یہ تو خوشی کا موقع ہے، چچی اچھی ہو گئیں انہیں بھی میں اپنے ساتھ لایا ہوں، یہاں کی آب و ہوا انہیں بہت راس آئے گی جاؤ، ان کا استقبال کرو —— خبردار تمہاری یا نسیم کی آنکھوں میں آنسو کا ایک قطرہ بھی نظر نہ آئے۔"

---

ختم شد

NAZLI

# نازلی

## رئیس احمد جعفری کا معرکہ آرا اور حقیقت افروز سماجی ناول

یہ ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جو حسین تھی، تعلیم یافتہ تھی، آرٹسٹ تھی، ایک دولتمند گھرانے کی فرد تھی، ایک دولتمند شوہر کی بیوی تھی لیکن جس کا دل غریبوں کے دکھ درد پر کڑھتا تھا جو سرمایہ کاری کی نہیں لیکن سرمایہ دارانہ ذہنیت کی مخالف تھی جس کا کوئی ساتھی نہ تھا لیکن نہایت بہادری سے ہر اس طاقت سے جنگ کرتی رہی جس نے اس کا مقابلہ کیا۔

یہ دو دھڑکتے ہوئے دلوں کی کہانی ہے جو ایک دوسرے کے لئے تڑپتے تھے جن سے سماج کو ذرا بھی ہمدردی نہ تھی، جن سے عزیزوں کو، دوستوں کو کوئی لگاؤ نہ تھا لیکن پانی بہتے بہتے پتھر میں بھی شگاف کر دیتا ہے۔ آخر کار...

زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کا آئینہ دار اور اردو ادب میں انفرادی حیثیت کا ایک عجیب و غریب ناول

سہ رنگا حسین ترین دسٹ کور — قیمت نو روپے

**مقبول اکیڈمی ۴ اے شاہ عالم گیٹ لاہور**

# محبّت کا انتقام

(رئیس احمد جعفری کا نیا ناول)

جگر نے کسی موقع پر محبت کے لئے لکھا تھا۔ "یہ شاخِ گُل بھی ہے تلوار بھی ہے۔" اس کتاب میں واقعی محبت شاخِ گُل نظر نہیں آتی، تلوار دکھائی دیتی ہے جس سے خون ٹپکتا ہے جس کی نوک میں نہ جانے کتنے معصوم دل چھدے ہوئے ہیں جس نے محبوب کا سینہ چھلنی کر دیا۔

یہ عجیب و غریب نفسیاتی ناول، اپنے کردار، انداز بیان اور طرز و اسلوب کے اعتبار سے بالکل ایک نئی، انوکھی اور نرالی چیز ہے، اسے پڑھ کر کہیں خوف و دہشت سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، کہیں شدتِ غم والم سے اشکِ حسرت بہنے لگتے ہیں اس میں پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی، پھول وہ جو دل میں جگہ پائیں اور کانٹے ایسے جو دل کو چھلنی کر دیں، اردو زبان میں اس تیور کا ناول آج تک نہیں لکھا گیا، اُردو زبان کی تاریخ میں اسے ایک خاص مقام حاصل ہوگا، جب تک اُردو لٹریچر زندہ ہے، یہ ناول بھی زندہ رہے گا یہ ان چند لازوال اور غیر فانی شہ پاروں میں سے ہے جن کی تر و تازگی اور رعنائی ہمیشہ قائم رہے گی،

ہم نے رئیس احمد جعفری کے کئی ناول چھاپے ہیں اور آئندہ بھی چھاپتے رہیں گے لیکن اس ناول کو چھاپ کر ہم نے اُردو ادب کو ایسا گوہر یکدانہ دیا ہے جس کی آب و تاب اور چمک دمک کبھی ماند نہیں پڑ سکتی۔

سونگا حسین گرد پوش ———— قیمت ساڑھے سات روپے

# آنچ

## (رئیس احمد جعفری کا معاشرتی ناول)

رئیس احمد جعفری کا نام اور ان کے ناول کسی تعریف یا تعارف کے محتاج نہیں ہیں لیکن "آنچ" میں فاضل مصنف نے اپنی ناول نگاری کے تمام سابقہ ریکارڈ توڑ دیئے ہیں اور اس ناول میں وہ درد، نشاط، تڑپ اور سوز و ساز سمویا ہے کہ پڑھنے والا عش عش کر اٹھتا ہے یہ ایک ایسی کہانی ہے جس سے ہم سب دوچار ہوتے رہتے ہیں، ہوس، زر پرستی اور خود پرستی کی اس دنیا میں خلوص، شرافت اور سچائی کا نمونہ ناز دل سے پالی ہوئی ایک لڑکی کی داستانِ درد، مصیبتوں کے طوفانوں سے کھیلنے والے ایک نوجوان کا افسانہ حیات آفرین۔

حقیقت یہ ہے کہ خیالی داستانوں میں وہ لطف نہیں جو خود ہماری زندگی ہر روز پیش کرتی ہے۔ یہ ناول ہماری روزمرہ زندگی کی داستان ہے، بے انتہا دلچسپ، سبق آموز اور لرزہ خیز

سہ رنگا خوبصورت دسٹ کور ——— قیمت چھ روپے

# یورش

## رئیس احمد جعفری کا نیا تاریخی ناول

ایک زمانہ تھا کہ مسلمان سر ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں اترتے تھے، مال وزر کی طمع ان کا دامن نہ کھینچ سکتی تھی، سیم وزر کے انبار انہیں اپنی طرف متوجہ نہ کر سکتے تھے، حسن جمال کی کشش ان کے پائے ثبات میں لغزش نہ پیدا کر سکتی تھی، دشمن کا جاہ وجلال اور کر وفر، ان کے عزم میں تزلزل نہ پیدا کر سکتا تھا، بے آب گیاہ میدان میں وہ گلگشت کرتے تھے، لق ودق صحرا ان کی جولان گاہ تھے، ناپیداکنار سمندر ان کی جرأت رندانہ کو روکنے پر قادر نہ تھا، آسمان رفعت پہاڑ ان کے راستے کے پتھر نہ بن سکتے تھے ـــــ اور زندگی کی لذت، زندگی کی کشش، زندگی کی تمنا انہیں موت سے دہشت زدہ اور مرعوب کر سکتی تھی، موت انہیں زندگی سے زیادہ عزیز تھی، زندگی ان کے پیچھے دوڑتی تھی، وہ موت کا تعاقب کرتے تھے

اور جو لوگ ایسا جذبہ رکھتے ہوں، خدا بھی ان کی مدد کرتا ہے، وہ ہر میدان میں کامیاب ہوتے ہیں، ہر مورچہ کو فتح کر لیتے ہیں۔ ہر طاقت کو شکست دیتے ہیں۔

"یورش" بھی اسی طرح کی ایک داستان ہے جس میں آہ بھی ہے اور درد بھی۔ آنسو بھی اور تبسم بھی، حسرت بھی اور مسرت بھی۔

سہ رنگا خوبصورت گرد پوش   بڑا سائز   قیمت ساڑھے آٹھ روپے

# ہمایوں

اس کا نام تو ہمایوں تھا لیکن قسمت نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ بابر کی موت کے بعد جب وہ ہندوستان کے تخت پر بیٹھا تو نہ صرف سارا شمالی ہند بلکہ سگے بھائی بھی اس کی جان کے دشمن بن چکے تھے، وہ تخت و تاراج سے دستبردار ہو کر آگرے سے لاہور کی طرف بھاگا۔

ملتان میں ایک دوست کی کنیز سے آنکھیں چار ہو گئیں اور اسے سلطنت سے زیادہ قیمتی سمجھ کر آخری بار قسمت آزمانے کے لئے سندھ کی طرف روانہ ہو گیا، سفر میں موت اور ناکامی سائے کی طرح اس کے ساتھ لگی رہی، جب راجپوتانے کے بے برگ و بار صحرا میں ہندوستان کا نامور مغل شہنشاہ اکبر اعظم پیدا ہوا۔ اس وقت بدنصیب ہمایوں کے پاس پھوٹی کوڑی بھی موجود نہ تھی۔

لیکن ان مصیبتوں کے باوجود اس کی نگاہیں ہندوستان کے تخت و تاج پر مرکوز تھیں۔ اس نے اپنا حق کس طرح حاصل کیا؟

محمد سعید نے اپنے تازہ ناول "ہمایوں" میں اس تاریخی داستان کو نہایت دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے۔

سہ رنگا گرد پوش ——— بڑا سائز ——— قیمت آٹھ روپے

مقبول اکیڈمی ہ۔ اے شاہ عالم گیٹ لاہور